وادیٔ تحقیق

(تحقیقی مضامین کا مجموعہ)

الحاج سید عالم حسین رضوی

وادیٔ تحقیق

(تحقیقی مضامین کا مجموعہ)

الحاج سید عالم حسین رضوی
ریٹائرڈ اسسٹنٹ جنرل مینیجر، یونین بینک آف انڈیا
حال مقیم: B.3/330، شوالہ، بنارس
موبائل: 9450543234

ہمارے بعد اس محفل میں افسانے بیاں ہونگے
یہ دنیا ہم کو ڈھونڈھیگی نہ جانے ہم کہاں ہونگے

نام کتاب: وادیٔ تحقیق

نام مصنف: الحاج سید عالم حسین رضوی

سن طباعت: ۲۰۱۹ء۔ پہلا ایڈیشن

صفحات: ۳۰۴

تعداد اشاعت: ۲۰۰

مطبع: سلمان کمپیوٹرس، مالتی باغ، مدنپورہ، بنارس

Ph. 0542-2455161

قیمت:

ناشر: ملّت جعفریہ اسلامک یوتھ آرگنائزیشن (MJIYO)، بنارس

WADI-YE-TAHQIQ

(Research articles)

By :

Alhaj Syed Alim Husain Rizvi

Mob.: 09450543234

ملنے کا پتہ:

۱۔ مصنف کا غریب خانہ: B. 3/330، شوالہ، بنارس

۲۔ ملّت جعفریہ اسلامک یوتھ آرگنائزیشن (MJIYO)، بنارس

۳۔ آلِ جواد العلماء مولانا سید محمد عقیل حسینی قبلہ، مقیم گنج، بنارس

۴۔ قرآن گھر، دالمنڈی، بنارس

۵۔ رضوی پبلیکیشنز، ۳۵، رابندر سرنی، کولکاتہ۔ ۷۳

فہرست

مُعَنوَن

یہ کتاب مولا و آقا، سرکارِ دو عالم، پیغمبرِ آخر الزماں
حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معنون ہے۔
ہمیں اُن کا اُمّتی ہونے پر فخر ہے۔
ہم عالمِ اسلام کو انکی ۱۴۹۴ ویں سالگرہ پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

انتساب

اپنے والد بزرگوار

سید قاسم حسین رضوی صاحب مرحوم

اور والدۂ معظّمہ

سیدہ رضیہ سلطان بیگم صاحبہ مرحومہ

کے نام

کہ جن کی تربیت نے مجھ میں مطالعہ اور جستجو کی
عادت ڈالی اور مجھ میں یہ صلاحیت پیدا کی کہ میں
معاشرہ میں ایک منفرد مقام حاصل کر سکا۔ آج میں
جو کچھ ہوں اُنھیں دونوں کے طفیل سے ہوں۔
قارئین سے میرے والدین کے ایصالِ ثواب
کے لئے ایک فاتحہ کا التماس ہے۔

سید عالم حسین رضوی

پیش لفظ

سب سے پہلے میں اپنے بارے میں بتاتا چلوں۔ میں ۴/اگست ۱۹۴۱ء کو اس دنیا میں وارد ہوا۔ چونکہ میرا خاندان ہمیشہ سے ایک تعلیم یافتہ خاندان تھا اور گھر میں تعلیم کا زور تھا اس لئے مجھے بھی ۴/سال کی عمر میں اسکول بھیج دیا گیا۔ ساتھ ہی شام کو علاقہ میں قائم دینی مدرسہ میں دینیات کی تعلیم کے لئے بھیجا جانے لگا۔ اس کے علاوہ بچپن سے ہی میرے والد مجھے اپنے ساتھ مجلسوں میں لے جاتے تھے اور اس وقت کے علماء کی سنجیدہ مجلسوں سے مذہب حقہ کے بارے میں جانکاریاں ملتی رہیں۔ گھر سے نکلنے والے کئی جلوسوں نے بھی اپنا کام دکھایا۔

تعلیم مکمل کر کے جب میں نے بینک میں ملازمت شروع کی تو ملازمت کے دوران ہی میں سخت بیمار پڑ گیا اور گھر پر پڑے رہنا پڑا۔ اس درمیان جی گھبرانے کی وجہ سے گھر میں موجود مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرنا شروع کیا۔ سب سے پہلے تو قرآن اور نہج البلاغہ کے ترجمے پڑھنا شروع کئے۔ اس مطالعہ نے میرے دماغ کے دریچے کھول دئے اور پھر میں نے تمام مشہور مذاہب کی کتابوں کو پڑھنا شروع کیا۔ اسی بیماری نے مجھے حاصل مطالعہ کو تحریر میں لانے پر اکسایا اور پھر میں نے سب سے پہلے ایک کتاب ''حضرت محمد پیشین گوئیوں کے آئینے میں'' لکھی۔ اس سلسلہ میں میں نے انجیل، آوستا، ویدا اور بھوشیہ پُران میں دی گئی پیشینگوئیوں کو کتاب میں شامل کیا۔ افسوس یہ کہ یہ کتاب نایاب ہوگئی کیوں کہ دیمک نے اپنا کردار ادا کیا۔ بس اس

کے بعد مطالعہ اور تحریر کا شوق بڑھتا گیا۔ ۱۹۹۷ء ہی میں اپنی اہلیہ کے ساتھ حج و زیارت پر گیا۔ وہاں سے لوٹنے پر میں نے سفرنامہ بنام ''حج و زیارات ۱۹۹۷ء تجربات و مشاہدات'' لکھا جو بہت مقبول ہوا۔ اس وقت حج و زیارت پر جانے والے بہت سے ہونے والے حاجی اور زائر حضرات کے پاس میرا سفرنامہ ہوتا تھا۔ پھر اور بھی دو تین کتابیں اردو اور ہندی میں لکھیں۔ چونکہ مقصد پیسہ کمانا نہیں تھا اس لئے یہ کتابیں ہر خاص و عام کے پاس پائی جانے لگیں۔ ۲۰۱۷ء میں میں نے اپنی سوانح حیات لکھی۔ اس کتاب کا نام ''پرواز'' رکھا۔

مطالعہ اور تحریر کے بارے میں جو خاص بات بتانی ہے وہ یہ کہ جب میں نے کوئی موضوع پڑھا تو اس کی تحقیق کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا کہ میں اپنے مضمون کے قارئین کو دلائل کے ساتھ مطمئن کرسکوں اور وہ اسے عام مضمون سمجھ کر نظر انداز نہ کرسکیں۔ اس جذبہ نے میری بہت مدد کی اور مجھے خود مضمون لکھتے وقت اطمینان قلب حاصل ہونے لگا۔ اللہ کی مدد شامل حال رہی اور میرے اردو میں مضامین الجواد، اصلاح، تنظیم المکاتب، وظیفہ، اودھ نامہ اور دیگر اردو رسالوں میں شائع ہونے لگے اور لوگوں نے ٹیلی فون کے ذریعہ میرا حوصلہ بڑھایا۔ ہندی میں میرے مضامین ''دینک جاگرن'' اور ماہ نامہ مریم میں شائع ہوتے ہیں۔

اس بیچ آل جواد العلماء مولانا سید محمد عقیل حسینی صاحب نے ایک نئی راہ دکھائی۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ان مضامین میں جو تحقیقی مضامین میرے ہیں، انھیں یکجا کر کے کتابی شکل دی جائے تا کہ قارئین ایک ہی کتاب کے ذریعہ میری تمام تحقیقی کاوشوں کا جائزہ لے سکیں۔ انھوں نے ملت جعفریہ اسلامک یوتھ آرگنائزیشن کے مالی تعاون کا یقین دلایا۔ بس ان کی ہمت بڑھانے پر میں اس پر آمادہ ہوا اور ''وادیٔ تحقیق'' کے نام سے یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کتاب کے مطالعہ کے وقت آپ کے ذہن میں غالب کا یہ شعر ضرور آئے گا

کہ:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

بس آپ مضامین پڑھئے اور اگر کہیں غلط ہوں تو ابھی سے میری معذرت کو قبول کیجئے اور میری بے جھجک رہنمائی کیجئے۔

فقط والسلام

خاکسار

سید عالم حسین رضوی
ریٹائرڈ اسسٹنٹ جنرل منیجر
یونین بینک آف انڈیا
مکان نمبر بی، 3/330 شوالہ، بنارس
موبائل 9450543234

کسی کو بتایا گیا اور انھیں سن کر بہت سے پنڈتوں نے اسے حفظ کیا پنڈتوں کے حافظہ میں جمع یہ علم سینہ بہ سینہ چلا آرہا تھا۔ وید دو طرح کے علوم پر مشتمل ہیں، وید منتر شروتی (वेद मंत्र श्रुति) یعنی سنا ہوا محکمات کا علم اور وید تنتر شروتی (वेद तंत्र श्रुति) یعنی سنا ہوا متشابہات کا علم۔ ہندوؤں کے نزدیک ویدوں کے کسی لفظ میں تبدیلی جائز نہیں۔ دوسری مذہبی کتابیں جیسے پُران (पुराण) براہمن (ब्राह्मण) اپنیشید (उपनिषद) آرنٹریک (आरण्यक) اسمرتیاں (स्मृतियाँ) وغیرہ کو ویدوں کی تفسیر مانا جاتا ہے۔ یہ مختلف رشیوں سے منسوب ہیں۔

یہ بتانے کے بعد ہم پھر اپنے موضوع پر آتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ ویدوں اور پرانوں کے منو اور کوئی نہیں حضرت نوحؑ ہی ہیں۔ یہ مماثلت صرف منو یا حضرت نوحؑ ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ مماثلت ان کے بیٹوں تک پہنچی ہے۔ بھوشیہ پران کے مطابق منو کے تین بیٹے تھے اور تفسیر قرآن کے مطابق بھی طوفان نوحؑ کے بعد حضرت نوحؑ کے تین بیٹے بچے تھے جن کی نسلیں دنیا میں آباد ہیں یعنی سام، حام، اور یافث۔ زبانوں کے فرق کی وجہ سے ناموں کا فرق بالکل ممکن ہے ۔ہندو علماء نے بھی اسے مماثلت ہی سمجھا ہے۔ ایک ہندو عالم اندر جیت شرما نے رسالہ کلیان کے دھرمانک (مذہب نمبر) شمارہ کے صفحہ ۲۴۸ پر لکھا ہے کہ:

"آبی قیامت کی کہانی جوشت پتھ براہمن میں دی گئی ہے جس میں مچھلی کی شکل کے بھگوان کے حکم سے منو نے اپنی کشتی شمالی پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر باندھی تھی اس کو زرتشت (پارسیوں کے پیغمبر) نے دوہرایا ہے اور اس میں ہر جان دار کا جوڑا ایک گڑھے میں رکھا گیا۔ اسی کی نقل یہودی، عیسائی اور مسلمانوں کے (Noah's Arc) یعنی نوحؑ کی کشتی کے سلسلے میں کی گئی ہے۔ منو موجودہ انسانی آبادی کے آدی پرش

(پہلے آدمی) مانے جاتے ہیں نوحؑ بھی منو کا ترجمہ ہے۔ نوحؑ
کے دو بیٹے سام اور حام بتائے جاتے ہیں جن سے سامتک
(Sametic) اور حامتک (Hametic) دو نسلیں ہیں۔ منو
کی نسل میں بھی چندر ونش اور سوریہ ونش ہیں چندر کو سوم اور اور
سورج کو ہیم بھی کہتے ہیں۔ تعجب نہیں کہ یہودیوں نے سوم کو سام
اور ہیم کو حام بنادیا ہو"

حالانکہ نقل کا یہ الزام تعصب کی عینک لگا کر لگایا گیا ہے لیکن اس سے بہر حال میری یہ بات تو ثابت ہوگئی کہ ہندوؤں کی نظر میں بھی منو اور حضرت نوحؑ ایک ہی ہیں۔ جہاں تک حضرت نوحؑ کے بیٹوں سے چلی نسلوں کا تعلق ہے دنیا کی تمام قوموں کو دو طرح کی نسلوں میں تقسیم کیا گیا ہے سامی نسلیں (Semetic Races) اور غیر سامی قومیں (Non Semetic Races)

سامی قوموں میں یہودی، عیسائی اور جزیرہ نمائے عرب کے بنی اسمٰعیلؑ آتے ہیں اور غیر سامی قوموں میں آرین نسل آتی ہے۔ کم سے کم یہ بات تو طے ہے کہ ایران اور ہندوستان میں جو قومیں ہیں ان میں زیادہ تر آرین نسل سے ہیں۔

نام کے اختلاف کے سلسلے میں جو آخری بات کہنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ جب عبرانی زبان کا گولیاتھ (Goliath) عربی میں جا کر جالوت ہو جاتا ہے تو اگر منو حضرت نوحؑ ہو جاتے ہیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ تمام علامات کا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ منو ہی حضرت نوحؑ ہیں۔

(۲) دوسرا اختلاف اس پہاڑ کے نام میں ہے جہاں حضرت نوحؑ کی کشتی ٹھہری تھی۔ قرآن نے اس کا نام کوہ جودی بتایا ہے۔ اور منو جس پہاڑ پر بسے وہ کوہ منالی ہے (ظاہر ہے منو کے بعد کا نام ہے) یہاں بھی اگر ہم عہد نامہ قدیم (Old Testament) کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ کشتیٔ نوحؑ کوہ ارارات

(Ararat) پر ٹھہری تھی۔اسی طرح ہندوؤں کی کتاب بھوشیہ پُران میں ہے کہ کشتی ہمادی (हिमादि) پہاڑ کے علاقہ میں ششڑاں (शिषिणा) نامی جگہ پر ٹھہری ۔یہاں بھی زبان کے اختلاف نے جگہ کے نام میں اختلاف پیدا کیا ہے۔قرآن نے کوہ جودی بتایا ہے لیکن اس پر خاموش ہے کہ جودی ہے کہاں؟ یہاں بھی ہمیں قرائن کا سہارا لینا پڑے گا۔ظاہر ہے کہ کشتی سے اتر کر حضرت نوحؑ جہاں بسے ہوں گے وہاں ان کے ساتھی اور اولادیں بھی بسی ہوں گی تو وہ ایسی جگہ ہونی چاہئے جہاں کے لوگ اپنے بچانے والے کو باقاعدہ جانتے اور مانتے ہوں گے اور ان کا تذکرہ برابر ہوتا ہوگا لیکن جودی یا ارارات کے آس پاس کے لوگ اس بارے میں کوئی تذکرہ نہیں کرتے۔ ہاں یہ تذکرہ ہندوستان میں عام طور پر اور منالی میں خاص طور پر ہوتا رہا ہے۔یہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ حضرت نوحؑ طوفان کے بعد اسی خطہ میں رہے ہوں گے۔

(۳) تیسرا سوال حضرت نوحؑ کے مدفن کا ہے تو ہندوؤں کے یہاں دفن کا رواج نہیں ۔ہاں سمادھی کا طریقہ یادگار کے لئے رکھا ہے، اس لئے منو کے مدفن کی کوئی یادگار ان کے یہاں نہیں ملتی ہے۔بس منالی میں مہارشی منو کا مندر ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے چونکہ یہ معاملہ قبل از تاریخ کا ہے اس لئے روایتوں کا سہارا لیا گیا ہے ۔ایک روایت کے مطابق حضرت نوحؑ حضرت علیؓ کی قبر کے پاس دفن ہیں۔لیکن روزنامہ قومی جنگ رام پور اور مصنف حیدرآباد نے اپنے ۱۳/مارچ ۱۹۸۸ء کے اخبار میں گجرات کے ایک قانون داں اور محقق ایم زماں کھوکھرا کی تحقیق شائع کی تھی جس میں انھوں نے انکشاف کیا ہے کہ حضرت نوحؑ گجرات میں دفن ہیں ان کے دعوے کی بنیاد دو سو چالیس فٹ چوڑا ایک قدیم ترین مزار ہے جو قصبہ بڑیلہ شریف میں ہے یہ ایک سرحدی گاؤں ہے جو گجرات سے پانچ میل دور جانب شمال مشرق قصبہ ٹانڈہ کے نزدیک واقع ہے یہاں سے وادیٔ چھمب کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے

اور دریائے چناب اسی کے قریب بہتا ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے ہندو اس مزار کو ''منومہرست'' کے نام سے پکارتے تھے حالانکہ اس مزار میں جو ایک نوگزی قبر ہے اس کے بارے میں عام تاثر ہے کہ یہاں حضرت نوحؑ کے پوتے حضرت قبیط کا مدفن ہے لیکن ایم زماں کھوکھر انے علم کشف القبور کے دو علماء کی روایت سے ثابت کیا ہے کہ یہ قبیط نہیں بلکہ خود حضرت نوحؑ ہیں۔ زماں صاحب کے قول کے مطابق آئینۂ گجرات میں درج ہے کہ گجرات کے باشندے حضرت نوحؑ کے بیٹے حضرت حام کی اولاد ہیں۔ بڑیلہ شریف کے نواح میں مٹی کے بڑے بڑے تودے اور ٹیلے اس امر کے گواہ ہیں کہ یہاں کبھی اولاد نوحؑ کی عالیشان بستیاں رہی ہوں گی۔

جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں کہ یہ روایتیں ہیں اور ان میں صرف آثار وقرائن پر بھروسہ کرنا پڑے گا۔ یہ معاملہ بھی اصحاب کہف کے غار کی روایت جیسا ہے کہ اصحاب کہف کے غار کا دعویٰ چار علاقوں میں کیا گیا ہے۔ بہر حال چونکہ کسی اور ملک میں حضرت نوحؑ کی بعثت یا وفات کا دعویٰ نہیں ملتا اس لئے وفات کا معاملہ بھی قرائن کی روشنی میں طے کرنا پڑے گا۔

(۴) اب آخری بات منو یا حضرت نوحؑ کی امت کے سلسلے میں ہے۔ اب جب کہ میں نے آثار وقرائن سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے تو میں یہاں یہ بات پھر دہرانا چاہوں گا کہ حضرت نوحؑ طوفان کے بعد آخر کہیں تو ٹھہرے ہوں گے اور آباد ہوئے ہوں گے اور ان کے ساتھ کشتی میں ان کے ساتھی مومنین بھی کشتی سے اتر کر ان کے ساتھ ہی آباد ہوئے ہوں گے۔ ساتھ ہی طوفان کے بعد بھی حضرت نوحؑ نبی رہے ہوں گے اور ان کے ساتھ آباد ہونے والوں کی ہدایت انھیں کے ذمہ رہی ہوگی اس لئے اللہ نے کوئی کتاب اور کوئی شریعت اتاری ہوگی۔ مسلمان یہ مانتے ہیں کہ حضرت نوحؑ صاحب شریعت نبی تھے اور اتنی بڑی امت کے لئے صحیفہ کی ضرورت تھی لیکن مسلمان یہ بھی نہیں بتا پاتے کہ آخر وہ صحیفہ کہاں گیا۔ جس طرح توریت، انجیل وزبور

وغیرہ اپنی بگڑی شکل میں ہی سہی آج بھی موجود ہیں تو اتنے بڑے صاحب شریعت نبی کا صحیفہ کسی بھی شکل میں آج کیوں نہیں ہے۔ اب اگر اوپر لکھے تجزیہ کے بعد ہم مان لیتے ہیں کہ منو ثانی ہی حضرت نوحؑ ہیں تو مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے کیوں کہ ہندوؤں کی مذہبی کتاب متسیہ پران (मत्स्य पुराण) میں ہے کہ بھگوان منو سے بولے کہ جب طوفان و سیلاب سے ساری زمین پانی میں غرق ہو کر ایک ہو جائے گی اور تمہارے ذریعہ پھر تخلیق کی شروعات ہوگی تب میں ویدوں (वेदों) کو نازل کروں گا۔ کتاب کے اس بیان کے مطابق وید منو پر نازل ہوئے اور یہ بھی طے ہے کہ وید اولین صحائف ہیں تو پھر یہ بات خود بہ خود طے ہو جاتی ہے کہ حضرت نوحؑ یا منو پر نازل ہوئی کتاب وید ہے۔ اب بات صرف قوم نوحؑ کی رہ جاتی ہے۔ اب اگر منو ہی حضرت نوحؑ ہیں تو منو کو ماننے والی ہندو قوم ہی حضرت نوحؑ کی قوم مانی جانی چاہئے۔ ویسے بھی ویدک (वैदिक) دھرم دنیا کے تمام مذاہب میں متفقہ طور پر سب سے پرانا مذہب ہے اور حضرت نوحؑ دنیا کے سب سے پہلے صاحب شریعت رسول تھے۔ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ تمام اقوام میں سے کسی نے سیلاب کو اتنی تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیا ہے جتنا ہندو قوم نے۔ اور اس واقعہ کی تفصیلات حضرت موسیٰؑ کی توریت میں بیان کی گئی تفصیلات سے کسی قوم کی تحریروں میں اتنی مماثلت نہیں رکھتیں جتنی کہ ہندو قوم کی کتابوں میں ہے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ ہندو قوم اپنے اہم واقعات کے وقت کو حضرت نوحؑ سے گنتی ہے اس لئے کہ وہ حضرت نوحؑ کے سیلاب سے ہر ساٹھ سال کے وقفہ کو ایک اکائی مانتے ہیں اور ان سالوں سے اپنے اہم واقعات کو شمار کرتے ہیں۔

ہندوؤں کا موجودہ یگ ،کلیگ تقریباً اسی زمانے سے شروع ہوتا ہے جو سیلاب نوحؑ کا زمانہ ہے۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کو وہ یادگار سمجھتے ہیں، اور ان کے مصنفین اسے پانی کے سیلاب (जल प्लावन) کا نام دیتے ہوئے اس کا وضاحت سے ذکر کرتے

ہیں۔ان کی اس موجودہ یگ کی تاریخ یقیناً ''جل پلاون'' سے شروع ہوتی ہے۔

اور ادھر حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ہندو اپنی زندگی کے تمام اہم اور مشہور واقعات ومعمولات اور اپنی تمام عوامی یادگاروں کی تاریخ یا سن کو ایک سیلاب کے خاتمہ سے شمار کرتے ہیں۔ سیلاب کے بعد ہر ساٹھ سال کا ایک سال مان کر ان سالوں سے اپنے تمام عوامی اور ذاتی واقعات کی مدت شمار کرتے ہیں۔ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن جس میں ہر خشک وتر ہے اس میں حضرت نوحؑ کا ذکر تو جگہ جگہ ہے لیکن ہندو قوم کا کہیں ذکر نہیں ہے جب کہ دنیا کی ایک بہت بڑی قوم (عیسائیوں اور مسلمانوں کے بعد) ہندو قوم ہے یہ سچ ہے کہ قرآن میں ہندو لفظ کہیں نہیں ملتا۔لیکن کیا لفظ عیسائی یا کرشچن ملتا ہے تو کیا اس اصول پر ہم سمجھ لیں کہ عیسائیوں کا بھی قرآن میں ذکر نہیں ہے؟ دراصل قرآن نے عیسائیوں کے لئے لفظ ''نصاریٰ'' استعمال کیا ہے جب کہ دنیا کا کوئی عیسائی اپنے آپ کو نصاریٰ نہیں کہتا لیکن ہم جانتے ہیں کہ نصاریٰ قرآن میں ان لوگوں کو کہا گیا ہے جو آج اپنے آپ کو عیسائی کہتے ہیں بس یہی اصول ہندو قوم پر بھی لاگو ہو سکتا ہے کہ جو قوم آج اپنے آپ کو ہندو کہتی ہے اسے قرآن نے کسی اور نام سے موسوم کیا ہو۔

اگر ہم قرآن کی آیات پر غور کریں تو قرآن مجید میں جہاں بڑی قوموں کا تذکرہ آیا ہے وہاں قوم صابئین کا بھی ذکر ہے مثلاً سورۂ البقرہ کی آیت ۶۲ رمیں ہے کہ:

> ''بیشک جو لوگ ایمان لائے اور وہ لوگ جو یہود ونصاریٰ
> اور صابئین ہیں ان میں سے جو بھی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے
> اور عمل صالح کریں تو ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور نہ ان کو
> کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غم گین ہوں گے'' (ترجمہ)

اس آیت میں بھی صابئین کا ذکر مومنین، یہودیوں اور نصاریٰ (عیسائیوں) جیسی اہل کتاب قوم کے ساتھ کیا گیا ہے۔اتنی اہمیت کی حامل قوم جس کا خصوصی تذکرہ قرآن نے دنیا کی بڑی بڑی قوموں کے ساتھ کیا ہے اس کو ہم آج تک تلاش

نہیں کر سکے اور ستارہ پرست قوم کہہ کر دامن چھڑا لیا حالانکہ قرآن میں ان کو دی گئی اہمیت کے مدنظر انھیں مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح ایک نمایاں مذہبی قوم ہونا چاہئے۔

قرآن نے اسی انداز میں اہمیت کے حامل صاحب شریعت نبیوں کا ذکر کیا ہے جیسے سورۂ شوریٰ آیت ۱۳ رمیں۔

"اللہ نے تم لوگوں کے لئے وہی دین مقرر کیا جس کا اس نے نوحؑ کو حکم دیا تھا اور جس کو ہم نے آپ کے پاس وحی کیا ہے اور جس کا ہم نے ابراہیمؑ و موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو بھی حکم دیا تھا" (ترجمہ)

جہاں تک حضرت ابراہیمؑ کا تعلق ہے، ان کی قوم میں یہودی، عیسائی اور مسلمان سب شامل ہیں باقی بچے حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت نوحؑ، تو ان میں سے یہودی حضرت موسیٰؑ سے، عیسائی حضرت عیسیٰؑ سے اور مسلمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منسوب ہیں لیکن حضرت نوحؑ کی قوم کسی کو معلوم نہیں۔ کہیں انھیں کی قوم کو تو صابئین نہیں کہا گیا ہے؟ تفسیر ابن کثیر میں عبدالرحمن بن زید کا یہ قول درج ہے کہ صابئین اپنے آپ کو حضرت نوحؑ کے دین پر بتاتے تھے۔

اب اس نتیجے پر پہنچنے کے لئے کہ کہیں صابئین ہی تو ہندو قوم نہیں ہیں ہمیں کتابوں میں صابئین کی پہچان جاننی ہوگی اور پھر ہندو قوم کو سامنے رکھنا ہوگا۔

صابئین کے بارے میں جو پہچان مختلف محققین و علماء نے لکھی ہے جن میں امام غزالی، امام راغب، علامہ شوکانی، قاضی بیضاوی، سید سلیمان ندوی، اور عبدالماجد دریابادی وغیرہ شامل ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) اس کے مطابق صابئین عراق کے اس مقام کے رہنے والے تھے جہاں حضرت ابراہیمؑ پیدا ہوئے تھے۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے مقام پیدائش اُر کے علاقہ کی تہذیب اور ہندوستانی تہذیبوں مثلاً ہڑپا اور موہن جوداڑوں کے

درمیان بہت قریبی روابط تھے۔

(۲) اہل کتاب تھے (یہ تو قرآن میں صابئین کے تذکرہ سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا ذکر جگہ جگہ آسمانی کتاب رکھنے والی قوموں کے ساتھ ہی آیا ہے) متسیہ پران کے مطابق منو پر وید اترے تھے۔ اب اگر منو ہی حضرت نوحؑ ہیں تو اگر صابئین کو ہم ہندو قوم مان لیں تو یہ مسئلہ خود بہ خود حل ہو جائے گا۔ حضرت نوحؑ کی لائی ہوئی کتاب وید ہے اس پر زور دیتے ہوئے شری گنگا پرشاد اپادھیائے نے اپنی کتاب مصابیح الاسلام کے صفحہ ۴۳ر پر لکھا ہے کہ:

> ”حضرت آدمؑ کے بعد قرآن شریف میں خاص طور پر صاحبان کتاب کا ذکر آتا ہے، حضرت موسیٰؑ، حضرت داوٗدؑ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سے تو چار کتابیں منسوب ہیں۔ حضرت موسیٰؑ سے توارت، حضرت داوٗدؑ سے زبور، حضرت عیسیٰؑ سے انجیل اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرآن۔ تو کیا حضرت آدمؑ سے حضرت موسی حضرت عیسیٰؑ کے درمیان اتنے لمبے زمانے میں کوئی اہل کتاب پیدا نہیں ہوا؟“

ہم بھی اپادھیائے جی سے متفق ہیں کہ جن صاحب شریعت رسولوں کا ذکر قرآن کریم نے خصوصی اہمیت کے ساتھ بار بار کیا ہے یعنی حضرت نوحؑ، حضرت موسی، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سب کی کتابوں کے نام بتائے سوائے حضرت نوحؑ کی کتاب کے۔ لہٰذا ہمیں ان کی لائی ہوئی کتاب کو ڈھونڈ ھنا پڑے گا۔ ہندو قوم ہزاروں سال سے (نزول قرآن سے پہلے سے) یہ دعویٰ کرتی چلی آرہی ہے کہ اس کے پاس صحف اولیٰ (आदि ग्रन्थ) وید ہے۔ وید اور قرآن کے احکام میں اتنی مماثلت ہے کہ ہمیں یہ ماننے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہئے کہ وید ہی صحف اولیٰ ہے چونکہ توریت اور انجیل میں بھی تحریف ہوئی تو وید بھی تحریف سے نہیں بچ پائے ہونگے۔

(۳) لاالٰہ کہتے تھے لیکن مشرک تھے ہندوؤں کے وید میں بھی ہے کہ (एकम ब्रह्म द्वितीय नास्ति नेह, ना नास्ति किन्चन) یعنی برہم (اللہ) ایک ہی ہے اس کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہے، نہیں ہے۔ رتی بھر ذرا سا بھی نہیں ہے۔

(۴) صابئین غیر عرب نام ہے عربی نہیں، ظاہر ہے کہ ہندو قوم عربی نہیں۔

(۵) فرشتوں کی پجاری قوم تھی۔ ہندو قوم میں بھی دیوتاؤں کی شکل میں فرشتوں کا تصور ہے اور وہ ان کی پوجا کرتے ہیں۔

(٦) جماعت ستارگان اور نجوم کے معتقد تھے۔ اقوام عالم میں ہندو قوم سے زیادہ نجوم کی اہمیت کسی میں نہیں ہے۔ مختلف ستاروں اور سیاروں کی پوجا کا تصور موجود ہ ہندو مذہب کا جزو ہے۔

(۷) آگ کی پوجا کرنے والے تھے ایران کے آرین اور ہندوستان کے آرین آگ کی پوجا کرتے ہیں۔ ہوَن شادی اور ارتھی وغیرہ میں آگ کی پوجا کی جاتی ہے حد یہ ہے کہ شادی میں سات پھیرے آگ کے گرد لئے جاتے ہیں۔

(۸) مذہباً دن میں کئی مرتبہ غسل کرنے والے۔ مذہباً دنیا میں غسل کی اہمیت ہندو قوم سے زیادہ کسی میں نہیں ہے۔ ان کی کوئی پوجا اشنان کے بغیر نہیں ہوتی اور وہ دور دراز علاقوں تک میں اشنان کے لئے جاتے ہیں۔ جو اجتماعی ہوتا ہے۔

(۹) مائل ہو کر اور جھک کر ایک دین سے نکل کر دوسرے دین میں داخل ہونے والے۔ خود تاریخ اس بات کا ثبوت ہے کہ سب سے زیادہ تبدیلیٔ مذہب ہندو قوم میں ہوئی ہے۔ ہندوؤں میں ہی بودھ، جینی اور سکھ ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ قابل لحاظ تعداد مسلمان اور عیسائی ہوئی ہے۔ حیرانی کی بات ہے کہ مندرجہ بالا صابئین کے بارے میں تشریحات سب کی سب ہندو قوم پر فٹ ہوتی ہیں اس کے علاوہ ہندو قوم اور مسلمانوں کے ارکان میں بڑی مماثلت ہے جیسے۔

(۱) ہندوؤں کی چتا کا رخ شمالاً وجنوباً ہوتا ہے اور یہی مسلمانوں کی قبر کا رخ ہے

۔مسلمان بھی مس میت کے بعد غسل کرتے ہیں اور ہندو بھی میت میں شریک ہونے کے بعد اشنان کرتے ہیں۔

(ب) مسلمان حج وعمرہ کے موقع پر کعبے کے سات طواف (پھیرے) کرتے ہیں، اور ہندو مقدس جگہوں کی پریکرما (परिक्रमा)۔اس کے علاوہ شادی بیاہ کے موقع پر آگ کے پھیرے لےکر عہد کرتے ہیں

(ج) مسلمان حج کے موقع پر جو لباس احرام پہنتے ہیں وہ دو عدد بغیر سلی چادروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ایک تہبند کے طور پر اور ایک اوپر اوڑھنے کے لئے۔ہندو تیرتھ کے موقع پر ہزاروں سال پہلے ہی سے یہی لباس پہنتے چلے آرہے ہیں۔بلکہ یہ لباس اتنا اچھا مانا گیا ہے کہ عام دنوں میں بھی مرد دھوتی اور عورتیں ساڑی پہنتی ہیں۔اس کے علاوہ مسلمان حج وعمرہ کے موقع پر تقصیر وحلق کے طور پر سر منڈاتے ہیں تو ہندو بھی تیرتھوں میں اپنے سر منڈاتے ہیں۔یہی نہیں احرام کی حالت میں مسلمان پیر میں ایسی چیز پہنتے ہیں جو پاؤں کے اوپری حصہ کو نہ ڈھکے۔ہندو تیرتھ میں یا تو ننگے پیر رہتے ہیں یا کھڑاؤں پہنتے ہیں۔

(د) مسلمانوں کے یہاں اگر عقیقہ ہے تو ہندوؤں کے یہاں منڈن سنسکار۔

اتنی سب تحقیق کے بعد کل ملا کر یہ کہنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ صابئین ہی قوم نوحؑ ہیں اور چونکہ صابئین کے سلسلے کی تمام تشریحات ہندو قوم پر منطبق ہوتی ہیں لہٰذا ہندو قوم کو ہی قوم حضرت نوحؑ ہونا چاہئے یہ اور بات ہے کہ انقلابات زمانہ سے یہ قوم ایک اللہ کے ماننے کے بجائے مشرک ہوگئی۔اللہ ان کی ہدایت کرے۔آمین

۷۸۶

تقریظ

مضمون نگاری ایک ایسا فن ہے کہ جس کے لئے انسان کا صاحب علم اور صاحب مطالعہ ہونے کے ساتھ تخلیقی ذہن کا مالک ہونا بھی ضروری ہے۔ جو کچھ کسی کتاب میں پڑھا گیا، اسی کو صفحۂ کاغذ پر اتار لیا گیا تو اس کو کاپی پیسٹ (Copy & Paste) تو کہا جا سکتا ہے مگر مضمون نہیں۔ اگر چہ آج کی آرام پسند دنیا میں یہی طریقہ رائج ہے۔ اب ایسا کیوں ہے اور اس کا قصور وار کون ہے، اس کا فیصلہ کرنا تو مشکل ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر فن اپنے نشوونما کے لئے سچی اور اچھی قدردانی کا محتاج ہے۔ کسی بھی فنکار کو اس کے فن کی صحیح قیمت اس وقت ملتی ہے جب اس کو اچھے قدردان مل جائیں۔

اس دور میں پڑھنے والوں کی تعداد نا کے برابر ہے۔ ہر قلمکار یہی سوچتا ہے کہ کیوں لکھیں؟ کس کے لئے لکھیں جب کوئی پڑھنے والا ہی نہیں ہے؟ لیکن یہ بات بھی یاد رکھنے والی ہے کہ دوسرے کا اپنی ذمہ داری کو ادا نہ کرنا یہ عذر نہیں ہو سکتا ہے کہ ہم بھی اپنی ذمہ داری بھول جائیں۔

سید عالم حسین رضوی صاحب نے اس حقیقت کو درک کیا اور مسلسل قلم اٹھاتے رہے۔ مختلف اردو ہندی رسائل، جرائد اور اخباروں میں شایع ہونے والے

حضرت ابراہیمؑ تاریخ کے آئینہ میں

حضرت ابراہیمؑ کا شمار اولوالعزم پیغمبروں میں ہوتا ہے۔ اللہ نے انھیں خلیل کہا ہے۔ دنیا کے تین اہم مذاہب یعنی یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے پیغمبر حضرت ابراہیمؑ کی نسل ہی سے تھے۔

حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کے حالات اگر ہم جاننا چاہتے ہیں تو ہمارا ذہن دو الہامی کتابوں یعنی قرآن اور انجیل کی طرف جاتا ہے۔ لیکن قرآن جو معتبر ترین کتاب ہے اس میں صرف حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کے کچھ مخصوص واقعات کا ذکر ہے لہٰذا ہم قرآن کے ذریعہ حضرت ابراہیمؑ کی پوری زندگی کے بارے میں نہیں جان سکتے۔ ہمارے یہاں قصص الانبیا یا قصص القرآن جیسی کتابیں ملتی ہیں لیکن ان پر پورے طور پر اس لیے یقین نہیں کیا جاسکتا ہے کیوں کہ ان میں زیادہ تر اسرائیلیات ہیں اور انجیل کے عہد نامہ قدیم سے ماخوذ ہیں۔ اگر ہم براہ راست انجیل سے فائدہ اٹھانا چاہیں تو یہ بھی ممکن نہیں کیوں کہ اس میں اتنی زیادہ ملاوٹ ہے کہ سچ اور جھوٹ کا فیصلہ ناممکن ہے۔ موجودہ انجیلیں حضرت عیسیٰؑ کے جانے کے بعد اپنے اپنے ذہنی حافظہ کی بنیاد پر لکھی گئی ہیں اس لئے جس لکھنے والے کی جیسی ذہنیت تھی اس کے مطابق اس نے انجیل لکھی۔ ظاہر ہے کہ اس سے انجیل کی اصل شکل مسخ ہو کر رہ گئی ہے۔ حالانکہ انجیل میں حضرت ابراہیمؑ سمیت بہت سے نبیوں اور پیغمبروں کے حالات زندگی لکھے ہیں لیکن اس میں اتنی خرافات اور بیہودگیاں پیغمبروں کی طرف منسوب ہیں کہ ہم کو ان پر یقین کرنے کے لئے اپنے ایمان کو رخصت کرنا پڑے گا کہ تمام نبی و پیغمبر معصوم

تھے۔ظاہر ہے،ہم ایسا نہیں کر سکتے۔تیسرا سہارا تاریخ کا ہے جس میں اس زمانے کے بادشاہوں کا حال لکھا ہے۔ہم نے ان تینوں یعنی قرآن،انجیل اور بادشاہوں کی تاریخ کو سامنے رکھ کر حضرت ابراہیمؑ کی مختصر حالات زندگی لکھنے کی جرأت کی ہے۔

سن ولادت: مؤرخین کے اندازہ کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کا سال ولادت 1815 قبل مسیح ہونا چاہیے۔

مقام ولادت: اس میں تمام متفق ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ میسو پوٹیمیا (Mesopotamia) یعنی موجودہ عراق کے شہر اُر (UR) میں پیدا ہوئے تھے۔موجودہ عراق کے نقشہ کے مطابق اُر فرات کے دوسرے کنارے پر نجف اور بصرہ کے درمیان رہا ہوگا۔یونانیوں نے اس ملک کا نام میسو پوٹیمیا رکھا تھا جس کے معنی ہیں دو دریاؤں کے بیچ کی جگہ۔دو دریا یعنی فرات اور دجلہ جو آرمینیا کی پہاڑیوں سے نکل کر عراق کے میدانی علاقہ میں آتے ہیں۔ہاں فرات کا کچھ حصہ سیریا یعنی شام سے بھی گزرتا ہے۔میسو پوٹیمیا کے دو علاقے بابل (Babylon) اور سمیر (Sumer) تھے ان کی الگ الگ حکومتیں تھیں لیکن یہ بابل اور سمیر شہر کے نام پر پکاری جاتی تھیں۔بابل شہر فرات کے دوسرے کنارہ پر بغداد کے جنوب مشرق میں نجف کے سامنے (موجودہ دیوانیہ کے پاس) رہا ہوگا جب کہ بابل کے جنوب مشرق میں سمیر کا علاقہ تھا۔اسی سمیر کے علاقہ میں اُر (UR) شہر تھا۔

ولادت کے وقت علاقہ کی زبان

بابل اور سمیر کی زمین کی کھدائی میں آثار قدیمہ کے ماہرین نے پتھر یا اینٹوں پر کچھ تحریریں پائی ہیں۔بڑی مشکلوں سے انھیں پڑھا جا سکا۔ماہرین کے مطابق رسم الخط کو چھوڑ کر زبان جو اہل بابل اور سمیر استعمال کر رہے تھے وہ پرانی عربی زبان تھی۔اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہل بابل اور سمیر عرب تھے اور حضرت ابراہیمؑ بھی عرب تھے اور ان کی بھی زبان وہی پرانی عربی رہی ہوگی جس کا استعمال انھوں

نے ہاران، کنعان، مصر اور مکہ میں بھی کیا ہوگا۔

حضرت ابراہیمؑ کے والد

والد کے سلسلہ میں اختلاف ہے۔قرآن میں حضرت ابراہیمؑ کے والد کے طور پر آذر کا نام آیا ہے لہٰذا برادران اہل سنت آذر کو ہی والد مانتے ہیں۔مولانا حفظ الرحمن نے اپنی کتاب قصص القرآن میں بحث کے بعد آذر کو ہی والد مانا ہے لیکن شیعہ حضرات اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ان کے مطابق آذر حضرت ابراہیمؑ کا چچا تھا اور چونکہ اس نے باپ کی جگہ پالا تھا اس لئے باپ کے طور پر قرآن نے آذر کا نام لیا ہے،ورنہ حضرت ابراہیمؑ کے باپ کا نام تارخ اور والدہ کا نام مثلی تھا۔نام کے سلسلہ میں ہم کو انجیل سے سہارا ملتا ہے کیوں کہ انجیل میں حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام تارخ ہی درج ہے لیکن یہاں ایک اور مشکل ہے انجیل کے مطابق تارخ زندہ رہے اور حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ ہجرت کی اور ہاران میں جو کنعان کے پاس ہے تارخ کا انتقال ہوا۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ کے جلائے جانے کے وقت تارخ زندہ رہے ہوں گے لیکن شیعہ عقیدہ اس کے خلاف ہے۔ہم اس پر بحث نہیں کریں گے۔

حضرت ابراہیمؑ کے اُر میں قیام کے دوران وہاں کا بادشاہ

یہودی،عیسائی اور مسلمان یہ مانتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں اُر پر نمرود کی حکومت تھی۔اگر ہم قرآن کا مطالعہ کریں تو ہمیں پورے قرآن میں نمرود کا نام کہیں نہیں ملے گا۔یہ نام صرف اور صرف انجیل میں آیا ہے ورنہ تاریخ دانوں کے مطابق اس زمانے میں اُر پر سن مبلت (Sin Moballat) کی حکومت تھی۔جس نے 1819 قبل مسیح سے لے کر 1799 قبل مسیح تک حکومت کی۔1799 ق م میں حمورابی (Hamurabi) تخت پر بیٹھا۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ کے

زمانے میں اُر کا بادشاہ حمورابی تھا۔ ہو سکتا ہے اُر کے بادشاہ خود کو نمرود کہلواتے ہوں۔ جیسے مصر کے بادشاہ فرعون کہے جاتے تھے۔

حضرت ابراہیمؑ کی بت شکنی اور انھیں جلائے جانے کا واقعہ

قرآن میں ذکر کئے گئے حضرت ابراہیمؑ کی بت شکنی کے واقعہ کا جہاں تک تعلق ہے چاہے بادشاہ کا نام ''نمرود'' ہو، ''سن مبلت'' ہو ''حمور بی'' ہو یا اس سے جنگ آزما رم سن (Rim Sin) ہو یہ سب بت پرست تھے اور جب حضرت ابراہیمؑ نے توحید کی دعوت دیتے ہوئے تبلیغ کی خاطر بت شکنی کی ہوگی تو اس وقت کا بادشاہ جو بھی ہوگا وہ عوام کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ کی مخالفت میں کھڑا ہو گیا ہوگا اور اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ کو زندہ جلانے کی کوشش ہوئی مگر خدا کے حکم سے آگ گلزار بن گئی۔ اس کے بعد قرآن کے مطابق خود اللہ نے محفوظ مقام پر ہجرت کا حکم دیا۔

حضرت ابراہیمؑ کی شادی

حضرت ابراہیمؑ نے ''اُر'' قیام کے دوران ہی اپنی چچازاد بہن جناب سارہ سے شادی کی لیکن وہاں ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

حضرت ابراہیمؑ کی ہجرت

حضرت ابراہیمؑ نے اللہ کے حکم کے مطابق ناموافق حالات کو دیکھتے ہوئے اہل وعیال کے ساتھ مع حضرت لوطؑ 1780 قبل مسیح (مورخین کے مطابق) میں اُر سے ہاران کو ہجرت کی۔ حضرت ابراہیمؑ اس وقت ۳۵ ر سال کے تھے۔ اندازاً حضرت ابراہیمؑ زیادہ سے زیادہ ۲ ر سال ہاران رہے ہوں گے جہاں سے وہ لوگ پھر کنعان چلے گئے اور وہیں بس گئے۔

حضرت ابراہیمؑ کا مصر کا سفر

تقریباً آٹھ سال کنعان میں رہنے کے بعد 1770 قبل مسیح میں حضرت ابراہیمؑ نے مصر کی طرف سفر کرنے کا ارادہ کیا۔ کنعان اور مصر اتنے قریب تھے کہ کنعان والے مصر سے بہت متاثر تھے۔ مصر میں بادشاہوں کا لقب فرعون ہوا کرتا تھا۔ پہلے مصر پر قبطی نسل کے فرعون حکمراں تھے جو مصر کے اصل باشندے تھے لیکن حضرت ابراہیمؑ نے جب سفر کیا تھا اس وقت مصر کے حالات دگر گوں تھے اور کافی خون خرابہ کے بعد مصر پر بدو یا سنائی کے عرب حواریوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ حالانکہ ان لوگوں نے بھی اپنے کو فرعون کہلوایا لیکن یہ لوگ ہکسس (Hyksos) قبیلہ کے تھے۔ یہ واقعہ 1784 قبل مسیح کا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے مصر پہنچنے سے پہلے ہی حضرت ابراہیمؑ کے خلق اور مہمان نوازی کی شہرت مصر تک پہنچ گئی تھی۔ کنعان ایک ایسے مقام پر تھا کہ دمشق، اردن، سنائی، مصر، یمن اور حجاز وغیرہ جانے والے تاجر کنعان سے ہو کر گزرتے تھے۔

حضرت ابراہیمؑ ہر طرف کے لوگوں کی مہمان نوازی کرتے تھے۔ یہ لوگ جب واپس اپنے وطن جاتے رہے ہوں گے تو حضرت ابراہیمؑ کی مہمان نوازی کا تذکرہ کرتے رہے ہوں گے۔ لہٰذا ہر طرف کے لوگ غائبانہ طور پر حضرت ابراہیمؑ سے واقف ہو چکے تھے جس میں مصر بھی شامل تھا۔ ہکسس (Hiksos) فرعون جو دراصل عرب تھے اور سنائی سے تعلق رکھتے تھے انھوں نے بھی حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں سن رکھا ہوگا۔ اس سے احتمال پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت کے عرب فرعون نے حضرت ابراہیمؑ کو مصر آنے کی دعوت دی ہوگی جس پر حضرت ابراہیمؑ نے مصر کا سفر کیا ہوگا۔

حضرت ابراہیمؑ کا تقیہ

ایسا لگتا ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ مع جناب سارہ مصر کی سرحد پر پہنچے ہوں گے تو سرحدی محافظین نے چیک کیا ہوگا اور جناب سارہ کو دیکھ کر ان کی نیت میں فتور آیا ہوگا۔ اس وقت حضرت ابراہیمؑ نے تقیہ کیا اور جناب سارہ کو اپنی بہن بتایا۔ سرحدی

محافظ اس خیال سے اپنے ارادہ سے باز آئے ہوں گے کہ یہ تحفہ فرعون کے لئے ہو سکتا ہے اور اس طرح حضرت ابراہیمؑ محفوظ طریقہ سے فرعون کے دربار میں پہنچے۔

فرعون کے دربار میں حضرت ابراہیمؑ

ہمارے اس اندازہ کو کہ فرعون نے ہی حضرت ابراہیمؑ کو بلایا ہوگا، اس بات سے تقویت پہنچتی ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ دربار میں مع حضرت سارہ اور حضرت لوطؑ پہنچے تو عرب فرعون اپنے تخت سے اتر کر نیچے آیا، ان سے گلے ملا اور تعظیم میں سر جھکایا اور جناب سارہ اور حضرت لوطؑ کے بارے میں دریافت کیا اور اپنے مہمان خانہ میں ٹھہرایا۔ جب کچھ دن رہنے کے بعد آپ واپس لوٹے تو اس نے کافی دولت ،سونا، چاندی، جواہر،موتی اور بھیڑ بکریوں کے ریوڑ آپ لوگوں کو تحفے میں دئے۔ جناب سارہ کو بھی ملبوسات ، گہنے اور جواہرات تحفہ میں دئے۔ ساتھ میں ایک اچھے خاندان کی لڑکی ہاجرہ (ہو سکتا ہے خود ہکسس قبیلہ کی ہو) بھی ساتھ کی۔ یہاں انجیل میں لکھنے والوں نے بہت کچھ الٹا سیدھا حضرت سارہ کے بارے میں لکھا ہے جو قابل قبول نہیں ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی مصر سے واپسی

مصر سے واپس آکر حضرت ابراہیمؑ کنعان میں بس گئے۔ فرعون نے اتنے زرو جواہر تحفہ میں دئے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ دولت مند ہو چکے تھے لیکن سب سے بڑی دولت انھیں جناب ہاجرہ کی شکل میں ملی تھی جن کو اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کے مشن میں ایک اہم کردار ادا کرنے کے لئے چن لیا تھا۔

کنعان میں حضرت ابراہیمؑ کی دولت اور چوپایوں کی تعداد میں اتنا اضافہ ہوا کہ انھوں نے اس میں سے ایک حصہ حضرت لوطؑ کو دے کر انھیں الگ کر دیا اور علاقہ سے کافی دور بسنے کو کہا۔

حالانکہ حضرت لوطؑ جو حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے تھے انھیں نقصان بھی اٹھانا پڑا تھا کیوں کہ ''اُر'' کے حمورابی کی فوج جب دشمنوں سے لڑ کر آرہی تھی تو کچھ سپاہیوں نے حضرت لوطؑ کو پکڑ لیا تھا اور حضرت لوطؑ کی دولت لوٹ لی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ اپنے آدمیوں سمیت اس علاقہ میں فوراً پہنچے تھے اور دشمنوں سے حضرت لوطؑ کو چھڑایا تھا۔

حضرت ابراہیمؑ کی حضرت ہاجرہ سے شادی

جب حضرت سارہ کی عمر ۵۰/سال ہوگئی اور اولاد ہونے کی امید ختم ہوگئی تو حضرت سارہ نے ایک فیصلہ کیا اور انھوں نے حضرت ابراہیمؑ کی شادی حضرت ہاجرہ سے کرادی ایک سال بعد حضرت ہاجرہ کے بطن سے حضرت اسمٰعیلؑ پیدا ہوئے۔ اس وقت حضرت ابراہیمؑ ۶۱/ برس اور حضرت سارہ ۵۱/ برس کی تھیں۔ حضرت اسمٰعیلؑ 1755 قبل مسیح میں پیدا ہوئے۔

حضرت اسحٰقؑ کی ولادت

جب حضرت ابراہیمؑ ۷۵/سال اور حضرت سارہ ۶۵/سال (انجیل کے مطابق بالترتیب ۱۰۰/اور ۹۰/سال) کی ہوئیں تو اس وقت قرآن کے مطابق فرشتے نے انھیں اطلاع دی کہ سارہ کے یہاں ایک اولاد ہوگی۔ اللہ کا وعدہ پورا ہوا اور حضرت سارہ کے یہاں قبل مسیح میں اسحٰقؑ پیدا ہوئے۔ اس وقت حضرت اسمٰعیلؑ ۱۵/ سال کے تھے۔ حضرت اسحٰقؑ کی دودھ چھڑائی ۲/سال کے بعد ہوئی اور حضرت اسمٰعیلؑ ۱۷/ یا ۱۸/سال کے ہوگئے تھے۔ (بقول مؤلف طبقات ابن سعد)

حضرت سارہ کی ممتا کا عروج

حالانکہ حضرت ہاجرہ کی حضرت ابراہیمؑ سے شادی جناب سارہ کے اصرار پر ہوئی تھی اور وہ اس زمانہ میں اپنے سوتیلے بیٹے اسمٰعیلؑ کا بہت خیال بھی رکھتی تھیں لیکن جب حضرت اسحٰقؑ کی پیدائش کے بعد جناب سارہ کا احساس محرومیٔ اولاد ختم ہوا تو

پھر حضرت اسحٰقؑ کے لئے جناب سارہ کی ممتا ایسی جاگی کہ وہ حضرت اسمٰعیلؑ کو حضرت اسحٰقؑ کے لئے رکاوٹ سمجھنے لگیں اور آخر میں انجیل کے مطابق جناب سارہ نے حضرت اسمٰعیلؑ کو حضرت اسحٰقؑ سے کھیلتے ہوئے دیکھا تو ان سے برداشت نہ ہوا اور انھوں نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ اس کنیز ہاجرہ اور اس کے بیٹے کو یہاں سے نکال دو کیوں کہ کنیز کا بیٹا میرے بیٹے اسحٰقؑ کے ساتھ آپ کا وارث نہیں ہوگا۔

حضرت ہاجرہ کا حضرت سارہ سے الگ ہونا

گرچہ حضرت ابراہیمؑ کو حضرت سارہ کا مطالبہ ناگوار گزرا تھا لیکن چونکہ اللہ کی کچھ مصلحتیں تھیں اس لئے حضرت ابراہیمؑ اللہ کے حکم سے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیلؑ کو لے کر کنعان سے نکلے اور مکہ کی وادی کی طرف چلے، یہاں انجیل نے تذکرہ کیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے روٹی اور پانی مشک حضرت ہاجرہ کو دیا جسے وہ اپنے کاندھے پر رکھ کر بچے (اسمٰعیلؑ) کے ساتھ چلیں یہ واقعہ 1737 قبل مسیح کا ہے۔

یہاں حضرت اسمٰعیلؑ کو بچہ بتانے سے ایک نئی غلط فہمی پیدا ہوئی۔ یہ غلط فہمی عیسائیوں میں ہی نہیں مسلمانوں میں بھی ہے کیوں کہ جب واقعہ زم زم بیان ہوتا ہے اور حضرت اسمٰعیلؑ کی ایڑیاں رگڑنے کا واقعہ بیان ہوتا ہے تو مسلمان بھی یہی سمجھتے ہیں کہ حضرت اسمٰعیلؑ اس وقت کوئی چھوٹے سے بچے تھے جو پیاس سے ایڑیاں رگڑ رہے تھے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے حضرت اسمٰعیلؑ کے پیدا ہونے کے کئی سالوں کے بعد حضرت سارہ حاملہ ہوئی تھیں اور حضرت اسحٰقؑ پیدا ہوئے تھے اور ایک چھوٹا سا بچہ دوسرے ننھے بچے کو کھلا نہیں سکتا لہٰذا یہ بات ماننے میں تامّل ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ چھوٹے سے بچے تھے۔ طبقات ابن سعد جلد ۱ ر میں امام محمد باقر علیہ السلام کا قول دیا ہوا ہے جس میں آپ نے حضرت اسمٰعیلؑ کی اس وقت عمر ۱۷ سال بتائی ہے۔

بالفرض ہم مؤلف طبقات ابن سعد کی بات نہ مانیں تب بھی اس بات کو مانا نہیں جا سکتا کہ حضرت اسمٰعیلؑ گود کے بچے یا دو ایک سال کے بچے رہے ہوں گے

کیوں کہ اتنے چھوٹے بچے کو ماں اپنی فطرت کے مطابق گود میں لے کر جاتی نہ کہ اکیلا چھوڑ کر جاتی۔ سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت اسحٰقؑ کی عمر کے فرق کو دھیان میں رکھا جائے نتیجہ فوراً نکل آئے گا۔ کیوں کہ اس میں کسی کی دو رائے نہیں کہ حضرت اسحٰق کے پیدا ہونے پر جناب سارہ کے اصرار پر حضرت ابراہیمؑ جناب ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیلؑ کو مکہ لائے تھے۔

واقعۂ زم زم

جب حضرت ہاجرہ کا کنعان سے لائی ہوئی غذا اور مشک کا پانی ختم ہوا تو پانی کی تلاش شروع ہوئی لیکن وہاں پانی کا نام ونشان تک نہ تھا۔ آخر ایک وقت ایسا آیا کہ حضرت اسمٰعیلؑ پیاس سے آئی ہوئی نقاہت کی وجہ سے زمین پر لیٹ گئے۔ یہ حالت دیکھ کر حضرت ہاجرہ نے پانی پانے کی سعی میں صفا و مروہ کی پہاڑیوں کے درمیان ۷/ بار دوڑ لگائی۔ آخر میں جب وہ مایوس ہو کر جناب اسمٰعیلؑ کی طرف پلٹیں تو دیکھا کہ بیٹا جہاں ایڑیاں رگڑ رہا تھا وہاں سے پانی ابل ابل کر ریتیلی زمین پر پھیلا جا رہا ہے انھوں نے ''زم زم'' کے الفاظ ادا کئے اور یہ پانی ایک جگہ تھم گیا۔ یہی چاہ زم زم تھا جس کے پانی نے نہ صرف حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت ہاجرہ کو سیراب کیا بلکہ آج تک وہاں جانے والے حاجیوں کو اس پانی سے سیرابی حاصل ہوتی ہے۔

اس پانی کو دیکھ کر پرندے آنے لگے جو ان دونوں کی غذا بنتے رہے اور بعد میں قبیلہ بنی جرہم یہاں آ کر بس گیا اور بستی بننے لگی۔ عرب مؤرخین کے مطابق اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ دوبارہ مکہ آئے اور بیٹے اور بیوی کی خیریت لی۔

حضرت سارہ کا انتقال اور حضرت اسحٰقؑ کی شادی

حضرت سارہ جب ۸۲/ سال کی ہوئیں تو اللہ کا بلاوا آ گیا اور 1725 قبل مسیح میں ان کا انتقال ہو گیا ان کے انتقال کے بعد حضرت اسحٰقؑ تنہائی محسوس کرنے

لگے تھے لہٰذا حضرت ابراہیمؑ نے 1718 قبل مسیح میں حضرت اسحٰقؑ کی شادی کردی۔

کعبہ کی تعمیر

حضرت سارہ کے انتقال کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے مکہ پر توجہ دی اور اللہ کے حکم کے مطابق 1717 قبل مسیح باپ بیٹے (حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ) نے مل کر بیت اللہ کعبہ کی تعمیر مکمل کی۔ جس کا مفصل تذکرہ قرآن میں ہے لہٰذا تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سنگ اسود کو ایسی جگہ لگایا جہاں سے حاجی طواف کعبہ کی شروعات کرسکیں۔ اس تعمیر میں بنی جرہم نے بھی پورا ساتھ دیا۔

واقعۂ قربانی

کعبہ کی تعمیر مکمل ہو جانے کے بعد سارے حالات معمول پر ہو جانے چاہئے تھے لیکن اللہ کو تو حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کی عظمت کو اجاگر کرنا تھا لہٰذا ان دونوں کا امتحان لیا گیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے خواب میں دیکھا کہ وہ حضرت اسمٰعیلؑ کو ذبح کر رہے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے اسے مرضیٔ خدا سمجھ کر خواب حضرت اسمٰعیلؑ سے بیان کیا اور وہ بھی قربانی دینے کو تیار ہو گئے۔ حضرت ابراہیمؑ حضرت اسمٰعیلؑ کو لے کر چلے شیطان نے حضرت ابراہیمؑ، حضرت ہاجرہؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کو بہکانا چاہا لیکن ان لوگوں نے کنکری مار کر اسے بھگا دیا اور منیٰ کے میدان میں دونوں آئے۔ اللہ نے کنکری مارنے کے عمل کو حج میں شامل کر کے تینوں شیطانوں کے نشان بنوائے جن پر ہر حاجی کنکریاں مارتا ہے۔ منیٰ کے میدان میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنی آنکھ پر پٹی باندھ کر اور حضرت اسمٰعیلؑ کو رسی میں باندھ کر حضرت اسمٰعیلؑ کے گلے پر چھری چلا دی۔ اللہ کو چونکہ صرف ان کے استقلال کا امتحان لینا تھا اس لئے جب انھوں نے آنکھ کھولی تو دیکھا کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی جگہ دنبہ ذبح ہوا پڑا ہے اور اللہ کی آواز آئی کہ ابراہیمؑ تم نے خواب کو سچ کر دکھایا اور ایک ذبح عظیم اس کا فدیہ بنے گی۔ حضرت ہاجرہ

مضامین اس بات کا روشن ثبوت ہیں۔

مزے کی بات یہ ہے کہ عالم رضوی صاحب بینک جیسے خشک محکمہ میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے جہاں بینک کے کاموں کے علاوہ کسی تخلیقی کام میں خود کو مصروف رکھنا ایک مشکل امر تھا لیکن ان کے شوق مطالعہ و مضمون نگاری نے ناممکن کو ممکن بنا دیا۔ وہ دوران ملازمت بھی مضامین لکھتے رہے اور رٹائرمنٹ کے بعد تو ان کی مضمون نگاری عروج پر پہنچنے لگی۔

ایک بات اور، ماں باپ اپنی اولاد کا نام رکھتے ہیں مگر وہ نام محبت کی بنیاد پر رکھا جاتا ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ جو نام والدین نے اُس کا رکھا ہے وہ صفت بھی اُس میں پیدا ہو جائے۔ بہت کم افراد ایسے ہونگے کہ جنھوں نے اپنے نام کی لاج رکھی ہو مگر یہ بات میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ عالم رضوی صاحب اسم بامسمّیٰ ہیں اور یہ کتاب اس بات کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ زیر نظر کتاب ''وادیٔ تحقیق'' اُن کے تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ کیجئے، آپ کو میرے دعوے کی دلیل مل جائیگی۔

خاکسار

مولانا سید محمد عقیل حسینی

(آلِ جوادالعلماء)

مقیم گنج، بنارس

اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کے گلے پر چھری کا نشان دیکھ کر برداشت نہ کرسکیں اور اس غم میں انتقال کر گئیں۔ 1716 قبل مسیح میں قربانی کا واقعہ ہوا اور اسی سال حضرت ہاجرہ کا بھی انتقال ہوا۔

حضرت ابراہیمؑ کا انتقال

اب حضرت سارہ اور پھر بعد میں حضرت ہاجرہ کے انتقال کے بعد حضرت ابراہیمؑ تنہا رہ گئے تھے لہٰذا انھوں نے مکہ میں حضرت اسمٰعیل کی شادی کر دی اور پھر وہاں سے واپس کنعان چلے گئے جہاں حضرت اسحٰق اپنے اہل وعیال کے ساتھ باپ کے مکان میں رہتے تھے۔ حالانکہ انجیل میں حضرت ابراہیمؑ کی تیسری بیوی کیتورہ (Keturah) کا بھی ذکر ہے اور ان سے ۶/اولادیں ہونے کا بھی ذکر ہے لیکن یہ صرف انجیل میں تحریف کا ایک نمونہ ہے ورنہ ۹۸/سال میں شادی اور اتنی اولادیں قابل قبول نہیں۔

آخر میں جب حضرت ابراہیمؑ کو اپنے آخری وقت کا احساس ہوا تو انھوں نے حضرت اسمٰعیل کو کنعان بلوالیا اور دونوں بیٹوں کے سامنے 1715 قبل مسیح میں آخری سانس لی۔ حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت اسحٰقؑ نے مل کر انھیں مکپلہ (Machpelah) کے غار میں دفن کر دیا۔ یہاں سے نبوت کے دو الگ الگ سلسلے اپنی اپنی منزلوں کی طرف چل دئے۔ حضرت اسحٰقؑ سے حضرت یعقوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ وغیرہ بنی اسرائیل کے پیغمبر ہوئے اور حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل سے آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوئے جن کے زمانے میں دین اسلام مکمل ہوا۔

حضرت عیسیٰؑ کا سچ

حضرت عیسیٰؑ ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جن کے بارے میں عیسائیوں اور مسلمانوں میں اچھا خاصا اختلاف ہے۔ کچھ واضح اختلافات مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ چونکہ حضرت عیسیٰؑ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے اس لیے عیسائی انہیں خدا کا بیٹا مانتے ہیں جبکہ مسلمان انہیں قرآن کے بیان کے مطابق پیغمبر مانتے ہیں۔ جہاں تک بغیر باپ کے پیدا ہونے کا سوال ہے تو اس کے لئے قرآن نے صاف صاف بیان کیا ہے کہ حضرت مریم کنواری تھیں مگر اللہ کے حکم سے ایک فرشتہ آیا اور حضرت مریم حاملہ ہوئیں اور حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے اسی لیے مسلمان حضرت عیسیٰؑ کو روح اللہ کہتے ہیں۔

۲۔ عیسائی مانتے ہیں کہ یہودیوں کی سازش سے رومن بادشاہ کے حکم سے حضرت عیسیٰؑ کو گرفتار کر کے انہیں صلیب پر چڑھا دیا گیا جس سے ان کی موت ہوگئی۔ لیکن دوسرے دن وہ پھر زندہ ہوئے اور پھر وہاں سے چلے گئے جبکہ مسلمان قرآن کے بیان کی روشنی میں یہ مانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ گرفتار تو کئے گئے اور انہیں صلیب پر چڑھانے کے لیے لے جایا گیا لیکن اللہ نے ان کے دشمنوں میں سے ایک کو حضرتت عیسیٰؑ کی شبیہ بنا دیا اور پھر اسی کو صلیب پر چڑھا دیا گیا اور اللہ نے حضرت عیسیٰؑ کو زندہ آسمان پر اٹھالیا۔

۳۔ حالانکہ قرآن کی روشنی میں قرآن اور انجیل یا بائبل (Bible) دونوں آسمانی یا الٰہی کتابیں ہیں لیکن دونوں کے نازل ہونے کے انداز اور ان کے پیغام ماننے

والوں تک پہنچنے کے انداز میں بہت فرق ہے۔ جہاں قرآن وحی کی شکل میں رسول اسلام پر نازل ہوتا رہا اور وہاں موجود اصحاب میں سے کچھ کتابت کرتے رہے اور کچھ اسے حفظ کرتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کاتبین وحی اور حفاظ کی وجہ سے قرآن اپنی اصلی شکل میں باقی رہا اور آج بھی محفوظ ہے۔ وہیں انجیل کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ حضرت عیسیٰؑ پر جو کچھ نازل ہوا اسے محفوظ رکھنے کا کوئی انتظام نہیں ہوا۔ حضرت عیسیٰؑ کے جانے کے بہت دنوں بعد ان کے پانچ حواریوں (اصحاب حضرت عیسیٰؑ) نے اپنی یادداشت کے بل بوتے پر حضرت عیسیٰؑ کے پیغامات کو قلمبند کیا۔ ظاہر ہے کہ انسانی یادداشت سو فیصدی غلطی سے پاک ہو ایسا ممکن نہیں اسی لئے ان پانچوں نے جو انجیل قلم بند کی وہ حضرت عیسیٰؑ کی انجیل کے بجائے ان لوگوں کی انجیل کہلائی۔ موجودہ انجیل یا بائبل جو کتاب مقدس کہلاتی ہے اس کے دو حصے ہیں۔ پہلا عہد نامہ قدیم (Old Testament) جس میں توریت اور زبور سمیت حضرت عیسیٰؑ سے پہلے کے جتنے نبی یا رسول (صاحب کتاب یا صرف نبی) گزرے ہیں ان کے واقعات درج ہیں اور صاحب کتاب انبیاء کے صحیفے شامل ہیں۔ دوسرا حصہ عہد نامہ جدید (New Testament) ہے جس میں حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے لے کر اٹھا لیے جانے تک کے واقعات اور حضرت عیسیٰؑ کے پیغامات درج ہیں۔ اس کو لکھنے والے پانچ لوگ تھے ان میں سے چار نام موجودہ کتاب مقدس میں عہد نامہ جدید (New Testament) کی فہرست میں ان کی انجیل کے نام سے درج ہیں۔ ان چار حواریوں (اصحاب) کے نام سے منسوب انجیل مندرجہ ذیل ہیں جو کتاب مقدس کا حصہ ہیں۔

۱۔ متی (Mathew) کی انجیل۔

۲۔ مرقس (Mark) کی انجیل۔

۳۔ لوقا (Luke) کی انجیل۔

۴۔ یوحنا (Youhanna) کی انجیل۔

جیسا کہ میں نے شروع میں لکھا ہے کہ انجیل لکھنے والے پانچ حواری تھے لیکن پتہ نہیں کیوں اس پانچویں کی انجیل کو شامل نہیں کیا گیا اس پانچویں حواری کا نام بارناباس (Barnabas) ہے۔

یہ بتاتا چلوں کہ عیسائی کا مذہبی مرکز ویٹی کن (Vatican) بھی مندرجہ بالا چار انجیلوں کو ہی تسلیم کرتا ہے۔

اب میں اپنے اصل موضوع پر آتا ہوں۔ حال ہی میں ویٹیکن کو ایک بڑا جھٹکا لگا ہے اور اس کی وجہ ایک مشہور رپورٹر وکٹر اوشینگ (Victor Ochieng) کی ایک خبر ہے۔ وکٹر نے خبر دی ہے کہ تقریباً پندرہ سو سے دو ہزار سال پرانی ایک بائبل ترکی میں پائی گئی ہے جس میں اس بات کی تصدیق کی گئی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پر نہیں چڑھایا گیا تھا جیسا کہ عیسائی عام طور پر مانتے ہیں۔ یہ بائبل جس کا پتہ 2000 عیسوی میں لگا ہے اور جسے ترکی نے خفیہ رکھتے ہوئے اس بائبل کو خفیہ طور پر انقرہ (Anchara) کے ایتھنوگرافی میوزیم (Ethnography Museum) میں رکھا ہے اور یہ انجیل حضرت عیسیٰؑ کے اسی حواری برناباس کی لکھی ہے جس میں مندرجہ بالا دعویٰ کیا گیا ہے۔

برناباس کی بائبل میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نہ تو خدا کے بیٹے تھے اور نہ ہی انہیں صلیب پر چڑھایا گیا تھا۔ وہ بائبل کہتی ہے کہ وہ صرف ایک رسول (Prophet) تھے۔ وہ کتاب کہتی ہے کہ حواری (Apostle) پال جس نے یہ خبر پھیلائی، ایک ڈھونگی آدمی تھا اس کتاب میں یہ بھی دعویٰ کیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ جنت میں زندہ بلا لئے گئے تھے اور ان کی جگہ پر جوداس اسکیر یاٹ (Judas Iscariot) کو صلیب پر چڑھایا گیا تھا۔

یہ متنازعہ کتاب بحر اٹلانٹک کے ایک علاقے میں چھاپہ کے دوران پائی

گئی۔ اس وقت جب وہاں کے حکام نے ایک گروہ پر چھاپہ مارا تھا۔ یہ گروہ قدیم چیزوں اور غیر قانونی آتشیں اسلحہ اسمگل کرتا تھا۔ یہ خبر اخبار نیشنل ترک نے دی ہے اس پرانی کتاب کی اس وقت قیمت تقریبا 40 ملین (40 Million) یا چار کروڑ ترکی کرنسی ہے جو تقریباً اٹھائیس ملین یعنی دو کروڑ 80 لاکھ ڈالر کے برابر ہے۔ دانشوروں اور مذہبی حلقہ کے لوگوں نے اس کتاب کی جانچ کی ہے اور انہوں نے یہ تسلیم کیا ہے کہ یہ اصلی نسخہ ہے۔ یہ سنہرے حروف میں سامی، سیریا اور عراق سے متعلق آرامی (Aramaic) زبان میں لکھی گئی ہے۔ دراصل یہی زبان حضرت عیسیٰؑ کی زبان تھی۔ اس کتاب میں جو تعلیمات ہیں وہ اسلامی تعلیمات سے ملتی ہیں اور بائبل کے عہد نامہ جدید کو رد کرتی ہیں۔ اس کتاب میں حضرت عیسیٰؑ نے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش کی پیشین گوئی بھی کی ہے۔ یہاں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آج عیسائی دنیا جس بائبل کو اپنا رہنما مانتی ہے اس کی سند پر اختلافات اٹھتے رہے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ نایسیا (Nicea) کی کونسل کے زمانے میں کیتھولک چرچ نے صرف چار لوگوں کی انجیل کو مانا جن کا ذکر ہم پہلے ہی کر چکے ہیں اور جان بوجھ کر برناباس کی انجیل کو شامل نہیں کیا کیونکہ انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں ان چاروں سے الگ لکھا تھا۔

حالانکہ ان چاروں انجیلوں اور برناباس کی انجیل کے علاوہ بھی ماضی میں بہت سی انجیلیں سامنے آئی ہیں جن میں بحر مردار (Dead Sea) کے باطنی علم رکھنے والے نوسٹک (Gnostic) کی انجیل (Gospel) ہے لیکن یہ جو برناباس کی انجیل ملی ہے، اس سے ویٹی کن (Vatican) کو بڑی پریشانی ہوگئی ہے کیوں کہ اس میں حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں سب سے الگ دعوے کئے گئے ہیں۔

آج کے عیسائیوں کے لئے برناباس کے ذریعہ راز فاش ہونے سے ایک مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی وجہ سے تمام موجود عیسائی انجیلوں کی سند پر ایک سوالیہ نشان لگ رہا ہے۔

اس بات سے پریشان ہو کر کہ بارنا باس کی انجیل میں دی گئی باتیں عیسائی عقیدہ کو جھنجھوڑ سکتی ہیں ویٹیکن نے ترکی کے حکام سے گزارش کی ہے کہ انہیں کتاب کی جانچ کرنے کی اجازت دی جائے۔ حالانکہ اس راز کے فاش ہونے پر بھی پوری دنیا کے اربوں عیسائیوں کے عقیدے پر بہت زیادہ اثر نہیں پڑ پائے گا، ایسا ان لوگوں کو یقین ہے لیکن یہ عیسائی مذہبی مراکز بالخصوص ویٹیکن کے اقتدار کو کمزور کر سکتا ہے۔ حالانکہ برنا باس کی انجیل سے مسلمانوں کو کچھ لینا دینا نہیں ہے لیکن یہ کتاب ویٹیکن کو پریشانی میں ڈال سکتی ہے کیونکہ اگر جانچ کے بعد انہیں یہ پتہ لگتا ہے کہ کتاب صحیح ہے تو پھر یہ کتاب پورے کیتھولک عقیدے کو بدل سکتی ہے۔

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ مسلمانوں کو تو بس خاموش تماشائی بنے رہنا ہے۔

زرتشت

قرآن مجید میں اللہ کے اس صاف اعلان کے بعد کہ ''لِکُلِّ قومٍ ہادٍ'' یعنی ہم نے ہر قوم میں ہادی بھیجے ہیں، اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ اللہ نے دنیا کے ہر علاقہ میں ہر قوم میں ہادی بھیجے ہونگے۔ اس بات پر شک کرنا خود کو کفر کی سرحد میں لے جانا ہے کیوں کہ قرآن پر ایمان ہمارے دین کا لازمی جزو ہے۔ یہ اور بات ہے کہ قرآن نے ہر قوم کے ہادیوں کے نام نہیں دیے ہیں اس لئے ہمیں یہ نہیں معلوم کہ اللہ نے کس علاقہ میں یا کس قوم میں کس ہادی کو بھیجا۔ بہر حال یہ طے ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ لائے گئے مکمل دین سے پہلے اللہ نے دنیا کی ہر قوم میں اپنے نمائندے ہدایت دینے کے لیے بھیجے۔ انھیں ہادیوں میں ایک مشہور شخصیت زرتشت کی ہے۔

جہاں تک شیعہ مجتہدین کا تعلق ہے، موجودہ دور کے علماء جیسے آیت اللہ خامنہ ای اور آیت اللہ سیستانی وغیرہ نئی ریسرچ کی روشنی میں زرتشت کے ماننے والوں (زرتشتی یا Zoroastrian) کو اہل کتاب مانتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہوا کہ اس مذہب کے ماننے والے اللہ کے بھیجے نبی اور ان کی لائی ہوئی آسمانی کتاب پر اعتقاد رکھتے ہیں جیسے عیسائی اور یہودی۔

زرتشت کے اللہ کے نمائندہ ہونے کی جہاں تک بات ہے تو ان کے ذریعہ رسول اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں کی گئی پیشین گوئی بھی اسی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ زرتشتی مذہب کی دو کتابیں ''زند آوستا'' یا آوستا'' اور ''دساطیر'' ہیں

دساطیر کے نمبر ۱۴ رمیں نہ صرف اسلام کے اصولوں اور تعلیمات کا بیان ہے بلکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں صاف پیشین گوئی ہے۔اس میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آنے سے پہلے کے ایران میں بدامنی اور اخلاقی زوال کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ پیشین گوئی پرانی فارسی زبان میں ہے یہاں ہم صرف ترجمہ پیش کرر ہے ہیں:۔

جب پارسی (ایرانی) ایسے کاموں میں لگ جائیں گے (ظلم وزبردستی وغیرہ) تو عربوں میں سے ایک مرد ایسا پیدا ہوگا جس کے پیروکاران کے تاج وتخت و حکومت و دستور سب ختم کر دیں گے اور تمام سر اٹھانے والے ان کے شکنجے میں آ جائیں گے۔ بت خانوں اور آتش کدوں (پارسیوں کی مذہبی جگہ جہاں ہر وقت آگ جلتی رہتی ہے) کے بجائے ایسا گھر آباد ہوگا جس میں کوئی بت نہ ہوگا اور وہ اس گھر کی طرف منہ کر کے عبادت کریں گے،اور پھر ان کے پیروکار پارس کے آتش کدہ والی جگہوں وطوس و مدائن و بلخ اور دوسری بڑی جگہوں پر قبضہ کرلیں گے۔ پارس کے عقل مند لوگ اور دوسرے لوگ ان کے ماننے والوں کے ساتھ ہو جائیں گے''۔ یہ پیشین گوئی حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے کئی سو سال پہلے کی جارہی ہے۔اب آپ آزاد ہیں کہ زرتشت کو جو سمجھیں۔

مؤرخین کے مطابق زرتشت تقریباً 2680 سال پہلے یعنی حضرت عیسیٰؑ سے 660 سال پہلے (تقریباً) پیدا ہوئے تھے اور 583ر سال قبل مسیح دنیا سے چلے گئے۔زرتشت نسلی طور پر ایرانی تھے اور ایران کے مغربی علاقے کے ضلع آذربائیجان میں پیدا ہوئے تھے۔آپ کے والد کا نام ''بوروشاسپ'' تھا۔آپ شاہی نسل سے تھے اور آپ کا شجرہ چودھویں پشت میں ایرانی بادشاہ ''منوچہر'' سے جاملتا ہے۔آپ کی ولادت کے وقت کے بہت سے معجزے زرتشتی کتابوں میں لکھے ہیں۔مگر یہ میرا موضوع نہیں ہے۔جب آپ بیس سال کے ہوئے تو تمام دنیاوی خواہشوں کو ٹھکرا کر

گھر سے نکل پڑے اور ملک کے کونے کونے میں پہنچ کر نیک کام کرنے لگے۔ان کی کتابوں کے مطابق آپ جب 30سال کے ہوئے تو آپ پر وحی اترنا شروع ہوئی۔زرتشتیوں کے عقیدے کے مطابق پہلی وحی شہر ''اردبیل'' کے پاس۔،دوسال بعد دوسری وحی ''البرز'' پہاڑ پر۔تیسری دریائے تاجن کے پاس،اور چوتھی بھی یہیں اتری۔پانچویں وحی آذر بائیجان میں ایک پہاڑی ''اشاداد'' پر اور چھٹی وساتویں وحی راستے میں ہی نازل ہوئی۔

پہلی وحی نازل ہونے کے بعد سے ہی زرتشت دین کی تبلیغ کا کام پوری مستعدی سے کرتے رہے لیکن آپ کو چالیس سال کی عمر تک کوئی کامیابی نہ ملی۔اکتالیسویں سال آپ کو خیال آیا کہ کیوں نہ اپنے ملک کے بادشاہ ''گشتاسپ'' کو اپنے دین کی دعوت دی جائے۔جب آپ نے بادشاہ کو اپنے دین کی دعوت دی تو اس نے سن کر یہ شرط رکھی کہ زرتشت دربار کے مذہبی پیشواؤں سے مناظرہ کریں۔اگر وہ قائل ہو گئے تو وہ آپ کا دین قبول کرلے گا۔زرتشت مناظرہ جیت تو گئے لیکن پیشواؤں نے سازش کا ایسا جال بنا کہ بادشاہ نے آپ کو قید میں ڈال دیا۔اتفاق سے اسی زمانہ میں بادشاہ کے گھوڑے کی چاروں ٹانگیں اکڑ کر پیٹ سے جا لگیں۔ ''گشتاسپ'' اسے خدا کا عذاب سمجھ کر ڈر گیا اور زرتشت سے مدد مانگی۔زرتشت کی دعا سے گھوڑا ٹھیک ہو گیا اور ''گشتاسپ'' نے زرتشت کا دین قبول کر لیا۔یہیں سے اس دین کی ترقی ہونے لگی کیوں کہ بادشاہ کے ساتھ درباریوں نے بھی اس دین کو اپنا لیا۔ اس کے بعد تو پورے ایران میں اور ایران کے باہر بھی ہندوستان،روم،بابل،اور یونان وغیرہ میں یہ دین پھیلا۔

زرتشت کی نگرانی میں ''آوِستا'' بارہ ہزار بیلوں کے چمڑے پر سونے کے پانی سے لکھوائی گئی جسے ''دربشت'' نام کی جگہ پر رکھ دیا گیا۔اس طرح آپ کی پیروی کرنے والے ''جاماسپ'' نے بھی آوستا کی نقل لکھی جسے ''شاپیگاں'' کے خزانے میں محفوظ کر دیا گیا۔لیکن اس کتاب کے ساتھ بھی وہی ہوا جو بائبل کے ساتھ

ہوا۔ زرتشت کی موت کے 300 سال بعد سکندر اعظم نے پارس کے بادشاہ دارا کو ہرا کر پورے ملک پر قبضہ کرلیا اور زرتشت کی آوستا کو جلا کر ختم کر دیا۔ نتیجہ یہ کہ بعد میں لکھی گئی آوستا اصل نہ ہو کر یادداشت کی بنیاد پر لکھی گئی ہے جس میں یہ بات پوری طرح ممکن ہے کہ وہ باتیں بھی شامل ہوگئی ہوں جو زرتشت نے نہیں کہیں۔

زرتشتیوں نے بھی اپنا مذہب منوانے کے لیے جنگوں کا سہارا لیا اور اپنے مذہب کو ساری دنیا میں پھیلانے کی مہم چلائی اور اسے کامیاب بنانے پر پورا زور لگا دیا۔

اب زرتشت کا آخری وقت آ گیا تھا۔ توران کا بادشاہ ''ارجاسپ'' پارس کے بادشاہ ''گشتاسپ'' سے جلا بیٹھا تھا۔ اس بیچ ''گشتاسپ'' دو سال کے لیے سیستان گیا ہوا تھا، ارجاسپ نے گشتاسپ کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھایا اور پارس پر حملہ کر دیا اور پارس کی راج دھانی بلخ پر قبضہ کر کے خوب لوٹ مار کی اور زرتشتیوں کی سب سے بڑی عبادت گاہ کو تباہ و برباد کر دیا۔ اس وقت زرتشت عبادت کر رہے تھے ۔ان کو پہچان کر انھیں بھی قتل کر دیا گیا۔ اس طرح ایک قوم کی اصلاح کرنے والا 583 قبل مسیح میں قتل ہو کر اس دنیا سے چلا گیا۔ زرتشت کے بعد ان کا مذہب اور پھیلا اور دنیا کی سات حکومتوں میں اس مذہب کو لوگوں نے قبول کیا۔

زرتشتی مذہب کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ یہ آتش پرستی کو بڑھاوا دیتا ہے لیکن یہ سچ نہیں ہے۔ اصل زرتشتی مذہب توحید کو مانتا ہے۔ اصل زرتشتی مذہب کے بنیادی عقیدے یہ ہیں۔

(۱) اس کائنات کا اکیلا مالک خدائے اکبر یا یزداں یا اہورامزدا ہے۔ اس لیے انسانوں کو چاہیے کہ اسی کی عبادت کریں وہی حقیقی اور اصلی معبود ہے۔

(۲) حقیقی معبود یہ بت، چاند، سورج، دریا، پہاڑ اور پیڑ وغیرہ نہیں ہیں بلکہ وہ ہے جس نے ان سب کو بنایا ہے۔ وہ آنکھیں نہیں رکھتا مگر سب کچھ دیکھتا ہے۔ کان نہیں رکھتا مگر سب سنتا ہے۔ ناک نہیں رکھتا ہے مگر سب سونگھتا ہے۔ زبان نہیں رکھتا مگر بول سکتا ہے۔

(۳) وہ بتوں کے پتھر کی طرح ٹوٹ جانے والا، پیڑوں کی طرح سوکھ کر گرنے والا،

۷۸۶

تقریظ

اردو علم و ادب میں کئی نام ایسے ملیں گے جن کی روزمرہ کی سرگرمیاں اردو زبان و ادب سے قطعی طور سے دور تھیں لیکن تاریخ اردو ادب میں انھوں نے اپنا ایک مقام بنالیا۔ ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو درس و تدریس سے متعلق تو تھے لیکن ان کا تعلق انگریزی زبان سے تھا۔ کچھ ایسے تھے جو سرکاری محکمہ جات میں خدمات انجام دے رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ سرکاری محکمہ کی ساری کاغذی خانہ پری انگریزی یا ہندی زبان میں ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ دفتری ماحول جو اردو شعر و ادب یا نثر نگاری سے قطعاً نابلد ہوتا ہے۔ اوپر سے دفتری فرائض کی ادائیگی میں عدیم الفرصتی۔

اس مختصر گفتگو میں میں ان حضرات کے نام گنوانا نہیں چاہتا جن حضرات نے اردو سے دور رہ کر بھی اردو کی خدمت کی، اہل علم ان سے بخوبی واقف ہیں۔

انھی ناموں میں ایک نام محترم سید عالم حسین رضوی صاحب کا بھی ہے، اگر یہ کہا جائے کہ عالم نام کی مناسبت سے آپ اسم بامسمّٰی ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ ساتھ ہی نہایت ملنسار، خوش مزاج، اور آپ جتنے خوب صورت ہیں ویسے ہی خوب سیرت بھی ہیں۔ آپ یونین بینک میں اسسٹنٹ جنرل منیجر کے عہدے سے ریٹائرڈ ہیں۔ گویا ساری زندگی آپ نے عوام کی دولت کی امانت داری میں گزار دی۔ اس کے باوجود

چاند سورج اور ستاروں کی طرح دن رات گھومتا رہنے والا اور پہاڑوں کی طرح اپنی جگہ جما ہوا نہیں ہے۔ یہ سب بے بس ہیں۔ معذور ہیں۔ وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ یہ تمام چیزیں بے جان ہیں مگر وہ بے جانوں میں جان ڈال سکتا ہے۔ یہ فانی ہیں لیکن اس کو فنا نہیں۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ انسانوں نے اپنا الو سیدھا کرنے اور انسانوں کو اپنے چکر میں رکھنے کے لئے جھوٹے خدا بنا لئے ہیں۔ ان کو چھوڑ و اور حقیقی خدا کی طرف آجاؤ۔

(۴) خدائے اکبر کو پسند ہے سچائی، نیک خیالات اور تقویٰ۔ اس کو خوش رکھنے کے لئے انسانوں کو چاہئے کہ خود کو خیالات، گفتگو اور عمل کے سلسلہ میں نیک بنائیں۔

(۵) خالق اکبر کا برائی اور بری چیزوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ برائی کا خالق اہرمن (شیطان) ہے۔ دنیا میں جتنی برائی ہے، سب اس کی پیدا کی ہوئی ہے۔ اہرمن کی برائی کو دیکھ کر خدائے اکبر نے اسے الگ کر دیا اور تب اہرمن نے دنیا میں برائی پھیلانا شروع کر دی۔ انسانوں کو چاہئے کہ اہرمن کو نہ مانیں۔ انسان اہرمن کے پیچھے اس لئے چلنے لگتا ہے کہ انسان کو ارادہ کی آزادی دی گئی ہے۔ مگر یہ آزادی اصل میں ایک امتحان ہے۔ انسان کے اعمال روز کے روز اس کے اعمال نامہ میں درج کئے جاتے ہیں۔ اچھے اعمال کی جزا اور برے اعمال کی سزا ملے گی۔

(۶) انسان مرنے کے بعد ایک ایسی زندگی میں داخل ہونگے جہاں ان کے اعمال ناموں کو دیکھ کر جزا یا سزا دی جائے گی۔ برے انسان کو جو سزائیں دی جائیں گی ان میں سب سے زیادہ خوف ناک سزا آگ سے جلایا جانا ہے۔ جہنم کی آگ ایک پُل کے نیچے پھیلی ہوئی ہے، جب نیک انسان گزرتے ہیں تو پُل چوڑا ہو جاتا ہے لیکن جب گنہگار گزرتے ہیں تو یہ پُل بال کے برابر باریک ہو جاتا ہے۔

(۷) جس کے نیک اعمال زیادہ ہوں گے اسے جنت میں بھیجا جائے گا، اور جس کے برے اعمال زیادہ ہونگے اسے دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔

(۸) ایک دن ایسا بھی آئے گا جب یہ دنیا ختم ہو جائے گی۔ وہ دن یوم قیامت ہوگا۔

زرتشتی مذہب کا زوال

زرتشت کا مذہب سیدھے سادے عقیدے والا تھا لیکن ان سے پہلے جو آتش پرستوں کا مذہب تھا اس کے ماننے والے مجوسیوں نے حالات دیکھ کر کچھ وقت کے لئے بھیڑ کی کھالیں اوڑھ لی تھیں اور زرتشتی مذہب میں شامل ہو گئے تھے لیکن دل ہی دل میں عقیدہ مجوسی والا رکھا تھا اور زرتشت کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی انھوں نے زرتشتی مذہب کی آڑ میں زرتشتی مذہبی پیشوا بن کر مجوسیوں والی عبادتیں زرتشتی مذہب میں شامل کر دیں۔ آگ کی دیوی اور پانی کی دیوی کی پوجا فرشتوں کے نام سے ہونے لگی۔ حد یہ ہے کہ مرنے کے بعد مُردوں کو کھلی جگہ میں پھینک کر گدھ جیسے جانوروں کی خوراک بنانے کا مجوسی طریقہ زرتشتی مذہب میں لاگو کر دیا۔ یہ زرتشت کے مذہب کے لئے نا قابل تلافی نقصان ہے۔

چونکہ زرتشت پارس (فارس یا ایران) کے رہنے والے تھے اس لئے ان کے ماننے والوں نے خود کو پارسی کہنا شروع کیا اور پھر زرتشتی مذہب پارسی مذہب کے نام سے جانا جانے لگا۔ جب ایران میں اسلام پوری طرح چھا گیا تو یہ پارسی اپنا وطن ایران چھوڑ کر دنیا کے الگ الگ حصوں میں پھیل گئے۔ کافی تعداد ہندوستان کے صوبہ گجرات میں آئی جہاں وہ اس طرح سما گئے کہ ان کے بعد کی نسلوں نے گجراتی کو اپنی مادری زبان بنا لیا۔ پھر یہ لوگ گجرات، ممبئی اور بہار کے کچھ علاقوں (جمشید پور وغیرہ جو اب جھارکھنڈ میں ہے) میں پھیلے اور زیادہ تر نے اپنے کاروبار کو اپنایا اور خوب دولت کمائی۔ آج یہ دولت مند قوم ہے اور بہت اونچے مقام پر ہیں۔ کچھ پاکستان اور افریقہ میں ہیں۔ ایک تشویش ناک بات یہ ہے کہ ان کی تعداد گھٹتی جا رہی ہے۔ پتہ نہیں کیوں ان میں شادی کا رجحان نہیں ہے اور اس وجہ سے نسل میں اضافہ نہیں ہو رہا ہے۔ اس بات کی تشویش پارسی اداروں کو بھی ہے۔ بہر حال اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو پھر زرتشتی مذہب کا کوئی نام لیوا نہ رہے گا۔ خدا کرے ایسا نہ ہو۔

(حوالہ:۔ کتاب زرتشت۔ مورخ مظہر انصاری)

اسلام کی محسنہ

اُم المومنین جناب خدیجۃ الکبریٰ

جب جناب خدیجہ کا نام آتا ہے تو ایک ایسی خاتون کے چہرے کا خاکہ نظر میں پھرتا ہے جس نے اپنی محنت اور ذہانت سے اپنی تجارت کو وہ بلندی عطا کی کہ عرب کے اس ماحول میں جہاں مرد کی حاکمیت تھی اپنے لئے ملیکۃ العرب کا لقب پا لیا۔

جناب خدیجہ کے والد کا نام خویلد تھا آپ کے والد کے متعلق کسی مؤرخ نے نہیں لکھا ہے کہ وہ ایک بڑی تجارت کے مالک تھے۔ان کے والد کا انتقال اس وقت ہوا جب جناب خدیجہ 14 سال یا 15 سال کی ہو گئیں۔ان کو باپ کی طرف سے وراثت میں کچھ نہیں ملا کیونکہ دور جاہلیت میں لڑکیوں کو ورثہ میں کوئی حصہ نہیں ملا کرتا تھا۔دوسرے یہ کہ باپ کے وارث آپ کے بھائی عوام بن خویلد موجود تھے اس لئے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ یہ جناب خدیجہ کی غیر معمولی صلاحیت تھی کہ ایک عظیم الشان تجارت قائم کرلی جو تاریخ میں یادگار اور بے مثال ہے۔

جناب خدیجہ کا نسب آنحضرتؐ سے چوتھی پشت میں جاملتا ہے۔خدیجہ بنت خویلد بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصیٰ ۔حبیبِ خدا کا شجرہ یوں ہے۔محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قصیٰ ۔قریش آپ کو بلحاظ سیادت وشرافت سیدۃُ القریش کہتے تھے اور زمانہ جاہلیت ہی سے آپ کو طاہرہ کا لقب دیا جا چکا تھا۔(صحیح

بخاری)

جناب خدیجہ کے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل بن اسد آسمانی کتابوں کے عالم تھے۔ وہ آنے والے نبی کی بشارت اور نشانیوں سے آگاہ تھے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے کہ جناب خدیجہ نے اپنی غیر معمولی صلاحیت سے اس زمانے میں تجارت میں سب سے اونچا مقام حاصل کرلیا تھا۔ ان کے مقابلے کا کوئی رئیس پورے عرب میں نہیں تھا۔ ابن سعد کے مطابق بے حد اور بے پناہ مال کی مالک تھیں۔ وہ ایک تاجرہ خاتون تھیں جن کا مال ملک شام کی منڈیوں میں جایا کرتا تھا۔ پورے قریش کے تجارت پیشہ لوگوں کا جتنا مال تجارت ہوا کرتا تھا اتنا مال تنہا جناب خدیجہ کا ہوا کرتا تھا ۔ آپ لوگوں سے اجرت پر تجارت کا کام لیا کرتی تھیں اور منافع کی شرکت پر مال دیا کرتی تھی (طبقات ابن سعد)۔ علامہ مجلسی کے مطابق:

جناب خدیجہ ہر ایک قصبہ میں غلام اور حیوانات بیشمار رکھتی تھیں۔ بعضوں نے لکھا ہے کہ 80 ہزار سے زیادہ اونٹ تھے جس کی وجہ سے آپ کے ملازم و وکیل ہر مقام میں تجارت میں مشغول رہتے تھے مانند مصر و شام اور حبشہ وغیرہ۔ (حیات القلوب)

جناب خدیجہ اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کی زبانی آنے والے نبی کی پیشین گوئی سن کر شروع ہی سے آنے والے نبی کی منتظر تھیں۔ اسی زمانے میں سرورِ کائناتؐ بھی اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ دس بارہ سال کی عمر سے ہی تجارت میں مشغول ہوگئے تھے۔ پیشین گوئی کے پیش نظر جناب خدیجہ نے آپ کو بلوایا اور اپنا مال تجارت آپ کے حوالے کیا ساتھ میں اپنے غلام میسرہ کو آپ کو پرکھنے کے لئے بھیجا۔ راہ میں نسطور راہب ملا جس نے یہ خوشخبری دی کہ آنحضرتؐ ہی ہونے والے آخری نبی ہیں۔ نبوت کی کھلی نشانیوں کی وجہ سے میسرہ کے دل میں آپ کی بے پناہ محبت موجزن ہوگئی۔ واپسی پر وہ آپ سے پہلے جناب خدیجہ کے پاس پہنچنے کے

لئے روانہ ہوا۔ آپ دوسری عورتوں کے ساتھ بالا خانے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ آپ سب نے دیکھا کہ سرور کائنات اونٹ پر بیٹھے ہیں اور دو فرشتے ان پر سایہ کئے ہوئے ہیں ۔سب کو تعجب ہوا میسرہ نے بھی آ کر نسطور راہب کی خوش خبری سنائی ۔ جناب خدیجہ نے ان واقعات کا ذکر اپنے بھائی ورقہ بن نوفل سے کیا تو انہوں نے تصدیق کی کہ یہ وہی نبی ہیں جن کا ذکر آسمانی کتابوں میں ہے اور جن کا انتظار کیا جا رہا ہے ۔(سیرت ابن ہشام) وہ، جن کا انتظار جناب خدیجہ کو تھا، ان کی نشاندہی کے سلسلے میں جناب خدیجہ نے میسرہ کو انعام واکرام وخلعت فاخرہ سے نوازا اور انہیں آزاد کر دیا۔(حیات القلوب)

جناب خدیجہ نے جو کسی شخص کی خواہش عقد کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھیں۔ محسوس کیا کہ ان کی منزل آ چکی ہے جناب خدیجہ کی مرضی سے ان کی سہیلی نے ان کے رجحان کا ذکر حضرتؐ سے کیا۔ آپ نے اس کا تذکرہ جناب ابو طالب سے کیا۔ جناب ابو طالب نے جناب خدیجہ کے چچا عمرو بن اسد سے حضرت کے لئے جناب خدیجہ کا رشتہ مانگا۔(سیرت ابن ہشام)

بقول ابن ہشام ورقہ بن نوفل نے نکاح سے قبل عمائدین قوم سے پوچھا خدیجہ کے متعلق کیا کہتے ہو؟ سب نے ان کی تعریف وتوصیف کی تو ورقہ نے کہا کیا وہ عمر بھر شادی نہ کریں؟ اس پر ان لوگوں نے کہا وہ خود عقد سے انکار کرتی رہیں ہیں۔ یہ مناسب بات نہیں کہ ان کا عقد نہ ہو۔ اس پر انہوں نے آنحضرت کی طرف سے رشتہ مانگنے کا اعلان کیا (ملیکۃ العرب)

اس اعلان کے بعد جناب خدیجہ کا عقد حضرتؐ سے ہو گیا۔ حضرت کے تمام چچا شریک تھے ۔حضرتؐ کی طرف سے جناب ابو طالب نے اور جناب خدیجہ کی طرف سے ورقہ بن نوفل اور عمرو بن اسد نے خطبہ نکاح پڑھا۔ جناب خدیجہ اپنے ساتھ بے شمار دولت لائیں۔ مؤرخین نے جو اندازہ لگایا ہے اس کا اگر آج کے

ہندوستانی کرنسی سے موازنہ کریں تو تقریباً 2 ارب کی دولت ساتھ لائیں۔ دینار کا ڈھیر اتنا اونچا تھا کہ آپ دکھائی نہیں پڑ رہی تھیں۔ آپ نے اس موقع پر بے شمار غلاموں کو آزاد کر دیا۔ اپنی شادی میں جناب خدیجہ نے خوشیوں کے اظہار میں کوئی کمی نہیں کی۔ ایسے لنگر کا انتظام کیا کھاؤ پیو اور ضرورت مند ہو تو اپنی ضرورت بھر طعام بھی لیتے جاؤ۔ اس موقع پر ندائے غیبی گونجی کہ، طاہر کو طاہرہ سے اور صادق کو صادقہ سے بیاہ دیا گیا ہے۔ (سیرت حلبیہ)

شادی کے وقت جناب خدیجہ کی عمر کے بارے میں اختلاف ہے۔ شیعہ مورخین نے بلا کسی اختلاف جناب خدیجہ کی عمر شادی کے وقت اٹھائیس سال لکھی ہے جبکہ اہلسنت مورخین میں اختلاف ہے۔ ابن سعد نے آپ کی عمر کے متعلق دو طرح کی روایت درج کر دی ہے۔ جہاں چالیس سال والی روایت لکھی ہے وہی اٹھائیس سال ہونے کی روایت بھی درج کر دی ہے۔

ہم کو خبر دی ہشام بن صائب نے اپنے والد سے، انہوں نے ابی صالح سے انہوں نے ابن عباس سے کہ جب حضرت خدیجہ سے حضور رسول اللہ نے نکاح کیا حضرت خدیجہ کی عمر 28 برس تھی۔ (طبقات ابن سعد)

حیدر آباد کے مشہور اہلسنت محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ لکھتے ہیں: جناب خدیجہ کے متعلق بعض افراد کا کہنا ہے کہ انہوں نے چالیس سال مکمل کر لیے تھے اور دو مرتبہ بیوہ ہو چکی تھیں لیکن ابن حبیب (کتاب المُحبَّر) کے مطابق 28 سال کی تھیں (رسول اکرم کی سیاسی زندگی)

اب ایک منطقی دلیل بھی پڑھ لیجئے۔ کتاب مقاتل الطالبین میں بوقت وفات جناب خدیجہ کی عمر 55 سال بتائی گئی ہے اس لحاظ سے بوقت عقد جو وفات سے کم از کم 26 سال قبل ہوا ہے جناب خدیجہ کی عمر 28 یا 29 سال سے زیادہ ہو ہی نہیں سکتی اسی طرح جناب خدیجہ پر ایک تہمت اور لگائی گئی کہ رسولؐ سے شادی سے پہلے وہ

دو بار اور شادی کر کے بیوہ ہو چکی تھیں۔ ناصر الملت طاب ثراہ نے بعد تحقیق یہ بات واضح کر دی ہے کہ رسول سے شادی کے وقت جناب خدیجہ کنواری تھیں۔ پتہ نہیں کیوں کچھ متعصب مؤرخین جناب خدیجہ کو دو بار کی بیوہ بنانے پر تلے ہوئے تھے اگر ہم ان کے اس بے بنیاد الزام کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کریں تو مضمون طویل ہو جائے گا۔

علامہ مجلسی بیان کرتے ہیں کہ عقد کے بعد کل مال و متاع جناب خدیجہ نے ورقہ بن نوفل کے حوالے کیا اور کہا کہ یہ مال حضرت کی خدمت میں پیش کریں اور کہہ دیں کہ یہ سب اور خدیجہ کی جملہ دولت اور غلام وغیرہ جو بھی شے ان کی ملکیت ہے وہ سب ان کو ہبہ کر دیا ہے ان کی جلالت قدر اور عظمت شان کی وجہ سے ورقہ بن نوفل زم زم اور مقام ابراہیم کے درمیان آ کر کھڑے ہوئے اور بلند آواز سے لوگوں کو پکارا۔ اے گروہ عرب! خدیجہ تم کو اس بات پر گواہ بناتی ہیں کی انہوں نے اپنے نفس کو اپنے غلاموں اپنے خادموں کو اور وہ تمام چیزیں جن کی وہ مالک ہیں از قوم چوپایہ و اموال و ہدایہ وغیرہ سب اپنے شوہر محمدؐ کو ہبہ کیا اور جو کچھ خدیجہ نے ان کو ہبہ کیا انہوں (محمدؐ) نے سب کو قبول کر لیا (بحار الانوار جلد 6)

بدو عرب جو انتہائی غریب تھے اور لوٹ مار کر کے اپنی زندگی گزارتے تھے اور شہری عرب جو دھوکے باز اور مکار تھے انہوں نے جب سنا ہوگا کہ خدیجہ نے اپنی ساری دولت محمدؐ کو ہبہ کر دی ہے تو ایسے لوگ بڑی آس سے ان دونوں کے پاس آئے ہوں گے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب خدیجہ نے محمدؐ کی خواہش پر دوسرے بہت سے غلاموں کو آزاد کر دیا تھا۔

اعلان نبوت کے بعد جناب رسول خدا اور جناب خدیجہ تجارت کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکے۔ لیکن ان کی صداقت پر ایمان لا کر مسلمان ہونے والے کمزور مسلمانوں کو فاقوں سے بچانا تھا اور ان پر ڈھائے جانے والے مظالم کو خاندانی وجاہت اور دولت کے بل پر دور کرنا تھا اور اس وقت یہ کام جناب خدیجہ کی دولت نے

کیا۔ ظاہر ہے کہ اعلان نبوت کے فورا بعد جناب خدیجہ نہ صرف مسلمان ہوگئیں، بلکہ اس وقت کی مسلمان عورتوں کے لئے نمونہ بنیں۔ شبلی نعمانی کے بقول سب سے پہلے رسول خدا نے حضرت خدیجہ کو اللہ کا پیغام سنایا وہ سننے سے پہلے مومن تھی (سیرت النبی) تن من دھن سے مکمل سپردگی کے باوجود حضرت جناب خدیجہ کی دولت صرف کرنے میں ان کی مرضی کو بھی مدنظر رکھتے تھے۔ ایک بار جناب خدیجہ نے رسول کو غمگین ہونے پر وجہ پوچھی تو رسول نے فرمایا کہ یہ قحط کا زمانہ ہے۔ تمہارا مال خرچ کرنے میں حیادامن گیر ہے اور نہ کروں تو خدا سے ڈرتا ہوں۔ حالت یہ ہے کہ مسلمان بھوکے مررہے ہیں۔ جناب خدیجہ نے قریش کو طلب کیا۔ حضرت ابوبکر بھی آگئے تھے وہ بیان کرتے ہیں کہ جناب خدیجہ نے دینار نکال نکال کر قریش کے سامنے ڈھیر لگانا شروع کیا، یہاں تک کہ ایک طرف کا آدمی دوسری طرف کے شخص کو دیکھ نہ سکتا تھا۔ اس کے بعد جناب خدیجہ نے فرمایا تم سب گواہ رہنا کہ میرا یہ مال رسول خدا کا مال ہے وہ جو چاہیں کریں (تفسیر کبیر فخر الدین رازی)

اللہ نے جناب خدیجہ کے اس فعل کو اتنا پسند کیا کہ اس کو قران میں اپنی طرف سے منسوب کر کے جناب خدیجہ کو یہ کہہ کر عزت بخشی کہ (اے رسول) تم کو تنگ دست دیکھ کر (جناب خدیجہ کے مال سے) غنی کر دیا (سورہ ضحیٰ)

اعلان رسالت کے بعد معراج کا واقعہ پیش آیا۔ شیعی روایات کے مطابق یہ واقعہ 2 بعد بعثت یا 5 بعد بعثت ہوا اہلسنت زیادہ تر تین بعد بعثت کو مانتے ہیں۔

3 بعد بعثت میں اللہ کے حکم سے دعوت ذوالعشیرہ کا اہتمام ہوا حضرت نے جناب خدیجہ سے کچھ طعام تیار کروانے کو کہا اور یہ دعوت جناب ابوطالب کے گھر ہوئی اس دعوت کی تفصیل میرا موضوع نہیں ہے۔

ایک بار حج کے زمانے میں آنحضرت نے صفا و مروہ سے اسلام کی دعوت دی ابو جہل نے آپ کو ایک پتھر کھینچ کر مارا جس سے آپ کی پیشانی زخمی ہوگئی۔

دوسرے مشرکین نے رسول پر پتھر برسانے شروع کیے۔ آپ کوہ ابوقبیس پر چڑھ کر ایک جگہ تکیہ دے کر کھڑے ہوگئے جب رات ہوئی حضرت علیؑ اور جناب خدیجہ رسولؐ کو گھر لائے جب مشرکین کو خبر ہوئی تو انہوں نے گھر پر بھی پتھر پھینکنے شروع کیے۔ حضرت علیؑ اور جناب خدیجہ حضرتؐ کے سامنے کھڑے ہو گئے اور آنے والے پتھروں کو اپنے اوپر روکنے لگے۔ پھر جناب خدیجہ نے فریاد کی۔ اے گروہ قریش! تم شرم نہیں کرتے اس عورت کے گھر پر پتھر برسا رہے ہو جو تمہارے درمیان سب سے زیادہ نجیب ہے۔ اگر اللہ سے نہیں ڈرتے ہو تو ننگ و عار کے خیال سے باز رہو یہ سن کر وہ لوگ واپس لوٹ گئے (حیات القلوب)

جناب خدیجہ کی اولاد کا جہاں تک تعلق ہے آپ کے پہلے بیٹے قاسم تھے جو مکہ میں قبل بعثت پیدا ہوئے اور قبل بعثت ہی کم عمری میں وفات پائی ان ہی کے نام سے حضرت کو ابوالقاسم کہا جاتا ہے دوسرے فرزند عبداللہ بعثت کے بعد مکہ میں پیدا ہوئے اور انتقال فرما گئے دونوں فرزندوں کے انتقال پر عاص بن وائل آپ کو ابتر کہنے لگا جس پر سورہ کوثر نازل ہوئی۔

۲ بعثت اور معراج کے بعد جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کا حمل قرار پایا رسول اللہ کی تبلیغ اسلام کے کام میں جناب خدیجہ کے تن من دھن سے شریک ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی عورتوں نے جناب خدیجہ سے ترک تعلق کرلیا جب ولادت کی ساعت آئی وہ عورتیں نہیں آئیں لیکن جناب فاطمہ بنت اسد سمیت بنی ھاشم کی تمام اسلام لا چکی عورتیں اس کام کے لئے موجود تھیں۔

علامہ مجلسی کے مطابق ولادت کے وقت اللہ نے جناب سارہ، جناب آسیہ، جناب مریم اور جناب موسیٰؑ کی بہن جناب ام کلثوم کو بھیج دیا تھا اور پھر بعثت کے پانچویں سال 20 جمادی الثانی بروز جمعہ جناب سیدہ (س) اس دنیا میں تشریف لائیں۔ تاریخ ولادت اور سن میں برادران اہل سنت میں اختلاف ہے کچھ پیدائش

قبل بعثت مانتے ہیں اور کچھ بعد بعثت مانتے ہیں۔ صاحب تاریخ الخمیس اور صاحب حبیب السیر اس کے قائل ہیں کہ آپ کی پیدائش 5 بعثت ہوئی ہے بہرحال یہ میرا موضوع نہیں ہے۔

ہاں جناب خدیجہ کی بیٹیوں کی تعداد میں بہت زیادہ اختلاف ہے جہاں شیعہ حضرات جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کو جناب خدیجہ کی اکلوتی بیٹی مانتے ہیں وہیں علمائے اہلسنت نے الگ الگ تعداد لکھ کر خود اپنے اندر ہی اختلاف ظاہر کر دیا ہے۔ بہ اتفاق مؤرخین 25 سال کی عمر میں رسول اللہ کا جناب خدیجہ سے عقد ہوا اور چالیس سال کی عمر میں حضرت کی بعثت ہوئی ان پندرہ سالوں میں سات اولادیں زینب رقیہ ام کلثوم فاطمہ قاسم طیب اور عبداللہ پیدا ہوئے (بقول دیگر اہل سنت مورخین آٹھ یا نو یا گیارہ یا بارہ اولادیں) کیا یہ ممکن ہے کہ اتنی مدت میں اتنی اولادیں ایک ہی زوجہ جناب خدیجہ سے پیدا ہوں جن میں تین لڑکیاں جوان ہو کر قابل شادی بھی ہو جائیں شادی اور پھر طلاق پھر دوبارہ عقد (بقول یہ دوسرے عقد بعد بعثت رسول اللہ ہوئے) جیسے رقیہ رسول کی 33 سال کی عمر میں پیدا ہوئیں۔ ان کی عمر بوقت بعثت سات سال کی ہوئی۔ اسی سات سال کی عمر میں وہ بالغ ہوئیں اور عتبہ سے شادی بھی ہوئی طلاق بھی ہوئی اور حضرت عثمان سے دوسرا عقد بھی ہو گیا اور ان سے ایک سال چھوٹی ام کلثوم چھ سال کی عمر میں جوان بھی ہوئیں اور دو شادیاں بھی ہوئیں؟ یہی تضاد دوسری بیٹیوں کے سلسلے میں بھی ہے۔ منطق کی رو سے اتنی اولادوں کا تصور حلق کے نیچے نہیں اترتا۔ بہرحال ناصر الملت طاب ثراہ کی تحقیق کے مطابق رسول کی اکلوتی بیٹی جناب فاطمہ تھیں۔ زیادہ دلیلیں دینے سے مضمون کے بجائے کتاب بن جائے گی۔

اب جناب خدیجہ کا المناک دور شروع ہو گیا تھا وہ خاتون جو ملیکۃ العرب کہلاتی تھی اور جس کے پاس دولت کا انبار تھا اس نے اپنی ساری دولت تبلیغ اسلام اور مسلمانوں پر اس طرح لٹائی کہ خود اس کے یہاں فاقوں نے گھر بنا لیا۔ یہی نہیں

آپ مذہبی اور تاریخی مضامین قلم بند کرتے رہے اور ملک کے معتبر میگزینوں کے ذریعے اپنی بات عوام تک پہنچاتے رہے۔ ان کے مضامین کے متنوع عنوانات دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مختلف عنوانات پر لکھنے کے لئے آپ کو علم کے مختلف باب وا کرنے پڑتے ہوں گے۔

ملازمت کے دوران ہی آپ کا میلان تصنیف وتالیف کی جانب مڑا تو اس کے نتیجے میں سب سے پہلی کتاب ''حضرت محمدؐ پیشینگوئیوں کے آئینے میں'' اور دوسری کتاب ۱۹۹۷ء میں سفر حج وزیارت کے دوران ''حج وزیارات ۱۹۹۷ تجربات و مشاہدات'' عوام کی خدمت میں پیش کی جو بے حد مقبول ہوئی لیکن پہلی کتاب کرم خوردگی کی نذر ہو کر نایاب ہوگئی۔ اس کے علاوہ آپ نے ہندی میں ''رمضان کے اعمال'' اور ''مناجات'' بھی لکھیں۔

آپ نے جس عنوان پر بھی قلم اٹھایا ہے وہ سرسری نہیں ہے بلکہ اس میں تحقیقی پہلو مکمل طور سے نمایاں ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ احباب کے اصرار پر آپ نے ان مضامین کو اکٹھا کیا ہے اور انھیں کتابی شکل میں ''وادیٔ تحقیق'' کے نام سے پیش کر رہے ہیں۔ آپ کے اندر سب سے بڑی اور خوش کن خوبی یہ ہے کہ موجودہ دور کی مسلکی تعصّبانہ فضا میں بھی آپ کا قلم تکرار سے بچ کر تحقیق کی راہ پر گام زن رہتا ہے۔

آپ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حفظ الرحمن، مولانا مودودی صاحبان کی تحریری محفلوں میں بھی نظر آتے ہیں اور صرف نظر نہیں آتے بلکہ ان کی نظریاتی شمع سے کچھ روشنی بھی اخذ کرلیتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مصنف کوئی بھی ہو اس کا اپنا ایک نظریہ یا عقیدہ ہوتا ہے اور وہ عقیدہ اس کی تحریر میں یقیناً واضح ہوگا۔ یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ دنیا کے جتنے مصنفین ہیں ان سے اختلاف بھی کیا جاتا ہے اعتراض بھی، اور یہی اختلاف واعتراض سنجیدہ خوشہ چیں قارئین کے علم میں اضافہ کا باعث بنتا ہے۔

آپ نے اپنے ایک مضمون جس کا عنوان ''حضرت نوح اور ہندو قوم'' ہے

مشرکین مکہ نے جب دیکھا کہ رسول تبلیغ سے باز نہیں آرہے ہیں تو تمام قبیلوں نے رسول اللہ و جناب ابو طالب کے متعلقین کے خلاف سوشل بائیکاٹ کا عہد نامہ تیار کر کے کعبہ کی دیوار پر لگا دیا۔ نتیجہ یہ کہ جناب ابو طالب کو تمام لوگوں کے ساتھ شعب ابی طالب میں پناہ لینا پڑی۔ یہ بائیکاٹ تین سال تک جاری رہا جس کے نتیجے میں ان تمام لوگوں کی یہ حالت ہوئی کہ بھوک مٹانے کے لئے پیڑ کے پتے تک کھانے پڑے۔ ان بندشوں کی وجہ سے جناب ابو طالب اور جناب خدیجہ کی صحت بگڑ گئی اور جب بائیکاٹ ختم ہوا تو یہ دونوں حضرات دنیا سے سدھار گئے۔ ۱۰ بعد بعثت میں بنی ہاشم شعب ابو طالب سے باہر آئے اور ابھی اطمینان کی سانس بھی نہیں لے پائے تھے اور دو ماہ نہ گزرے تھے کہ جناب ابو طالب بیمار پڑ گئے اور انہوں نے رجب میں انتقال کیا۔ اس کے 35 دن بعد جناب خدیجہ کی حالت بگڑ گئی اور انھوں نے بھی رحلت کی۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ ہم دوسری امہات المومنین کو تو بہت یاد کرتے ہیں اور ان کا برابر ذکر کرتے ہیں مگر اسلام پر اپنا سب کچھ لٹانے والی اسلام کی اس محسنہ کو کوئی یاد بھی نہیں کرتا۔ اس سے زیادہ احسان فراموشی اور کیا ہوگی۔

عورت: اسلامی اور غیر اسلامی معاشرہ میں

آج کل اس بات پر بڑا زور دیا جا رہا ہے کہ عورتوں کو مکمل آزادی ملنی چاہیے اور اسلام پر الزام لگایا جاتا ہے کہ اسلام نے عورتوں کی آزادی چھین لی ہے۔

اس پر بحث کرنے کے لیے ہمیں تاریخ کے صفحات پلٹنے پڑیں گے۔ انسان کا سب سے پہلا دور پتھر دور (Stone age) کہلاتا ہے جب کپڑا ایجاد نہیں ہوا تھا اور عورت و مرد برہنہ حالت میں غاروں میں رہتے تھے۔ اس وقت عورت و مرد دونوں آزادرہ کر جدو جہد کرتے تھے اور پتھر کے اوزار بنا کر جانوروں کا شکار کر کے اپنی غذا کا انتظام کرتے تھے۔

پھر انسان نے کھیتی کا راز جانا اور پہاڑوں سے آ کر میدانی علاقوں میں رہنے لگا۔ یہاں سے عقل نے اپنا کام کرنا شروع کیا۔ حالانکہ یہ لوگ اب بھی برہنہ رہتے تھے مگر اب انھوں نے قبیلہ بنا کر رہنا شروع کیا۔ اس دور میں عورتوں کے حقوق مردوں سے بہت زیادہ تھے کیوں کہ اسی کی وجہ سے نسل بڑھتی تھی اور کام کرنے والے ہاتھ میسر ہو رہے تھے۔ اس زمانہ میں عورت گھر کی حکمراں تھی اور وراثت مرد کے بجائے عورت کی طرف سے چلتی تھی۔ ہندوستان میں آج بھی کئی علاقوں میں یہ دستور رائج ہے۔

زمانہ بدلا۔ مرد نے عورت کی فطری کمزوریوں کو جانا اور یہ محسوس کیا کہ محنت وہ زیادہ کرتا ہے لہذا حکمرانی اس کی ہونی چاہیے۔ بس یہیں سے عورتوں کے حقوق کی پامالی شروع ہوگئی۔ عورت جسمانی طور سے کمزور ہونے کی وجہ سے مرد کی محکومی کی

زنجیروں میں جکڑ دی گئی۔ حالات اتنے خراب ہوئے کہ عورت کو صرف استعمال کی شے سمجھا جانے لگا۔ ایک عورت کئی مردوں کی بیوی ہونے لگی۔ دور کیوں جایئے، اپنے ہندوستان میں مہابھارت کے زمانہ میں دروپدی کا بیاہ تو ارجن سے ہوا، لیکن پانچوں پانڈوں کے زیر استعمال تھی۔ آج بھی شمالی ہندوستان کے کچھ پہاڑی علاقوں میں ایک عورت کے کئی شوہر ہوتے ہیں۔ یہی نہیں، یہاں کے معاشرہ میں عورت اس قدر بے وقعت ہو گئی تھی کہ شوہر کے مرنے کے بعد بیوہ کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہ تھا۔ وہ شوہر کی چتا پر زندہ جلادی جاتی تھی جسے ''ستی'' ہونا کہا جاتا ہے۔ اسی مہابھارت کے زمانہ میں اُمبا نامی عورت کو مجبور کیا گیا کہ وہ دُرواسا (दुर्वासा) جیسے بدشکل اور خراب صورت رشی کے ساتھ ہم بستری کرے۔ یہ امبا کی انسانی فطرت تھی کہ وہ اتنے بھیانک چہرے کو دیکھ کر ڈر کے مارے پیلی پڑ گئی اور دُرواسا رشی سے اس کے یہاں پانڈو (ارجن وغیرہ کے باپ) نام کے بیٹے پیلیا کا مرض لیے پیدا ہوئے۔ اس کے علاوہ جنوبی ہندوستان میں لوگ اپنی بیٹیوں کو مندر کی خدمت میں بھیج دیتے تھے، یہ دیوداسی کہلاتی تھیں اور مندر کے پجاری ان سے تسکین حاصل کرتے تھے۔ دیوداسیاں ابھی بھی ہیں۔ سمیریا اور بابل میں بھی دیوداسی سسٹم تھا۔

یہ تو تھی ہندوستان اور عراق کے قدیم معاشرے میں عورت کی حالت۔ اب مغرب کے قدیم معاشرے کا بیان کرنے سے پہلے قدیم مصر کی بات بھی کرتے چلیں۔ مصر میں جانوروں کو خدا کا اوتار سمجھا جاتا تھا یعنی سانڈ، مینڈھا، بکرا، کتا اور سانپ سب خدا کا اوتار تھے، خصوصاً سانڈ اور بکرا اوسائرس (Osiris) دیوتا کا اوتار سمجھے جاتے تھے۔ ان خداؤں کو خوش رکھنے کے لیے مصری عورتوں کو مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ ان کے پاس جا کر انھیں سکون پہنچائیں وہ اتنے سدھ گئے تھے کہ ان عورتوں کو دیکھتے ہی اپنی حیوانیت دکھاتے تھے (فلسفۂ اسلام حصہ اول صفحہ ۶۵ مؤلف آغا سلطان مرزا)

اب آیئے مغرب کے یونان میں۔ مولانا مودودی نے اپنی کتاب ''پردہ'' میں لکھا ہے کہ گرچہ یونان کو اپنی تہذیب پر بڑا ناز رہا ہے لیکن یہاں بھی عورتوں کو ذلیل کیا گیا۔ عورتوں کو پہلے مندر میں دیوداسی بنایا گیا پھر وہ قحبہ خانہ کی زینت بنیں۔

روم میں تو اور بھی حالت خراب تھی، وہاں مرد اور عورت کے غیر نکاحی تعلق کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ فلورا نامی ایک کھیل ایجاد کیا گیا جس میں برہنہ عورتوں کی دوڑ کرائی جاتی تھی۔ عورت کے پاس آدھا اونس سے زیادہ سونا نہیں ہو سکتا تھا (پردہ صفحہ ۱۱)

جب مغرب میں عیسائیت کا دور دورہ ہوا تو یہ امید ہوئی کہ اہل کتاب کم از کم عورت کا احترام کریں گے اور اس کا حق اس کو دیں گے کیوں کہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد ان کے یہاں ایک عورت یعنی حضرت مریم ہی سب سے مقدس ہستی تھیں لیکن یہاں معاملہ الٹا ہو گیا۔ عیسائیوں نے حضرت آدمؑ کے واقعہ کو جان کر کہ ایک عورت کی وجہ سے حضرت آدمؑ جنت سے نکالے گئے، پوری عورت ذات سے نفرت شروع کر دی۔ وہ عورتوں کو صرف اس لیے اپناتے تھے کہ وہ ان سے جنسی خوشی حاصل کریں ورنہ انھیں نارمل زندگی میں شامل ہونے سے روکا جاتا تھا۔ ان پر گوشت کھانے کی پابندی تھی۔۔ عیسائیت میں عورتوں کے حقوق کو اس طرح پامال کیا گیا تھا کہ وہ زبان بھی نہیں کھول سکتی تھیں۔ برطانوی فلسفی ہربرٹ اسپنسر (Herbert Spencer) نے لکھا ہے کہ گیارھویں صدی عیسوی میں برطانیہ میں زوجہ بیچی جاتی تھی اور یہ قانون پاس ہوا تھا کہ شوہر کو اپنی زوجہ کو دوسروں کو منتقل کرنے یا کسی دوسرے کو ایک محدود مدت تک ادھار پر دینے کا اختیار تھا۔

یہ تو تھی عیسائیت میں عورت کی حالت۔ اب ذرا اسلام سے قبل عرب معاشرہ میں بھی عورت کو دیکھ لیا جائے۔ عرب کے لوگ عورتوں کو بھی مال سمجھتے تھے۔ یہ اپنے سے کمزور قبیلوں پر حملہ کر کے عوتوں کو لوٹ کے مال کے طور پر لے آتے

تھے۔عورت جوایک انسان بھی ہے اس کی عرب میں ایسی تذلیل دیکھ کر روح چیخ اٹھتی ہے۔دوسروں کی عورتوں کولوٹ کر لانے والے اپنے یہاں بیٹی کا پیدا ہونا برداشت نہیں کر پاتے تھے۔اگر کسی کے یہاں بیٹی پیدا ہو جاتی تھی تو وہ شرمندگی کے مارے منہ چھپاتا تھا اور اسی شرمندگی کو مٹانے کے لیے عرب خود اپنی بیٹی کو زمین میں زندہ گاڑ دیتے تھے۔قرآن نے اس کا خوب نقشہ کھینچا ہے:

''جب ان میں سے کسی ایک کولڑکی پیدا ہونے کی خبر دی جاتی تھی تو ان کا چہرہ سیاہ ہو جاتا تھا اور وہ غضب ناک ہو جاتا تھا۔وہ (بیٹی ہونے کی) شرمندگی سے جس کی خبر اس کو دی گئی تھی، اپنی قوم کے لوگوں سے چھپا پھرتا تھا (اور سوچتا تھا) کہ آیا اس (بیٹی) کو ذلت اٹھا کر زندہ رہنے دے یا (زندہ ہی) اس کو زمین میں گاڑ دے۔یقیناً یہ لوگ برا حکم لگاتے تھے'' (سورہ نحل آیت ۵۸۔۵۹) اور اسی لیے سورۂ تکویر میں انسانی ضمیر کو جگانے کے لیے اللہ نے نفسیات سے کام لیا ہے:۔

''اور جس وقت زندہ درگور لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ (وہ) کس گناہ کے بدلے میں ماری گئی'' (آیت ۸/اور/۹)

اسلام سے قبل عورتوں کے لیے عرب معاشرے کی جو تصویر تاریخ نے کھینچی ہے وہ اس طرح ہے:

> عرب میں بچیوں کو دفن کرنے کے مختلف خوف ناک طریقے اپنائے جاتے تھے۔بچی زندہ دفن کر دی جاتی تھی۔زندہ درگور کرنے کا بھی الگ الگ رواج تھا۔ایک طریقہ یہ تھا کہ ماں زچگی کے وقت ایک گڑھے پر بیٹھ جاتی تھی۔اگر پیدا ہونے والا لڑکا ہے تو اسے گھر لے آتی تھی لیکن اگر پیدا ہونے والی لڑکی ہوتی تھی تو اسے اسی گڑھے میں ڈال دیا جاتا تھا۔دوسرا طریقہ یہ تھا کہ اگر کسی کے یہاں لڑکی پیدا ہوتی تھی تو وہ

اسے چھ سال تک زندہ رکھتا تھا۔ پھر باپ یہ بہانہ کر کے کہ اسے
اپنے ایک رشتے دار کے یہاں لے جانا ہے۔ اس کا بناؤ سنگھار
کرتا تھا۔ ریگستان میں اس لڑکی کے لیے ایک کنواں پہلے ہی
سے تیار ہو جاتا تھا۔ کنویں کے نزدیک پہنچنے پر باپ اس سے
کنویں میں جھانکنے کو کہتا تھا۔ جیسے ہی وہ جھانکنے کے لیے جھکتی تھی
اسے باپ دھکا دے دیتا تھا اور اس کنویں کو ریت اور مٹی سے
بھر دیتا تھا۔

اس بات کا ثبوت اس روایت سے ملتا ہے کہ قیس بن عاصم التمیمی نامی ایک شخص رسول اللہ کے پاس حاضر ہوا اور قبول کیا کہ میں نے دور جاہلیت میں اپنی آٹھوں بیٹیوں کو زندہ دفن دیا تھا۔ (مجمع البیان شیخ طبرسی جلد ۵ صفحہ ۴۴۲)

اگر کوئی باپ ذرا سا رحم دل ہوتا تھا تو وہ اپنی بیٹی کو ذلیل کر کے رکھتا تھا اور جب وہ ایسی عمر کو پہنچتی تھی کہ وہ چرواہے کا کام کر سکے تو اسے اونی کپڑے پہنا کر اونٹ چرانے کے لیے ریگستان میں بھیج دیا جاتا تھا۔ اگر کسی نے اپنی اس لڑکی کی شادی بھی کی تو اگر اس کا شوہر مر گیا باپ یا جو بھی ولی اس وقت ہوا، وہ آ کر اسے ایک مخصوص لباس پہناتا تھا جس کے معنی تھے کہ اسے ولی کی مرضی کے بغیر دوسری شادی کا اختیار نہیں۔ اگر اس کا ولی دوسری شادی اس کی کرنی ہی نہیں چاہتا تھا تو اسے قید تنہائی میں رکھا جاتا تھا جب تک کہ وہ مر نہ جائے۔ اگر وہ اس حالت سے بچنا چاہتی تھی تو اسے خود کو آزاد کرانے کے لیے کچھ معاوضہ دینا پڑتا تھا۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ہر عمل کا ردعمل ہوتا ہے۔ عورتوں کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ جب ان کا استحصال اپنی معراج پر پہنچ گیا اور ان کی برداشت کی حد ختم ہوگئی تو آزادیٔ نسواں کی تحریک شروع ہوئی۔ مغرب کے مکار مردوں نے عورتوں کی اس تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ انھوں نے عورت کی آزادی کا مطلب جنسی آزادی بتایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب میں عورت اپنی تحریک کے

مقصد سے بھٹک گئی اور وہی سمجھا جو مردوں نے سمجھایا۔ پھر جو ہونا تھا وہی ہوا۔ عورت بے لگام ہوگئی۔ عصمت نام کی کوئی شے اس کی ڈکشنری میں نہیں رہ گئی۔ زنا صرف اسے کہا گیا جب مرد اس کی مرضی کے بغیر اس سے زبردستی تعلقات قائم کرے۔ اس طرح کی آزادی کے لیے مخلوط تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ عورت نے اپنے جسمانی اعضاء پر ناز کرتے ہوئے اسے مردوں کو دکھانے کے لیے بدن پر کپڑوں کی کمی کا سلسلہ شروع کیا۔ اس سے سب کچھ تو ہوا لیکن وہ نسوانیت جو قدرت کی دین تھی اور جس کا ایک جزو شرم و حیا کہلاتا ہے وہ عنصر غائب ہوگیا۔ لڑکی پر باپ کا اختیار ختم ہوگیا۔ کورٹ شپ کا طریقہ ایجاد کیا گیا تاکہ دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ اس کا مزید جدید طریقہ۔ (Live-in-relationship) کے نام سے شروع کیا گیا جس میں لڑکی لڑکا دن بھر اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں لیکن رات کو بغیر شادی کے ایک ہی بستر پر سوتے ہیں اور اپنی جنسی پیاس بجھاتے ہیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب میں غیر شادی شدہ ماؤں کی تعداد تشویش ناک حد تک بڑھ گئی۔ یہ حال برطانیہ وغیرہ کا تھا۔ امریکہ میں امریکن ایسوسی ایشن فور فیملی سروسز (American association for family services) کی ایک رپورٹ کچھ سالوں پہلے آئی تھی جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ تقریباً ایک لاکھ لوگ یا الگ ہوجاتے ہیں یا اگر شادی کر چکے ہیں تو طلاق لے لیتے ہیں۔ ہر سال چار لاکھ ناجائز بچوں کا اندراج ہوتا ہے۔ اب یہ حالات اس سے بھی بدتر ہو چکے ہوں گے۔ یہی حال کم و بیش تمام یورپین ممالک کا ہے۔ سویڈن نے تو چرچ سے بغاوت کر کے شادی کے سسٹم (System) کو ہی ختم کر دیا ہے۔ ایشیائی ممالک میں روس، چین اور جاپان بھی اس بیماری سے متاثر ہوئے ہیں۔ نتیجتاً ایڈس (Aids) نے الگ سر اٹھا رکھا ہے۔

یہ تو تھا غیر مسلم معاشرہ کا حال۔ اب اسلامی معاشرہ میں عورت کی حیثیت

دیکھیں۔اسلام نے خود آزادیٔ نسواں کی تحریک چلائی۔پھر عورت کی اہمیت بتانے کے لیے قرآن نے اسے آیات الٰہی میں شمار کیا۔اللہ کا فرمان یہ ہے کہ۔

''اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے تمہارا جوڑا تمہیں میں سے پیدا کیا تا کہ تمھیں اس سے سکون حاصل ہو سکے اور تمہارے درمیان مؤدّت (معرفت کے ساتھ محبت) پیدا کی تا کہ وہ (تمھارے لیے) رحمت قرار پائے ۔اس میں صاحبان فکر کے لیے بہت سی نشانیاں پائی جاتی ہیں'' (سورۂ روم آیت ۲۰)۔یہی نہیں یہ بھی کہا کہ:

''عورتیں تمہارے لیے لباس ہیں اور تم عورتوں کے لیے لباس ہو'' (سورۂ بقرہ آیت ۱۸۷) انسانو! اس پروردگار کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تم سب کو (یعنی عورت مرد دونوں کو) ایک نفس سے پیدا کیا اور اس کا جوڑا بھی اسی کے جنس سے پیدا کیا اور پھر دونوں سے کثیر مرد و عورت دنیا میں پھیلائے'' (سورۃ نساء آیت ۱) یعنی انسانوں کو ابتدا میں ایک اصل سے ہونے کا دھیان دلایا گیا تا کہ مرد کو عورت پر برتری کا جذبہ ختم ہو جائے۔

اسلام نے اس بات کا اعلان کر دیا کہ کوئی مرد ہونے کی بنیاد پر محترم نہیں ہو جائے گا بلکہ عورت اور مرد دونوں برابر ہیں اور دونوں کو ان کے صالح اعمال، اللہ پر ایمان اور نیک چلنی پر جزا یا فیصلہ کیا جائے گا۔قرآن کی یہ صاف آیت کسی تفسیر کی محتاج نہیں:

''مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور مومن مرد اور مومن عورتیں اور قناعت کرنے والے مرد اور قناعت کرنے والی عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور صابر مرد اور صابرہ عورتیں اور انکسار کرنے والے مرد اور انکسار کرنے والی عورتیں اور صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنیوالے مرد اور عورتیں اور اللہ کا بکثرت ذکر

کرنے والے مرد اور عورتیں، اللہ نے بے شک ان سب کے لیے مغفرت اور اجر عظیم رکھا ہے'' (سورۂ احزاب آیت ۳۵)

دیکھا آپ نے اللہ نے یہاں مرد و عورت میں کوئی تفریق نہیں کی ہے، حد یہ ہے کہ اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کی ذمہ داری مردوں کی بھی اتنی ہی ہے جتنی عورتوں کی ہے۔ یہ نہیں چلے گا کہ عورتیں تو اپنے شوہروں کے لیے اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور مرد ادھر ادھر منہ مار کر امانت میں خیانت کریں۔

ہاں ایک بات جو یورپی معاشرہ بھلا بیٹھا، اس پر اسلام نے بھر پور توجہ دی ہے یعنی عصمت۔ اسلام نے اس بات پر پورا زور دیا کہ یہ عصمت ہی وہ جوہر ہے جس کی بنیاد پر عورت معاشرہ میں سر اٹھا کر چلتی ہے۔ لہٰذا عورت کے لیے اسلام نے لازمی قرار دیا کہ وہ اپنی ساری کوششیں کام میں لا کر اپنی عصمت کی حفاظت کرے۔

اسلام میں تمام باتوں میں آزادیٔ نسواں کا دھیان رکھا گیا۔ عورت کی زندگی میں تین دور ہوتے ہیں (۱) بچپن و بلوغ کے وقت تک بیٹی (۲) شادی کے بعد بیوی اور (۳) ماں۔ اسلام نے شادی سے پہلے تک عورت کو بیٹی کی حیثیت سے وہ سارے حقوق دیے جو بیٹے کو حاصل ہوتے ہیں، ہاں! وراثت کے معاملہ میں بیٹی کو بیٹے کا آدھا ترکہ ملتا ہے، شاید یہ اس وجہ سے ہو کہ بیٹی کو بیوی کی حیثیت سے بھی ورثہ ملتا ہے۔ بیٹی کی شادی کے معاملہ میں باپ کو اس لیے ولی بنایا کہ چونکہ وہ اپنی کافی عمر گزار چکا ہے اس لیے اسے تجربہ زیادہ ہے اور بیٹی کو گھر میں رہنے کی وجہ سے آئندہ زندگی میں ہونے والے شوہر کے بارے میں کوئی علم نہیں۔ لیکن ولی پر یہ ذمے داری رکھی کہ شوہر کا انتخاب کرنے میں بیٹی کی مرضی کو دھیان میں رکھتے ہوئے زندگی کے اپنے تجربہ کو کام میں لائے تاکہ بیٹی ناتجربہ کار ہونے کی وجہ سے اپنا مستقبل نہ برباد کرلے۔

شوہر کسی عورت کو اپنی زوجہ تبھی بنا سکتا ہے جب اس کی مرضی شامل ہو۔ اسی

لیے ایجاب وقبول کا طریقہ اختیار کیا گیا۔اس کے ساتھ ہی عورت کو اس کی مرضی کا مہر رکھنے اور اسے پانے کا حق دار رکھا گیا۔کوئی بھی مرد اس سے بری نہیں ہے۔یہ ہمارے غلط رسم ورواج ہیں کہ عورت شادی کے وقت مہر کے لیے اصرار نہیں کرتی اور نکاح پڑھانے والوں نے عند الطلب لفظ بڑھا کر اپنی ذمے داری پوری کر دی ہے اور عورت کو اس کے جائز حق سے محروم کر دیا ہے۔علماء اگر اس پر اڑ جائیں تو یہ بیماری ختم ہو سکتی ہے۔بہر حال عورت شادی کے بعد بحیثیت زوجہ ایک فیملی کی حاکم ہو جاتی ہے۔گھر چلانے کی ذمے داری اس کے کاندھوں پر زیادہ تر آجاتی ہے۔اگر مرد کو طلاق دینے کا حق ہے تو بیوی کو خلع کا حق اسلام نے دیا ہے۔

عورت بیوی کے فرائض پورے کرنے کے بعد ماں بنتی ہے۔چونکہ ہونے والی ماں بچے کے حمل میں رہنے کے دوران بڑی مصیبتیں اٹھاتی ہے۔یہ نو مہینے پیٹ میں بچے کا بوجھ اٹھاتی ہے، ولادت کے بعد نسوانی مصیبتوں کے علاوہ بچے کی پرورش میں بہت تکلیفیں اٹھاتی ہے، اپنے سارے آرام کو بچے کے لیے وقف کر دیتی ہے اور جب وہ تھوڑا بڑا ہوتا ہے تو اس کی تربیت میں اپنا وقت صرف کرتی ہے اس لیے اسلام نے ماں کا بہت بڑا درجہ رکھا ہے اور اولاد کے لیے ماں کے قدموں میں جنت رکھی ہے۔

میں اپنی بات اس خلاصہ پر ختم کر رہا ہوں کہ جہاں غیر مسلم معاشرہ نے آزادئ نسواں کی تحریک کا رخ موڑ کر عورت کو بازار میں کھڑا کر دیا ہے وہیں اسلامی معاشرہ میں عصمت کی حفاظت اور حیا کی برقراری کی شرط کے ساتھ عورت کو مکمل آزادی دی گئی۔یعنی اسلام خود کچھ پابندیوں کے ساتھ آزادئ نسواں کی تحریک کا حامی بن گیا۔

اس میں ہندو دھرم کی قدیم کتاب ''وید'' کے حوالے سے وحدت پرستی کی تعلیم اور بت پرستی سے انکار کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اس میں آپ نے کلومنالی کے ایک مندر کا چشم دید واقعہ لکھا ہے، جس میں بتایا ہے کہ وہاں ''منو'' کے نام کا ایک مندر ہے، مندر کے باہر ایک بورڈ لگا ہے جس پر اس جگہ کی وجہ تسمیہ لکھی ہے کہ ان کے زمانے میں بہت بڑا سیلاب آیا تھا ساری دنیا تہہ آب ہو گئی تھی منو ثانی نے ایک کشتی بنائی تھی اس پر سارے جانداروں کے جوڑے رکھے تھے، وہ کشتی یہیں آکر ٹھہری تھی'' غور طلب یہ ہے کہ حضرت نوح کے واقعہ اور اس میں کتنی مماثلت ہے۔ جس طرح آدم سے آدمی ہوا اسی طرح منو سے منشیہ ہوا۔

مصنف کو اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ جیسے قرآن کے علاوہ اللہ کی ساری کتابوں میں تحریف ہوئی ہے اس میں بھی ہوئی ہوگی۔

آپ کا ایک مضمون بہ عنوان ''وید اور قرآن مجید'' پڑھ کر چار مصرعے ذہن میں آگئے جسے پیش کر کے میں اپنی بات ختم کرتا ہوں۔ اللہ تعالی مصنف کو زیادہ سے زیادہ لکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

رسول پاک کے بارے میں کچھ کہا ہوگا
خلیق، نیک، سخی سب کا رہنما ہوگا
ملے گا تم کو مقدس قدیم نسخوں میں
پڑھو تمہاری کتابوں میں بھی لکھا ہوگا

شاد عباسی
ایڈیٹر سہ ماہی ارتقا
مدن پورہ، وارانسی
MOB.9264929530

نماز کیا صرف عبادت الٰہی ہے؟

ویسے تو قرآن مجید کی ایک آیت صاف طور پر اعلان کر رہی ہے کہ اللہ نے جنوں اور انسانوں کو صرف عبادت کے لیے پیدا کیا ہے لیکن کیا عبادت کا مقصد صرف اللہ اللہ کرتے رہنا ہے؟ اگر ایسا تھا تو یہ کام تو اللہ فرشتوں سے پہلے ہی کروا رہا تھا۔ حدیث کے مطابق تو کچھ فرشتے قیام کی حالت میں ہیں کچھ رکوع کی حالت میں اور کچھ سجدے کی حالت میں اللہ کی عبادت کر رہے ہیں پھر عبادت کا کون سا پہلو ہے جسے فرشتے انجام نہیں دے رہے تھے جس کی وجہ سے اللہ کو جنوں اور انسانوں کو خلق کرنا پڑا۔

اسلامی تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ سچ ابھر کر سامنے آئے گا کہ علمائے اسلام نے بھی اسلام کے اسی پہلو پر زیادہ زور دیا جو فرشتے پہلے سے کر رہے تھے۔ سواد اعظم نے فروع دین کے تحت پہلے نماز پھر روزہ پھر حج پھر زکوۃ اور پھر جہاد کو رکھا۔ وہیں شیعہ علماء نے عبادت کے مفہوم کو وسیع کرتے ہوئے فروع دین کے تحت ۱۔ نماز، ۲۔ روزہ، ۳۔ حج، ۴۔ زکوۃ، ۵۔ خمس، ۶۔ جہاد، ۷۔ امر بالمعروف، 8۔ نہی عن المنکر، ۹۔ تولاّ اور ۱۰۔ تبرّا کو رکھا۔ اس وسعت نے بہر حال یہ گنجائش نکالی کہ صرف نماز، روزہ اور حج ہی عبادت الٰہی نہیں ہیں۔ پھر بھی زور انہیں تین اعمال پر دیا گیا۔ اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان تین عبادتوں کو اہم اور اصل عبادت سمجھا گیا۔

میں یہاں کسی اختلاف میں پڑے بغیر یہ گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ کیا

اللہ ہماری ان عبادتوں کا محتاج تھا جو اس نے ہمیں پیدا کیا؟ یہ بات فرشتوں کی عبادت کو دیکھ کر دل کو نہیں لگتی۔ میرے ناقص ذہن کے مطابق اللہ نے یہ ساری عبادات اپنے لئے نہیں بلکہ اس مخلوق جسے انسان کہا جاتا ہے، کی فلاح کے لئے اور پورے انسانی سماج کی بھلائی کے لئے رکھیں۔ آپ روزہ کے فوائد انسانی جسم کی بہتری کیلیے ڈاکٹروں سے برابر سنتے رہتے ہیں۔ اسی طرح مسجد میں نماز جماعت سے لے کر حج تک کے اجتماع کی اہمیت آپ کو معلوم ہے۔ اگر زکوۃ صحیح طریقے سے دی جائے تو غریبی کا رونا نہ رونا پڑے۔ خمس سادات کی فلاح کے لئے ہے۔ اگر واقعی امر بالمعروف نہی عن المنکر تولاّ، تبرّا پر ایمانداری سے عمل کیا جاتا تو انسانی سماج غلط لوگوں کی بالادستی سے محفوظ رہتا۔

چونکہ میرا موضوع نماز ہے اس لئے میں اپنے ذہن کے مطابق یہ کہنا چاہتا ہوں کہ نماز بھی اللہ نے صرف اپنی عبادت کے لئے نہیں رکھی ورنہ ایک ہی جگہ چپ چاپ بیٹھ کر مراقبہ کی حالت میں بھی اللہ کو مسلسل یاد کیا جا سکتا تھا۔ اللہ کو نماز کا یہ طریقہ رکھنے کی کیا ضرورت تھی کہ پہلے قیام کرے، پھر رکوع میں جائے، پھر سجدے میں جائے اور پھر ایک جگہ بیٹھ کر نماز کو تمام کرے۔ قیام کی حالت میں بھی پیروں کی پوزیشن طے اور آنکھیں کہاں دیکھیں، رکوع کی حالت میں نگاہیں کہاں رہیں اور سجدہ کی حالت میں پورا جسم پیر کے دونوں انگوٹھوں اور ہتھیلیوں کے سہارے رکھنے کے بعد پیشانی رکھ کر سجدہ کرے۔ آخر یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی ماننا پڑے گا کہ اللہ کے ہر حکم میں کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہے اور وہ انسان کی بھلائی کے لئے ہے۔

یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ بدھسٹ (Buddhist) مذہب ہم سے الگ ہے اور وہ اپنی زبان عبادت کے لئے استعمال کرتے ہیں لیکن ان کی عبادت کا طریقہ بھی تقریباً وہی ہے جیسا نماز کا طریقہ ہے۔

گود کے بولتے بچے

تمام مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت علیؑ کی ولادت خانۂ کعبہ میں ہوئی تھی اور اس بات پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ آپ کی والدہ جناب فاطمہ بنت اسد خانۂ کعبہ میں دروازے کے راستے داخل نہیں ہوئی تھیں، یہاں کچھ سوالات ذہن میں پیدا ہوتے ہیں

(۱) حضرت علیؑ جناب فاطمہ بنت اسد کے پہلے بچے نہیں تھے۔ اس سے پہلے کے تمام بچے جناب ابو طالب کے گھر میں پیدا ہوئے تھے تو پھر ایسا کیا ہوا کہ جناب فاطمہ بنت اسد علیؑ کی ولادت کے لیے گھر چھوڑ کر خانۂ کعبہ کی طرف آئیں۔

(۲) جب کعبہ تک پہنچیں تو کعبہ کو مقفل پایا۔ ایسی حالت میں آپ کو رِسک نہ لے کر واپس آجانا چاہیے تھا لیکن اس کے بجائے آپ کعبہ کی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئیں اور پھر یکایک کعبہ کی دیوار شق ہوئی۔

(۳) دیوار شق ہونے پر جناب فاطمہ بنت اسد کو انسانی فطرت کے مطابق ڈر کر دیوار سے دور ہو جانا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ آپ اطمینان سے کعبہ میں داخل ہو گئیں اور کعبہ کے اندر حضرت علیؑ کی ولادت ہوئی۔ آپ نے دیوار کو دوبارہ جڑتے دیکھا لیکن آپ کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آپ تین دن وہاں رہیں۔

(۴) سردار مکہ (جناب ابو طالب) کی زوجہ تین دن تک گھر سے غائب ہے جب کہ اس کے یہاں ولادت ہونے والی ہے اور سردار مکہ کو کوئی بے چینی نہیں ہے بلکہ وہ خود تین دنوں بعد کعبہ کے پاس پہنچ رہا ہے۔

میں یوگی آنکھ بند کرنے کے بعد دونوں ہاتھوں کو سینے تک لے جاتا ہے پھر چھوڑ دیتا ہے۔ یہاں بھی ریڑھ کی ہڈی اور خون کے دوران کو فائدہ پہنچاتا ہے اسے 'ہر دے چکر' کہتے ہیں۔

۲۔ قیام

نماز میں تکبیرۃ الاحرام کے بعد قیام کی حالت میں رکعت شروع ہو جاتی ہے۔ اس میں نمازی کو یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم اللہ کے سامنے کھڑے ہیں اور اسی کے بندے ہیں۔ اس کو دنیا میں اپنی اوقات کی آگاہی ہوتی ہے۔ قیام کا یہ عمل اس کے جسم کے پورے عضو جلد، آنت، جگر، پِتّہ، اور آنکھ کی صحت پر اثر ڈالتا ہے۔ اور جیسے ہی نمازی قنوت کے لیے اپنے ہاتھوں کو اوپر لے جاتا ہے 'ہردے چکر' (Heart Chakra) اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ اور جیسا کہ کہا گیا ہے کہ یہ کسی محبت سکون اور امن کے احساس کا مرکز ہے جو دل، پھیپھڑوں، گردن کی جڑ کے غدود بیماری سے لڑنے کی قوت اور خون کی گردش میں مدد کرتا ہے۔

اس کے علاوہ قیام میں انسان کو خود کو اللہ کے سپرد کر دینا چاہیے۔ سارے خیالات چھوڑ کر اللہ کا ہی دھیان رکھنا چاہیے۔ یہ مراقبہ کی حالت کہلاتی ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں تاریخ اسلام میں ملتا ہے کہ جنگ میں حضرت علیؑ کے جسم میں ایک تیر پیوست ہو گیا تھا اور تکلیف کے مارے آپ کسی کو وہ تیر نکالنے نہیں دے رہے تھے اس پر رسول اسلام نے صلاح دی تھی کہ جب علیؑ نماز میں مشغول ہوں تو یہ تیر نکال لو۔ یہی ہوا قیام کی حالت میں آپ کے جسم سے تیر نکال لیا گیا اور آپ کو احساس بھی نہ ہوا۔

یوگا میں اسے دھیان کہتے ہیں۔ ان کے مطابق اس حالت میں دماغ ایک دم صاف پر سکون اور اندر کی طرف بھی دھیان مرکوز رہتا ہے۔ جب کوئی دھیان کرتا ہے تو وہ جاگ تو رہا ہوتا ہے لیکن اس کا دماغ باہری دنیا کو بھلا دیتا ہے

اور اپنے آس پاس کی حالت بھی اس کے دھیان میں نہیں رہتی۔ دھیان سے ذہنی پریشانی دور ہوجاتی ہے جس سے اچھی نیند آتی ہے اور مزاج بحال ہوجاتا ہے۔ دھیان کی یہ حالت عموماً بیٹھ کر ہوتی ہے۔

۳۔ رکوع

ایک رکعت کے ختم ہونے پر نمازی آدھا جھکتا ہے جسے رکوع کہتے ہیں۔ اس حالت میں اس کی آنکھیں دونوں پیروں کے پنجوں کے بیچ میں دیکھتی ہیں۔ یہ جتنا اللہ کی تعظیم اور اللہ کے لئے ہوتا ہے اتنا ہی یہ انسان کے غرور کو ختم کرنے کے لئے ہے۔ رکوع سے تب ہی اٹھتا ہے جب جسم آرام دہ پوزیشن میں ہوجائے۔

یوگا میں بھی آدھا جھکنے یا رکوع کا عمل ہے۔ اسے یوگا میں 'اردھ اُتتان آسن' کہتے ہیں۔ یہ عمل سانس اور جسم کے ہلنے ڈلنے کے بیچ ایک رابطہ پیدا کرتا ہے جو دماغ کو سکون پہنچاتا ہے۔

رکوع اور اردھ اُتتان آسن دونوں پیٹ اور ریڑھ کی ہڈی کو مضبوطی دیتے ہیں جو جسم کے نظام میں سدھار لاتے ہیں۔

جسم کے نچلے حصے کے پوری طرح جھکنے سے پیٹ کے درد میں کمی آتی ہے یہ پوزیشن معدہ پر بھی دباؤ ڈالتی ہے جو قبض اور پیٹ کی دوسری بیماریوں میں فائدہ پہنچاتی ہے۔ یہ معدہ اور پیٹ کے اعضا کو بھی درست کرتی ہے۔

۴۔ سجدہ

نماز کا سب سے اہم حصہ سجدہ ہے۔ اس میں پیشانی زمین کو چھوتی ہے۔ اس پوزیشن میں انسان اپنی اصل اوقات کو پہچانتا ہے اور خود کو اللہ کے بہت قریب پاتا ہے۔ یہ دعا مانگنے کا بہترین وقت ہوتا ہے۔ جہاں تک جسمانی

فائدے کا تعلق ہے اس پوزیشن میں خون کا دوران انسان کے دماغ تک آسانی سے پہنچتا ہے۔

یوگا میں سجدہ کی پوزیشن کو بال آسن (Balasana) کہتے ہیں۔ سجدہ یا بال آسن توند میں چربی جمع ہونے سے روکتا ہے۔ زمین پر پیشانی، گھٹنے، پیر کے انگوٹھے اور ہتھیلی یہ سب زمین پر ہوتے ہیں جس سے معدہ کے عضو پر دباؤ پڑتا ہے اور ان میں مضبوطی آتی ہے۔ یوگا والے بھی اسے روز کرتے ہیں۔ یہ پیٹ کے نچلے حصے کے درد اور تناؤ کو دور کرنے میں مدد کرتا ہے۔ ساتھ ہی کندھوں اور سینہ کو بھی آرام پہنچاتا ہے۔ یوگا کے مطابق یہ آسن ایک آدمی کے کائنات سے روحانی رابطے کو بڑھاتا ہے اس سے دماغ اور اس کے حس والے حصے کو صحت ملتی ہے۔ یہ عمل انسان کی اندرونی اور بھاری طاقت میں توازن پیدا کرتا ہے۔

۵۔ قعود (جلوس)

تشہد اور سلام کے لیے بیٹھنے کو قعود کہتے ہیں۔ مسلمان نمازی تین رکعتی اور چار رکعتی نماز میں دو رکعت کے بعد بیٹھ کر صرف تشہد پڑھتا ہے جس میں پہلے اللہ کی وحدانیت اور محمدؐ کی ابدیت اور رسالت کی گواہی دے کر قیام کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ لیکن دو رکعتی اور چار رکعتی نماز میں آخری رکعت میں قعود کی حالت میں پہلے تشہد اور پھر سلام پڑھ کر نماز کو تمام کیا جاتا ہے۔ قعود کے حالت میں نمازی دونوں پیر، جانگھیں، گھٹنے اور انگوٹھوں کے بل بیٹھتا ہے۔ یہ پوزیشن جوڑوں کے درد کو کم کرنے میں مدد کرتی ہے اور پیٹ کے اندر جمع کھانے کو نیچے کی طرف لا کر ہاضمہ میں مدد کرتی ہے۔

یوگا میں بھی بالکل اسی پوزیشن میں بیٹھا جاتا ہے اسے ورج آسن (Varj Asana) کہتے ہیں۔ آپ کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ قعود

اور ورج آسن میں بیٹھنے میں کوئی فرق نہیں ہے اور اگر آپ پیچھے سے دیکھیں گے تو یہ تفریق نہیں کر پائیں گے کہ یہ قعود والا ہے یا ورج آسن والا۔اس آسن سے قبض دور ہوتا ہے پیٹ کی خرابیاں دور کرنے میں مدد ملتی ہے اور دوران خون بہتر ہوتا ہے اس پوزیشن سے دماغ کو سکون ملتا ہے جسم کا تناؤ دور ہوتا ہے اس کے علاوہ یہ کولہوں پنڈلیوں اور رانوں کو بھی درست رکھنے میں مدد کرتا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ اسلام نے جس وقت نماز کو واجب کیا اس وقت عرب میں یوگا کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا۔لیکن خالق یوگا نے نماز میں ہر پوزیشن میں ان تمام عمل کو شامل کر دیا جو انسان کے بھلے کے لئے تھا اور آج یوگا اس کی تصدیق کر رہا ہے۔

پس یہ ثابت ہو گیا کہ اللہ نے نماز کو صرف اپنی عبادت کے لئے واجب نہیں کیا بلکہ نماز کے ہر پوزیشن میں اس عمل کو شامل کیا جو انسان کے بھلے کے لئے تھا اس لئے ساری تعریفیں بس اللہ کے لئے ہیں۔

آب زمزم۔ پانی یا ایک معجزہ

جو لوگ حج بیت اللہ سے مشرف ہو چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ جو بھی ارکان حج ہیں وہ اولوالعزم پیغمبر خلیل اللہ حضرت ابراہیمؑ، پیغمبر حضرت اسماعیلؑ اور ان کی والدہ جناب ہاجرہ نے اللہ کے حکم کو بجالانے میں جو بھی کوششیں کی تھیں انھیں کی یاد کو تازہ کرنے کے سلسلے میں ہیں۔ چاہے وہ ان دو پیغمبروں کے ذریعے تعمیر کیے گئے کعبہ کا طواف ہو یا جناب ہاجرہ کے ذریعے پانی کے لیے کی گئی ''سعی'' ہو یا شیطانوں کو کنکریاں مارنے کا عمل ہو یا جناب اسماعیلؑ کے لیے فدیہ بنے دنبے کی یاد میں قربانی کرنے کا عمل ہو۔ حج انھیں تین ہستیوں کے ذریعے کیے گئے عمل کو دہرانے کا نام ہے۔

میرا مقصد اس وقت جناب ہاجرہ کی اپنے پیغمبر بیٹے جناب اسماعیلؑ کی پیاس سے جان بچانے کے سلسلے میں پانی کی تلاش میں کی گئی کوشش کے واقعے کو یاد کرنا ہے۔ حاجی حضرات جب طواف کے عمل سے فارغ ہو جاتے ہیں تو وہ صفا و مروہ دو پہاڑیوں کے بیچ سات بار دھیمے اور تیز چل کر ایک عمل کرتے ہیں جسے سعی کہتے ہیں ۔سعی کا مطلب ہی کوشش ہے۔ یہ واقعہ حضرت ہاجرہ پر گزرے اس وقت کا ہے جب جناب ابراہیمؑ اللہ کے حکم سے اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے بڑے بیٹے اسماعیل کو مکہ کی خشک و بنجر زمین پر چھوڑ کر روانہ ہو گئے۔ جب کنعان سے لائی ہوئی غذا اور مشک کا پانی ختم ہوا تو پانی کی تلاش شروع ہوئی۔ لیکن وہاں پانی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ آخر ایک وقت ایسا آیا کہ حضرت اسماعیلؑ جو چھوٹے تھے پیاس سے آئی ہوئی نقاہت کی وجہ سے زمین پر لیٹ گئے یہ حالت دیکھ کر حضرت ہاجرہ نے پانی حاصل کرنے کی سعی

میں سامنے کی صفا و مروہ دو پہاڑیوں کے درمیان سات بار دوڑ لگائی۔ اللہ کو یہ عمل ایسا پسند آیا کہ ہر حاجی کو حضرت ہاجرہ کی تاسّی میں صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنی پڑتی ہے اور یہ حج کا ایک ضروری رکن ہے۔ آخر میں جب حضرت ہاجرہ مایوس ہو کر جناب اسماعیلؑ کی طرف پلٹیں تو دیکھا کہ بیٹا جہاں ایڑیاں رگڑ رہا تھا وہاں سے پانی ابل ابل کر ریتلی زمین پر پھیلا جا رہا ہے۔ بیساختہ آپ کے منہ سے نکلا ''زم زم'' یعنی ''تھم تھم'' اور یہ پانی ایک جگہ تھم گیا ان کی زبان سے نکلے ہوئے لفظ پر ہی اس کنویں کا نام چاہ زمزم اور پانی کا نام آب زمزم پڑا۔ یہ آب زمزم نہ صرف اسماعیل اور ہاجرہ کو سیراب کرنے کا ذریعہ بنا بلکہ وہ اس وقت سے اب تک لاکھوں حاجیوں کو سیراب کر رہا ہے۔ یہ خدا کی قدرت سے لبالب بھرا رہتا ہے۔ مکہ مدینہ کے لوگ مستقل اس پانی کو پیتے ہیں اور ہر سال آنے والے حاجی نہ صرف پیتے ہیں بلکہ ڈرموں میں بھر کر لے جاتے ہیں۔ مگر اس کے پانی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

آب زمزم بلاشبہ اللہ کی قدرت کا ایک نمونہ ہے لیکن کبھی کبھی خود مسلمان اللہ کی قدرت پر شک کرنے لگتے ہیں اور یہ کر کے وہ گویا خود کو تمام مسلمانوں سے زیادہ ترقی یافتہ سمجھتے ہیں۔

میری نظر سے ایک انگریزی اخبار ''فرائی ڈے جرنل'' میں ایک ہندوستانی کیمیکل انجینیئر جناب معین الدین احمد صاحب کا بیان گزرا جب وہ سعودی عرب میں ۱۹۷۱ء کے آس پاس ملازم تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''۱۹۷۱ء میں ایک مصری ڈاکٹر نے یورپ کے پریس کو ایک خط لکھا جس میں اس نے کہا کہ آب زمزم پینے کے لحاظ سے مناسب نہیں۔ اس کا بیان اس اندازے پر مبنی تھا کہ چوں کہ مقدس کعبہ ایک چھچلی جگہ پر (سطح سمندر سے نیچے) ہے اور مکہ شہر کے مرکز میں ہے اس لیے شہر کا سارا گندہ اور بے کار پانی پرنالوں اور نالوں کے ذریعے سے ہوتا ہوا زمزم کے کنویں میں گرتا ہے جس سے آب زمزم آلودہ ہو گیا ہے۔

اس زمانے میں شاہ فیصل مرحوم سعودی عرب کے حکمراں تھے۔ یہ خبر جب ان کے کانوں تک پہنچی تو انھیں شدید غصہ آیا اور انھوں نے مصری ڈاکٹر کے اشتعال انگیز بیان کو غلط ٹھہرانے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے فوراً وزارت آب رسانی اور زراعت کو حکم دیا کہ وہ اس الزام کی جانچ کریں۔ اور آب زمزم کے نمونے مختلف یورپی لباریٹریز میں بھیج کر جانچ کرائیں کہ پانی پینے کے لائق ہے کہ نہیں۔ وزارت نے اس کام کو کرنے کے لیے توانائی اور پانی کا کھاراپن دور کرنے والے کارخانے کو ہدایت دی۔

اسی زمانے میں میں کھاراپن دور کرنے والے انجینئر کے طور پر ملازم ہوا تھا۔ (ایسا کیمیکل انجینئر جو سمندر کے پانی سے پینے کا پانی تیار کرتا ہے) مجھے اس کام کی جانچ کے لیے منتخب کیا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ اس مرحلے پر مجھے کچھ بھی اندازہ نہ تھا کہ زمزم کا کنواں کیسا دکھائی دیتا ہے۔ میں مکہ گیا اور مقدس کعبہ پر تعینات افسران کے سامنے حاضر ہوا اور اپنے دورے کا مقصد بتایا۔ انھوں نے مجھے اس کام میں مدد کرنے کے لیے ایک عرب کو میرے ساتھ کیا۔

میں نے چاہ زمزم پہنچ کر اپنے ساتھی سے کنویں کی گہرائی جانچنے کا کام لیا۔ وہ غسل کر کے کنویں کے پانی میں داخل ہو گیا۔ تب اس نے اپنے جسم کو سیدھا کیا تو پتہ چلا کہ پانی کی سطح اس کے کاندھوں سے صرف تھوڑی اوپر تھی۔ اس شخص کی لمبائی پانچ فٹ آٹھ انچ تھی۔ اس نے پھر کھڑے کھڑے کنویں کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ڈھونڈھنا شروع کیا تاکہ کنوئیں میں شہر سے پانی آنے والے راستے یا پائپ لائن کا پتہ لگایا جا سکے جہاں سے پانی اندر آرہا ہے۔ کھڑے کھڑے اس لیے کیوں کہ اسے اپنا سر پانی میں ڈبونے کی اجازت نہ تھی۔

بہرحال اس شخص نے اطلاع دی کہ اسے کنویں میں نہ تو پائپ لائن مل سکی اور نہ ہی پانی کے اندر آنے کا راستہ مل سکا۔ اب اس نے دوسرا طریقہ آزمایا۔ وہ یہ کہ آب زمزم کو دوسرے بڑے تالابوں میں جمع کرنے والے بڑے پمپ جو زمزم

۷۸۶

تخلیق اول۔ نور محمدی

ویسے تو اسلام میں (۷۳) تہتر فرقے کہے جاتے ہیں لیکن جہاں تک رسول اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت و شخصیت کا تعلق ہے مسلمان واضح طور پر دو طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک طبقہ کا عقیدہ یہ ہے کہ (۱) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک عام انسان تھے جن میں انسانوں میں پائی جانے والی تمام خوبیاں و کمزوریاں تھیں۔ کچھ باتیں وہ انسانی جذبات و خونی رشتوں کے تحت کرتے یا کہتے تھے جیسے کہ حضرت فاطمہ کی تعظیم کرنا، ان کو اپنا ٹکڑا کہنا، حضرت علیؑ کو دوسروں سے آگے کرنا یا امام حسینؑ کو مسجد میں گرتے دیکھ کر خطبہ نامکمل چھوڑ کر ان کو اٹھانے کے لئے منبر چھوڑ کر دوڑ جانا وغیرہ اور کچھ کام وہ خدا کے حکم کے تحت کرتے یا کہتے تھے لہٰذا بہ حیثیت نبی ان کی پوزیشن بس اتنی برتر تھی جیسے بڑا بھائی۔

(۲) وہ پہلے سے نبی نہیں تھے بلکہ چالیس سال بعد اللہ نے فیصلہ کیا ان کو نبی بنایا جائے لہٰذا نبی بنانے کی کاروائی شروع ہوئی۔۔

(۳) رہ گئی غار حرا کی بات تو ان کے مطابق چونکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تنہائی پسند تھے اس لئے وہ مکہ کی زمینی مقامات کو چھوڑ کر پہاڑ پر بنے غار میں جا کر اپنا وقت گزارتے تھے حالانکہ جو لوگ حج پر جا چکے ہیں وہ اس بات کے شاہد ہوں گے کہ غار حرا اتنی اونچائی پر ہے کہ عام حالات میں انسان وہاں جانا پسند نہیں کرے گا جب تک

کنویں میں لگے ہیں، ان کی مدد سے پانی کو تیزی سے کھینچا جائے تا کہ پانی کی سطح بالکل نیچے آجائے اور ہم اس راستے کو دیکھ لیں جہاں سے پانی کنوئیں میں داخل ہوتا ہے۔ جب کچھ پتہ نہ چلا تو میں نے اپنے ساتھی کو ہدایت دی کہ وہ کنوئیں میں ایک جگہ ساکت کھڑا رہے اور کنوئیں کے اندر ہونے والی کسی بھی غیر معمولی چیز کا ہوشیاری سے مشاہدہ کرے۔ کچھ دیر بعد اس نے ایکدم سے اپنے ہاتھ اٹھائے اور چلایا ''الحمد للہ مجھے پتہ چل گیا ہے۔ بالو میرے پیر کے نیچے رقص کر رہے ہیں کیوں کہ پانی کنوئیں کی سطح والی زمین سے رس کر اوپر آرہا ہے''۔ اس کے بعد وہ کنوئیں کے اندر چاروں طرف گھوما اور محسوس کیا کہ وہ وہی کیفیت کنوئیں میں ہر طرف ہے۔ دراصل کنوئیں میں پوری سطح پر پانی کا رساؤ اور بہاؤ ہر جگہ برابر تھا۔ اس طرح پانی کی سطح بھی قائم تھی۔

یہ بات ثابت ہونے کے بعد کہ پانی زمین سے رس کر اوپر آرہا ہے، اب میں نے اس پانی کے نمونے یورپی لیبارٹریز میں جانچ کے لیے بھیجے۔ مقدس کعبہ چھوڑنے سے پہلے میں نے وہاں کے افسران سے مکہ کے چاروں طرف کے دوسرے کنوؤں کے بارے میں پوچھا۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ کنوئیں زیادہ تر خشک ہیں۔ یورپ کی لیباریٹریز میں جانچ کیے گئے پانی کے نمونے کے نتائج اور ہماری اپنی لیبارٹری میں جو تجزیہ کیا گیا اس کے نتیجہ میں کوئی خاص فرق نہیں پایا گیا۔ آب زمزم اور شہر مکہ کے دوسرے پانی میں فرق صرف کیلشیم (Calcium) اور میگنیشیم (Magnesium) کی مقدار میں تھا۔ آب زمزم میں ان کی مقدار تھوڑی زیادہ تھی۔ حالاں کہ اسی وجہ سے آب زمزم حاجیوں کو تازگی بخشتا ہے۔ لیکن زیادہ نمایاں بات یہ تھی کہ پانی میں فلورائیڈ کی اچھی مقدار تھی جو جراثیم کش ہے۔ اس کے علاوہ یورپ کی تمام لیباریٹریز نے تصدیق کی کہ پانی پینے کے لیے بالکل ٹھیک ہے۔ اس طرح مصری ڈاکٹر کا بیان جھوٹ ثابت ہوا۔ جب یہ شاہ فیصل کو معلوم ہوا تو انھوں نے خوش ہو کر کہا

کہ یورپ کے تمام اخبارات میں مصری ڈاکٹر کے رپورٹ کی تردید کی جائے۔
ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ انتظام ہو کہ آب زمزم کی جانچ کی جائے اور لوگ اس پانی کے معجزہ ہونے پر ایمان لے آئیں۔ وہ پانی جو حج کے لیے دور دراز سے ریگستان میں آنے والے حاجیوں کے لیے اللہ کی طرف سے ایک عطیہ ہے۔

مختصر طور پر آب زمزم کی خصوصیات یہ ہیں۔

حضرت اسماعیلؑ کے زمانہ سے اب تک یہ کنواں کبھی خشک نہیں ہوا بلکہ اس نے ہمیشہ پانی کی مانگ کو پورا کیا ہے۔

اس پانی میں ہمیشہ نمک کی ایک سی معین مقدار رہی ہے۔ اور جب سے یہ وجود میں آیا ہے اس کا ذائقہ ایک جیسا ہے۔

ہر ملک سے آنے والے حاجی نے اسے بہترین پانی تسلیم کیا ہے۔

اس پانی کے ساتھ کبھی کوئی کیمیائی ترکیب نہیں کی گئی ہے اور نہ ہی اس میں کبھی کلورین پانی صاف کرنے کے لیے ڈالی گئی ہے جیسا کہ شہروں میں فراہم کیے جانے والے پانی میں ہوتا ہے۔

بہت سے کنوؤں میں سبزہ وغیرہ پیدا ہو جاتا ہے جو بعد میں سڑنے لگتا ہے اور یہ نہ صرف پانی کو غیر ہاضم بناتا ہے بلکہ ذائقہ اور بو کا مسئلہ پیدا کرتا ہے۔ لیکن زمزم کے کنوئیں میں اس طرح کے سبزہ کے اگنے کے کوئی آثار نہیں پائے گئے۔

کیا اب بھی ہم نہیں مانیں گے کہ اللہ نے حضرت اسماعیلؑ نبی کی جان بچانے کے لیے پانی کی تلاش میں کی گئی جناب ہاجرہ کی سعی سے خوش ہو کر پانی کا ذخیرہ کنوئیں کی شکل میں ہمیشہ کے لیے اوپر کر دیا اور ماں کے اس بے مثال عمل کو حج کا ایک رکن بنا دیا۔ اگر یہ مان لیا تو پھر یہ بھی مان لیں کہ آب زمزم پانی نہیں قدرت کا ایک معجزہ ہے۔

گود کے بولتے بچے

تمام مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت علیؑ کی ولادت خانۂ کعبہ میں ہوئی تھی اور اس بات پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ آپ کی والدہ جناب فاطمہ بنت اسد خانۂ کعبہ میں دروازے کے راستے داخل نہیں ہوئی تھیں، یہاں کچھ سوالات ذہن میں پیدا ہوتے ہیں

(۱) حضرت علیؑ جناب فاطمہ بنت اسد کے پہلے بچے نہیں تھے۔اس سے پہلے کے تمام بچے جناب ابو طالب کے گھر میں پیدا ہوئے تھے تو پھر ایسا کیا ہوا کہ جناب فاطمہ بنت اسد علیؑ کی ولادت کے لیے گھر چھوڑ کر خانۂ کعبہ کی طرف آئیں۔

(۲) جب کعبہ تک پہنچیں تو کعبہ کو مقفل پایا۔ایسی حالت میں آپ کو رِسک نہ لے کر واپس آجانا چاہیے تھا لیکن اس کے بجائے آپ کعبہ کی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئیں اور پھر یکایک کعبہ کی دیوار شق ہوئی۔

(۳) دیوار شق ہونے پر جناب فاطمہ بنت اسد کو انسانی فطرت کے مطابق ڈر کر دیوار سے دور ہوجانا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ آپ اطمینان سے کعبہ میں داخل ہو گئیں اور کعبہ کے اندر حضرت علیؑ کی ولادت ہوئی۔آپ نے دیوار کو دوبارہ جڑتے دیکھا لیکن آپ کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا۔آپ تین دن وہاں رہیں۔

(۴) سردار مکہ (جناب ابو طالب) کی زوجہ تین دن تک گھر سے غائب ہے جب کہ اس کے یہاں ولادت ہونے والی ہے اور سردار مکہ کو کوئی بے چینی نہیں ہے بلکہ وہ خود تین دنوں بعد کعبہ کے پاس پہنچ رہا ہے۔

(۵) کعبہ کے دروازے کے تالے کی کنجی سردار مکہ کے پاس ہے لیکن تالا کھل نہیں رہا ہے اور پھر یکایک پہلے والی جگہ دیوار پھٹتی ہے اور جناب فاطمہ بنت اسد بچے (حضرت علیؑ) کو لے کر باہر نکلتی ہیں اور دیوار پھر برابر ہو جاتی ہے۔

ان غیر معمولی بلکہ خلاف معمول مرحلوں کو دیکھنے کے بعد کیا آپ کو ایسا نہیں لگتا کہ یہ سب قدرت الٰہی کا مظاہرہ ہے۔

اگر یہ بات ہم مان لیتے ہیں تو اگلے مرحلے میں اس بات پر کیوں میم میخ نکالی جاتی ہے کہ حضرت علیؑ نے رسول اکرم ﷺ کی گود میں آ کر ہی آنکھ کھولی اور گود میں ہی آپ نے توریت، زبور، انجیل اور قرآن کی تلاوت کی ۔ ارے رسول کی گود میں آ کر جب سنگریزے بولنے لگتے تھے تو پھر حضرت علیؑ تو بعد میں مولا ہونے والے تھے۔ ان کے بولنے پر شک کیوں؟ اور تاریخ انسانیت میں یہ کوئی پہلے بچے نہیں تھے جو گود میں بولے۔

آیئے ہم سب سے پہلے گود کے ان بچوں پر روشنی ڈالتے ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے۔

حضرت عیسیٰؑ

جب جناب مریم جو کنواری اور پاک دامن تھیں، اللہ کے حکم سے حاملہ ہوئیں اور حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے تو چونکہ یہ بچہ جناب مریم کی کسی سے شادی ہوئے بغیر پیدا ہوا تھا اس لئے علاقہ میں ہنگامہ برپا ہو گیا اور لوگ ان کو برا بھلا کہنے لگے ۔ چونکہ ہر مسلمان کا قرآن پر ایمان ہے اور قرآن پر ایمان نہ ہونے کی حالت میں وہ مسلمان کی صف سے نکل جائے گا لہٰذا ہم آگے کا واقعہ قرآن کی آیتوں کے ذریعہ بیان کرتے ہیں۔

''پھر مریم بچے (حضرت عیسیٰؑ) کو اٹھائے ہوئے اپنی قوم کے پاس آئیں تو لوگوں نے کہا کہ مریم! یہ تو تم نے بہت برا کام کیا ہے۔ اے ہارون کی بہن! نہ تو تمہارا

باپ ہی برا آدمی تھا اور نہ تمہاری ماں بدکردار تھی۔ مریم نے اس بچے کی طرف اشارہ کر دیا تو قوم والوں نے کہا کہ ہم اس بچے سے کیا بات کریں جو گہوارہ میں ہے؟ (اس پر) اس بچے (حضرت عیسیٰؑ) نے آواز دی کہ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے۔ (سورہ مریم آیت ۲۷ تا ۳۰)

یوں تو گود کے دوسرے بچے اس بچے سے پہلے بول چکے تھے، لیکن چونکہ یہ بولنے والا بچہ نبی تھا اس لیے ان کی مثال پہلے دی گئی۔ اب دوسرے بچے کا ذکر حاضر ہے۔

حضرت یوسفؑ کا گواہ بچہ

حضرت یوسفؑ پیغمبر جب غلام بنا کر مصر لائے گئے تو عزیز مصر نے انھیں اپنے گھریلو کاموں کے لیے اپنے گھر میں رکھ لیا۔ چونکہ حضرت یوسفؑ بہت خوب صورت تھے اس لیے عزیز مصر کی زوجہ زلیخا ان پر عاشق ہو گئی۔ اس نے حضرت یوسفؑ سے اپنی نفسانی خواہش پوری کرنے کے لیے گھر کے سارے باہر جانے والے دروازے بند کر دیے اور اپنی خواہش بیان کی۔ حضرت یوسفؑ چونکہ نبی تھے اور معصوم تھے اس لئے آپ نے انکار کیا اور زلیخا سے بچنے کے لیے صدر دروازہ کھولنے کے لیے دوڑ پڑے۔ زلیخا نے ان کو پکڑنے کی کوشش کی۔ حضرت یوسف کی قمیص کا پچھلا حصہ اس پکڑ دھکڑ میں پھٹ گیا۔ جیسے ہی حضرت یوسفؑ دروازہ کھولنے میں کامیاب ہوئے انھوں نے دروازے پر زلیخا کے شوہر عزیز مصر کو کھڑا پایا۔ زلیخا نے فوراً حضرت یوسفؑ پر زبردستی کرنے کا الزام لگایا۔ وہیں حضرت یوسفؑ نے اس سے انکار کیا۔ اس وقت وہاں جھولے میں ایک دودھ پیتا بچہ بھی لیٹا تھا۔ حضرت یوسفؑ نے کہا کہ یہ بچہ یہاں گزرنے والے تمام واقعات کا گواہ ہے۔ لہٰذا اس سے پوچھا جائے۔ یہاں سے قرآن کا بیان پڑھیے۔

"اس پر (زلیخا ہی کے) گھر والوں میں سے ایک گواہ (دودھ پیتے بچے) نے گواہی دی کہ اگر ان کا (حضرت یوسفؑ کا) کرتہ سامنے سے پھٹا ہے تو

وہ (زلیخا) سچی ہے اور یہ (حضرت یوسفؑ) جھوٹوں میں سے ہیں۔ اور اگر ان کا کرتہ پیچھے سے پھٹا ہے تو وہ جھوٹی اور یہ سچوں میں سے ہیں۔ پھر جو دیکھا کہ ان کا کرتہ پیچھے سے پھٹا ہے تو اس نے کہا یہ تم عورتوں کی مکاری ہے"۔ (سورہ یوسف آیت ۲۶ تا ۲۸)

یہاں ایک غیر متعلق بچہ جھولے میں سے ایک نبی کی عصمت کی گواہی میں بولا ہے۔

خندق والوں (اصحاب الاخدود) میں کا ایک بچہ

ان خندق والوں کا ایک ہلکا سا خاکہ قرآن مجید نے سورہ بروج آیت ۴ تا ۸ میں کھینچا ہے۔ یہاں ایک نبی آئے تھے اور ان کے بہت سے اصحاب نے ان کی پیروی کی تھی لیکن ان کو نہ ماننے والے ان سے لڑے اور نبی کو شہید کر دیا۔ تب انھیں لوگوں نے خندقیں کھودیں جنھیں آگ سے بھر دیا اور یہ دھمکی دی کہ یا تو وہ لوگ نبی کا بتایا ہوا راستہ چھوڑ دیں ورنہ ان سب کو اس آگ میں جھونک دیا جائے گا۔ بہت سے لوگ ڈر کر نبی کے بتائے ہوئے راستے کو چھوڑ بیٹھے مگر کچھ ڈٹے رہے۔ اور شہید ہوتے رہے نبی کے ماننے والوں میں ایک عورت بھی تھی وہ آگ میں کودنے والی تھی کہ اس نے اپنے دو مہینے کے بچے کو دیکھا۔ اس بچے کے خیال سے اس کا ارادہ بدلنے ہی والا تھا کہ وہ بچہ بول اٹھا "اے ماں! تم اپنے آپ کو آگ کے حوالے کر دو، یہ اللہ کی راہ میں بہت تھوڑا عمل ہے" (بحار الانوار)

فرعون کی بیٹی کے بال سنوارنے والی کا بیٹا

فرعون کی بیٹی کے بال سنوارنے والی اللہ اور حضرت موسیٰؑ پر ایمان رکھتی تھی۔ ایک دن وہ فرعون کی بیٹی کے بالوں میں کنگھا کر رہی تھی کہ وہ کنگھا گر گیا۔ اس نے اسے اٹھاتے وقت اللہ کا نام لیا۔ بیٹی نے تعجب سے پوچھا کہ کیا تمہارا مطلب

میرے باپ سے ہے؟اس عورت نے جواب دیا کہ نہیں بلکہ وہ جو تمہارا میرا اور تمہارے باپ کا بھی مالک ہے۔ بیٹی سے یہ بات معلوم ہونے پر فرعون نے اس عورت کے بچوں کو ایک کے بعد ایک زندہ حالت میں دہکتی ہوئی آگ میں پھینکنا شروع کیا۔ وہ عورت یہ منظر دیکھتی رہی لیکن جب اس کا نیا پیدا ہونے والا بچہ پھینکا جانے لگا تو اس کے صبر کا دامن چھوٹ گیا۔ ایسے میں وہ اس کا چھوٹا سا بیٹا بولا ''اے ماں صبر کرو کیوں کہ تم صحیح راستے پر ہو''، یہ سن کر ماں کا ارادہ مضبوط ہوگیا۔ پہلے بچہ پھر ماں شہید ہوگئی (بحارالانوار)

اب اعتراض کرنے والے خود انصاف سے کام لیں کہ جب حضرت عیسیٰؑ، زلیخا کے گھر کا بچہ، فرعون کی نوکرانی کا بچہ اور خندق والوں کا بچہ یہ سب گود میں بول سکتے ہیں تو اللہ کی قدرت سے حضرت علیؑ گود میں کیوں نہیں بول سکتے جب کہ اللہ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کا اعلان ان کے پیدا ہونے تک روک رکھا تھا کیوں کہ حضرت علیؑ کو ہی (قرآن کے مطابق) رسول کا گواہ اور ناصر بننا تھا۔

حضرت علیؑ غیر مسلموں کی نگاہ میں

جب میں حضرت علیؑ کے بارے میں قلم اٹھانے کی ہمت کرتا ہوں تو میرے ذہن میں مولانا روم کی فارسی رباعی سامنے آجاتی ہے۔

اوصاف علیؑ بہ گفتگو ممکن نیست — گنجائش بحر در سبو ممکن نیست
من ذات علیؑ بو اجبی کی دانم — الا دانم کہ مثل او ممکن نیست

ترجمہ

حضرت علیؑ کے اوصاف پر گفتگو ممکن نہیں ہے، جیسے ایک صراحی میں سمندر سمانا ممکن نہیں ہے

میں علیؑ کی ذات کو ٹھیک طور پر کہاں سمجھ سکتا ہوں، ہاں صرف اتنا جانتا ہوں کہ ان کا مثل ہونا ممکن نہیں ہے

یہ کون علیؑ ہیں؟ وہ جس کے بارے میں رسول کا قول ہے کہ ''میں اور علی ایک نور سے ہیں'' وہ جو ۱۳ رجب کو اللہ کے گھر کعبہ میں اس طرح پیدا ہوئے کہ آپ کی والدہ جناب فاطمہ بنت اسد وضع حمل کے لیے انسانی فطرت کے خلاف اپنے گھر میں رہنے کی بجائے کعبہ تک آئیں۔ دروازہ بند ہونے کی وجہ سے آپ نے دیوار کعبہ سے ٹیک لگائی اور اللہ سے مشکل آسانی کی دعا مانگی۔ دعا ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ دیوار میں راستہ بنا اور آپ بلا کسی گھبراہٹ کے کعبہ میں داخل ہوگئیں اور ولادت کے بعد پھر دیوار کے ہی راستے باہر آئیں جہاں آپ کے شوہر ابو طالب اور رسول اللہ موجود تھے

۔ بچے نے رسول کی آغوش میں آنکھ کھولی اور کتب آسمانی کی تلاوت کی۔ وہ جنھوں نے گہوارہ میں ہی اژدہے کے کلّے کو چیر کر اسے ختم کر دیا وہ کہ جن کا دس برس کا سن ہوجانے کے بعد ہی رسول نے اعلان رسالت کیا۔ وہ جو رسول کی جان بچانے کے لیے شب ہجرت بستر رسول پر کفار کے نرغہ میں تلواروں کے سائے میں سوئے۔ وہ جن کے بغیر کوئی اسلامی جنگ فتح نہ کی جا سکی۔ وہ علیؑ جن کے لیے ندائے آسمانی آئی کہ ''ذوالفقار کے علاوہ کوئی تلوار نہیں اور علیؑ کے علاوہ کوئی مرد میدان نہیں'' وہ جو مرد میدان کے علاوہ باب شہر علم بھی تھے۔ وہ علیؑ جو رسول اسلام کے چچازاد بھائی، ان کی اکلوتی بیٹی جناب فاطمہ زہرہ سلام اللہ علیہا کے شوہر اور جوانان جنت کے سردار حسنؑ و حسینؑ (ع) کے والد تھے۔ یہ وہ علیؑ ہیں جن کے مولا ہونے کا اعلان رسول اسلام نے غدیر خم میں کیا۔ یہ وہی علیؑ ہیں جن کا بعد رسول حق غصب کیا گیا اور یہ وہی علیؑ ہیں جن پر ۱۹ رمضان کو ابن ملجم نے مسجد کوفہ میں سجدہ کی حالت میں زہر سے بجھی تلوار سے سر پر حملہ کیا تو آہ کرنے کے بجائے یہ جملہ نکلا کہ ''خدا کی قسم آج علیؑ کامیاب ہوا'' یہ وہ علیؑ ہیں جن کے بارے میں قول رسول اعظمؐ ہے کہ ''اگر دنیا کے تمام درخت قلم بن جائیں اور تمام سمندر روشنائی بن جائیں پھر بھی علیؑ کے اوصاف کا ذکر مکمل نہ ہوگا۔

ہاں! یہ وہی علیؑ ہیں کہ کربلا میں آپ کی اور آپ کے بھائیوں کی اولاد نے قربانیاں دے کر اسلام کو بچایا۔ آپ کی دلیری و شجاعت آپ کا علم اور حقوق بشر کے بارے میں آپ کا نظریہ اتنی بلندی پر تھا کہ غیر مسلم حضرات بھی آپ کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ ہم یہاں چند غیر مسلم حضرات کے ان احساسات کو قلم بند کرتے ہیں جو حضرت علیؑ کے بارے میں بیان ہوئے۔

ڈاکٹر شنکر دیال شرما ''صدر جمہوریہ ہند'':

جس مقدس ہستی کو رسول اسلام نے اپنے کندھے پر ٹھہرایا، اس کی اونچائی

اس کی عظمت کا کیا کہنا۔ میں نے حضرت علیؑ کے خطبات کو نہج البلاغہ میں پڑھا ہے۔ انسان دوستی، اصول پسندی، سچائی، حق کہنے کی عادت، جواں مردی، دشمنوں کو معاف کرنا اور ان کی زندگی کی قربانیاں ان کی کھلی ہوئی خوبیاں تھیں۔

حضرت علیؑ کی تلوار ذوالفقار کے جوہر سے کون واقف نہیں۔

رائے ٹھاکر پرساد (اسپیشل جج جون پور):

حضرت علیؑ کی کامیابی میں جسمانی طاقت سے زیادہ ان کی سچائی کی طاقت تھی۔ (اخبار سیاست، حیدر آباد ۹ر جون ۱۹۸۵ء)

مسلمانوں اور غیر مسلموں کی لکھی تاریخ کی کتابوں سے جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں کہ علیؑ پیغمبر کی پرچھائیں تھے۔

یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ علیؑ پیغمبر کی قوت کے اصل معمار تھے۔ وہ مشاورتی کونسل میں سب سے زیادہ عقل مند اور میدان جنگ میں سورما تھے۔ ان کی تلوار نے خندق، احد، بدر اور خیبر میں اسلام کو فتح دلائی تھی۔ اگر علیؑ نہ ہوتے تو پیغمبر کا مشن ابتدا ہی میں فیل ہو جاتا اور دنیا تاریخ انسانی کے ایک لاثانی انقلاب سے محروم رہ جاتی۔ علیؑ کی اپنی کوششوں نے یہ ممکن بنایا کہ اسلام کا پیغام اس زمانے کے کفار تک پہنچ جائے'' (۲۰ جولائی ۱۹۳۸ء کے ان فیصلے کا ایک جزو)

جسٹس آرنولڈ۔ ممبئی ہائی کورٹ:

''علیؑ اپنے وقت کے سب سے بڑے سورما تھے جن کا مقابلہ کسی سے نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے وہ اس بات کے مکمل طور پر حقدار تھے کہ ان سے دل کی گہرائی سے محبت کی جائے۔ ایسا ہیرو جو بہادر، دانا، انصاف پسند اور اپنے کو نیک مقصد کے لیے وقف کر دینے والا تھا جس کی کوئی دوسری مثال تاریخ میں نہیں ملتی'' (مشہور خوجہ مقدمہ ۱۹۳۵ء میں دیے گئے فیصلے کا ایک جزو)

کوئی مصلحت نہ ہو۔

(۴) چالیس سال تک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایمان میں کچھ اتنی کمی تھی (معاذ اللہ) کہ حضرت جبرئیل کو ان کو زمین پر چت کر کے ان کے سینے کی سرجری کر کے دل کو نکالنا پڑا اور دل سے وہ کالا دھبہ نکال کر دل کو غوطہ دے کر پاک کر کے دوبارہ اپنی جگہ پر رکھنا پڑا (غالباً آپریشن کے اثرات فوراً ختم ہو کر سینہ نارمل ہو گیا)

(۵) وہ تو اتنے کم علم تھے کہ انھیں یہ بھی نہ معلوم ہو سکا کہ یہ سب کرنے والے حضرت جبرئیل ہیں ان سے زیادہ علم تو ورقہ بن نوفل رکھتے تھے جن کے پاس جناب خدیجہ لے گئی تھیں اور انھوں نے بتایا کہ یہ جبرئیل تھے اور آپ کو نبوت مبارک ہو۔

(۶) ان کی سادہ لوحی کی معاذ اللہ حد اتنی زیادہ تھی کہ جبرئیل کے یہ کہنے پر کہ (جو وہ کہہ رہے ہیں) پڑھو تو وہ کہتے ہیں کہ میں کیسے پڑھوں مجھے پڑھنا نہیں آتا۔ اے سبحان اللہ کہ انھیں لکھا ہوا پڑھنے اور جو زبانی کہا جا رہا ہے اسے پڑھنے (دہرانے) کا فرق بھی نہیں معلوم تھا نتیجہ یہ کہ جبرئیل کو بار بار زور سے بھینچنا پڑا تب کہیں جا کر وہ سمجھے۔

(۷) انھیں تب بھی جبرئیل کی بات پر یقین نہیں آیا اور وہ ڈرے سہمے جناب خدیجہ کے پاس آئے اور ان سے تمام ماجرا بتایا۔ ان سے زیادہ ہمت والی معاذ اللہ جناب خدیجہ تھیں کہ ان کی ڈھارس بندھائی اور ورقہ بن نوفل کے پاس لے جا کر سب بات صاف کرائی۔

(۸) اب ایسے ایک انسان کی معاذ اللہ کیا بساط کہ اللہ اس کو معراج میں جسم سمیت بلائے۔ لہٰذا دنیا انگلی نہ اٹھائے تو یہ کہہ دیا کہ معراج جسمانی نہیں بلکہ روحانی تھی۔ اپنی بات نبھانے کے چکر میں یہ بھی نہ سوچا کہ قرآن تو صاف صاف نعلین کی بات کر رہا ہے اور روح کو نعلین پہننے اور اتارنے کے لئے حکم دینے کی کیا ضرورت۔

اب اگر کوئی ایسا نبی ہو گا تو وہ بس عام انسان ہو گا اور کمزوریوں کا مجسمہ

فلپ کے ہٹی:

مذہب میں راسخ، میدان جنگ میں شجاع، بزم میں بہترین مقرر، دوستوں کے ساتھ وفادار اور دشمنوں کے ساتھ کریم و عالی ظرف ہونے کی وجہ سے علیؑ اپنے ماننے والوں کے لیے مسلم شرافت اور عرب کی بہادری کا مثالی نمونہ بن گئے''] (میکرس آف عرب ہسٹری۔ صفحہ ۴۶)

میجر رابرٹ ڈیوری آسبرن:

''قاتل کی تلوار نے اسلام کی امیدوں کو منقطع کر دیا۔ علیؑ کیا گئے کہ مخلص ترین دل والا اسلام کا ایسا مثالی نمونہ اٹھ گیا جسے اسلامی تاریخ نے محفوظ کیا ہے'' (کتاب اسلام انڈر عربس)

آرتھر این ونسٹن:

''عرب کی پوری تاریخ علیؑ جیسا شجاع پیدا نہ کرسکی''

تھامس کارلائل:

''علیؑ عرب کے سب سے بڑے سورما اور سپاہی تھے جن کی نظیر نہ پہلے کبھی ملی اور نہ آئندہ ملنے کی توقع ہے۔ ان کی ذات انسانی قوت کا عظیم خزانہ تھی۔ پچھلی بیس صدیوں میں ایسی کسی ہستی کا پتہ نہیں چلتا۔ اس لیے ہم سے یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم ان کو دوست نہ رکھیں۔ اور ان کے چاہنے والے نہ بنیں۔ اس لیے کہ ان میں کون سی خوبی ایسی ہے جسے ہم پسند نہ کریں اور کون سی ایسی خوبی اور بھلائی ہے جو علیؑ میں موجود نہ ہو'' (کتاب ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ)

جان ڈیون پورٹ:

تاریخ ادب میں بھی علیؑ ایک ممتاز مقام کے حامل ہیں۔ انھوں نے اپنا ذہنی

ارتقا ایسے سہل اور محکم طریقہ پر کیا تھا جو اس زمانہ اور ملک میں مفقود تھا۔انھوں نے جملوں ،ضرب الامثال اور شاعری کے بہت سے مجموعے چھوڑے ہیں ۔گابلن (Gobblin) نے ان جملوں کے اجزاء ۱۶۲۹ء میں اور لیٹل (Lettle) نے ۱۷۴۶ء میں لنڈن میں طبع کروائے ۔والتھر (Valther) نے گابلن کے جمع کیے ہوئے جملے ۱۶۶۰ء میں فرانسیسی زبان میں طبع کروائے۔آکلے نے اپنی کتاب ''ہسٹری آف سارا سنس'' کی تیسری بار اشاعت میں صفحہ ۳۳۹ پر علیؑ کے ۱۶۹ جملوں کا انگریزی ترجمہ دیا ہے۔یہ بھی کہا جاتا ہے کہ علم سحر پر علیؑ کا لکھا ہوا ایک کتابچہ قسطنطنیہ کے شاہی کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

علیؑ ایسے ہی آدمی تھے ۔خدا ان کا مقام برکت دائمی کی گہرائیوں میں کرے''۔(کتاب این اپولوجی فار محمد اینڈ دی قرآن)

خلیل جبران:

اس مفکر کا شمار بڑے عیسائی علماء میں ہے اور تاریخ اسلام میں بڑی معلومات رکھتا ہے۔وہ لکھتا ہے۔

''علیؑ مر گئے۔یہ وہ امام تھے کہ ان کا مقام اور ان کی شان ان پیغمبروں سے بلند تھی جو بصیرت، بینائی اور شخصیت کے اعتبار سے دنیا میں مشہور تھے۔علیؑ کا تعلق کسی شہر، قوم، زبان اور مکان سے مخصوص نہ تھا بلکہ ان کی شخصیت عالم گیر شہرت کی مالک تھی۔علیؑ شہید اعظم تھے۔وہ حالت نماز میں زخم کھا کر دنیا سے اٹھے۔ان کا دل خدا کی محبت سے لبریز تھا۔میرے عقیدے کے مطابق ابو طالب کا فرزند پہلا عرب ہے جس نے روحانیت سے بدرجہ کمال تعلق پیدا کیا۔ان کے کان آسمانی آوازوں کو سن سکتے تھے، اور ان کی زبان سے الہام اور وحی کے زریعہ حقائق کی صدائیں سنائی دیتی تھیں ۔یہ صفات کسی بشر میں نظر نہ آئیں ۔لطف تو یہ ہے کہ ایام جاہلیت میں پیدا ہو کر ایسا بلند مقام حاصل کیا اور جس شخص نے ان سے عداوت کا مظاہرہ کیا وہ جاہلیت کا

سب سے بڑا نا سمجھ انسان ہے''۔ (ہسٹری آف اسلام)

ڈاکٹر شیلی سمویل، طبیعات کا مشہور ڈاکٹر):

علیؑ کی ہستی سب سے بڑی اور سب سے افضل تھی۔ شرق و غرب میں کسی نے ایسا امام و پیشوا مقتدائے بشریت نہیں دیکھا۔ دنیا کے تمام بزرگوں کی قافلہ سالاری انھیں کی ذات پر منحصر ہے۔ وہ بزرگ ہستی سراپا آئینۂ حق نما تھی جس کا مثل کوئی ہوا اور نہ ہوگا''۔

جارج جرداق:

یہ لبنان کے ایک مشہور عیسائی عرب مفکر تھے۔ انھوں نے عربی میں ایک کتاب ''صوت العدالت الانسانیہ'' ۱۹۵۶ء میں لکھی، جس کا اردو ترجمہ ادارہ اصلاح نے ''ندائے عدالت انسانی'' کے نام سے شائع کیا۔ یہ کتاب عدالت علیؑ کا احاطہ کرتی ہے۔

جارج جرداق کا انٹرویو جناب رضا امیر خانی کی سرکردگی میں ایک ایرانی گروہ نے لیا تھا۔ جارج نے بتایا:

''میں نے جب یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو میں نے عربی ادب اور فلسفہ کا مطالعہ کیا۔ میں امام علیؑ کی ادبی زبان کے طلسم میں جکڑ گیا۔ میں نے انھیں ایک عظیم شخصیت پایا۔ میں نے ہر وہ کتاب یا مضمون کا مطالعہ کیا جس میں امام علیؑ کے بارے میں کچھ بھی لکھا تھا۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ ان کی عظیم شخصیت ولایت، حقانیت اور خلافت کے بحث و مباحثوں میں کھوگئی ہے۔ مصنفین نے حضرت علیؑ کی حکومت کو تو دیکھا لیکن ان کے انسانی اقدار کو نظر انداز کر گئے۔

میں مطمئن نہیں ہوا اور پھر نہج البلاغہ کی طرف رجوع کیا۔ میں حیران ہوں کہ امام علیؑ نے کس طرح قومی مسئلہ کو اٹھاتے ہوئے بغیر قومیت پر زور دئے انسانیت کو بالاتر رکھا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ امام علیؑ کا مقام عیسیٰؑ سے اونچا ہے''۔

مائکل نعیمہ:

یہ بھی ایک عیسائی عرب عالم تھے۔انھوں نے جارج جرداق کی کتاب کے انگریزی ترجمہ "وائس آف ہیومن جسٹس" کے دیباچہ میں لکھا ہے:

یہ پیغمبر کے بعد عرب کے زندہ لوگوں میں ایک عظیم شخصیت کی تصویر ہے۔اگرچہ وہ (علیؑ) عرب میں پیدا ہوئے مگر ان کی ذات صرف عرب کے لیے مختص نہ تھی۔اگرچہ ان کے فیض وکرم کے چشمے اسلام سے ابلے مگر ان کی ذات مسلمانوں تک محدود نہیں ہے۔اگر وہ صرف مسلمانوں کے لیے ہوتے تو ایک عیسائی جارج جرداق کے دل میں خود سے یہ خیال پیدا نہ ہوتا کہ ان کی زندگی کا جائزہ لے اور ان کے دلوں کو جیتنے والے فیصلوں ان کی بہادری کے شاندار کارناموں اور ان کی زندگی کے متاثر کن واقعات کا ایک شاعر کی طرح گن گائے۔علیؑ صرف میدان جنگ ہی کے سورما نہ تھے بلکہ کامل یقین ، بے لوثی، فصاحت بیان، عالی ظرفی، محتاجوں مفلسوں کی امداد اور حق کی تائید میں ان کا کوئی نظیر نہیں۔کوئی قابل اور صاحب قلم مؤرخ ہزاروں صفحات لکھ کر بھی مومنوں کے اس سردار کی تصویر پیش نہیں کر سکتا نہ ہی ان المناک واقعات کا احاطہ کر سکتا ہے جن کا ان کو سامنا کرنا پڑا۔اس بلند و بالا شخصیت کی جو تصویر بھی کوئی اہل قلم بنانے کی کوشش کرے گا وہ لامحالہ نامکمل ہوگی"

جارج سجعانی:

یہ بھی لبنان کے ایک عیسائی عرب عالم تھے۔انھوں نے لکھا ہے کہ "۹۴؍ ملکوں کے علماء نے مل کر امریکہ کی آزادی اور بھلائی کے لیے ایک منشور (Constitution) دیا تھا۔اگر اس کا مقابلہ اس فرمان سے کیا جائے جو چودہ سو سال پہلے مسافری کی حالت میں راستہ چلتے ہوئے اکیلے بغیر کسی کی شرکت اور مشورہ کے علیؑ نے اپنے ایک گورنر کو لکھوایا تھا تو ماننا پڑے گا کہ اس کی آج بھی کوئی برابری

نہیں کرسکتا''۔

سلیمان کتانی:

یہ بھی ایک عیسائی عرب عالم تھے۔ ان کی کتاب ''امام علیؑ منبع نور و عقل وقوت'' ۱۹۶۶ء میں طبع ہوئی جس کا انگریزی ترجمہ ایڈنبرا یونیورسٹی کے پروفیسر ''آئی کے ہاورڈ'' نے ۱۹۸۳ء میں کیا تھا۔ کتاب کیا ہے بس حضرت علیؑ کے تئیں عقیدتوں کا بحر بیکراں ہے۔ انھوں نے اپنی تصنیف کو محبان علیؑ کے نام اس طرح معنون کیا ہے:

''ان کے نام جو مولا علیؑ سے محبت کرتے ہیں جو ان کے مافوق الفطرت اوصاف کے سبب اور اس سبب سے کہ مولائے کائنات نے روح انسانی کے لیے حقیقت ابدی، دلوں کو مسخر کرنے والی نیکی اور حسن ازل کے مشاہدہ کے دروازے کھول دیئے''۔

یہاں ان کا پورا بیان ممکن نہیں بس دو چار باتیں:

کیا یہ سچ ہے میرے آقا کہ بار بار قریب آنے کے بعد بھی لوگ آپ کے متعلق متفق الخیال نہ ہو سکے۔ ان میں سے بعض نے آپ کو کھو دیا اور پھر نہ پا سکے۔ بعض نے آپ کو کھو دیا مگر بالآخر آپ کو پالیا۔ بعض نے آپ کو پایا مگر پھر کھو دیا۔ چودہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی آپ کے عظیم نام کا ایک حرف بھی محو نہ ہو سکا تو پھر ان لوگوں کے لیے یہ کیسے ممکن ہوا کہ آپ کو کھو دیں اور پھر نہ پا سکیں یا آپ کو پانے کے بعد کھو دیں۔ مولا اس وقت جو الفاظ آپ کی زبان سے نکلے تھے وہ چودہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی زمان و مکان کی قید میں نہ آ سکے۔ وجہ تو بس یہی ہے کہ آپ کے ارشادات زندگی کی حقیقتوں کو پانے کے لیے ذہنی اور عملی جد و جہد کے صحیح اقدار کی رہنمائی کے لیے مینارۂ نور بنے ہوئے ہیں۔ یہ ہماری کم عقلی کی دلیل ہے کہ ہم علیؑ جیسی ماورائے فہم شخصیت کو نامساعد حالات کے جال میں الجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرے آقا میں معافی کا خواستگار ہوں کہ آپ کی شایان شان کچھ کہنے کا حق ہرگز ادا

نہ کرسکوں گا کیوں کہ آپ منتخب روزگار ہستیوں میں بلند ترین اور تمام معاف کرنے والوں میں سب سے زیادہ کریم ہیں۔

کتنے افسوس کی بات ہے کہ غیر مسلموں کے دلوں میں تو حضرت علیؑ کی اس قدر معرفت ہو لیکن حضرت علیؑ کے زمانہ کا مسلمان ان سے اس قدر عداوت رکھے کہ ان کا حق غصب کرے۔ ان کے گلے میں ریسمان باندھے، ان سے بغاوت کر جنگ کرے اور سجدہ کی حالت میں ان کو قتل کر کے اسلام کو نقصان پہنچائے۔

مولا بہ معنی دوست؟

یہ واقعہ رسولؐ آخر کے حج آخر سے شروع ہوتا ہے۔ مکہ فتح ہو چکا ہے۔ رسولؐ اللہ نے عام معافی کا اعلان کر دیا ہے۔ ابوسفیان جیسا شخص لشکر اسلام کی ہیبت سے بادِل ناخواستہ کلمہ پڑھتا ہے۔ دنیاوی نقطۂ نظر سے بظاہر اسلام کو کہیں سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ رسولؐ کا اسلام پہنچانے کا کار رسالت تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔

اب رسولؐ اسلام حج کے لئے تشریف لے جاتے ہیں ۔اصحاب رسولؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی جوش اور ولولہ کے ساتھ مناسک حج بجا لانے کے لئے رسولؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہیں۔ ایسے میں اللہ کا حکم آتا ہے:

''فَاِذا فرغت فانصب والی ربك فارغب''(سورۃ نشرح آیت ۷ اور ۸) تو (اے رسولؐ) جب تم حج سے فارغ ہو جاؤ تو نصب (مقرر) کر دو اور پھر اپنے پروردگار کی طرف رغبت کرو۔

اس میں تین باتیں واضح ہیں

(۱) یہ حج رسولؐ اکرم کا آخری حج ہے

(۲) اب ان کی زندگی کے آخری ایام ہیں

(۳) لہٰذا دنیا سے پردہ کرنے سے پہلے اپنی جگہ کسی کو مقرر کر دیں تا کہ کار اسلام میں کوئی رکاوٹ نہ آئے۔

اس حکم سے ایک بات تو صاف ہے کہ پہلے انھیں حج کے ارکان کو پورا کرنا ہے اس کے بعد کسی کو مقرر کرنا ہے۔ اب مکہ سے واپسی کا وقت آن پہنچا۔ واپسی میں بھی مختلف جگھوں سے آنے والے رسولؐ کے ساتھ ہیں۔ اب ایسی جگہ آنے والی ہے

جہاں سے لوگ مختلف سمتوں کو روانہ ہو جائیں گے۔ ایسے میں پھر اللہ کا حکم زیادہ اصرار کے ساتھ آتا ہے:

یا ایھا الرسولؐ بلغ ما انزل الیک من ربک وَاِن لم تَفعَل فما بَلَّغت رِسالتہ و اللہ یَعصِمُک من الناس ان اللہ لا یھدی القوم الکافرین (سورۃ مائدہ آیت ۶۷ اور ۶۸)

یعنی اے رسولؐ جو حکم تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے پہنچادو (تبلیغ کرو) اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو (گویا) تم نے رسالت کا کوئی پیغام ہی نہیں پہنچایا۔ اور اللہ تم کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ اللہ کبھی قوم کافرین کی ہدایت نہیں کرتا۔ (منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا) اب اس حکم الٰہی کے مقصد کے سلسلہ میں بڑی موشگافیاں کی گئی ہیں جو توہین رسالت کے دائرہ میں آتی ہیں۔ ایک شاعر نے یہاں تک کہہ دیا کہ:

عہدہ عزیز ہے تو جھجک چھوڑئے رسولؐ
اللہ اپنی ضد پہ اڑا ہے غدیر میں

ان لوگوں کی تحریر سے تو ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے رسولؐ جان بوجھ کر اللہ کی حکم عدولی کر رہے تھے، اور نتیجہ میں اللہ کو دھمکی دینی پڑی۔ اسے معرفت رسولؐ کی کمی کے سوا کیا کہا جائے گا۔ ایک طرف تو قرآن اعلان کر رہا ہے کہ میرا رسولؐ کچھ بولتا ہی نہیں جب تک اس پر وحی نازل نہ ہو جائے اور دوسری طرف ہم یہ ثابت کرنا چاہ رہے ہیں کہ رسولؐ وحی نازل ہونے کے بعد بھی لوگوں کے ڈر سے اللہ کا حکم بجا نہیں لا رہے تھے۔ یا یوں کہیں کہ رسولؐ اپنے اللہ کی بات کو ہلکا جان کر نظر انداز کر رہے تھے یا یوں کہ خود رسولؐ بھی علیؑ کی ولایت کے بارے میں گومگو کی حالت میں تھے (معاذ اللہ) نہیں بالکل نہیں! یہ سب فضول کی باتیں ہیں۔ اگر ہم ایسا مانتے ہیں تو پھر ہم کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ معاذ اللہ رسولؐ اللہ، یتیموں پر قہر کرتے تھے اور مانگنے والے کو جھڑک دیتے تھے جس کی وجہ سے اللہ کو سورۃ ضحیٰ میں طعنہ دینا پڑا کہ کیا تم کو یتیم پا کر

پناہ نہ دی؟ اور تم کو ناواقف دیکھ کر تمہاری ہدایت نہ کرنی پڑی؟ اس لئے تم یتیموں پر قہر نہ کرنا اور مانگنے والے کو جھڑکی نہ دینا۔ اگر ہم ایسے قیاس کرتے رہے تو ہم میں اور غیروں میں کیا فرق رہ جائے گا۔ انھوں نے تو رسولؐ کی زبان پر شیطان کا قبضہ دکھا دیا کہ قرآن کی آیتوں کے بجائے رسولؐ کی زبان پر شیطان کے بتائے ہوئے کلمات جاری ہو گئے۔ (معاذ اللہ) اسی مہمل بات کو تسلیمہ نسرین نے اپنی کتاب ''دوی کھنڈِ تو'' میں رسولؐ کے خلاف ہتھیار بنایا ہے کہ یہ کیسا اللہ کا رسولؐ ہے جس کی زبان پر اللہ کے بجائے شیطان کے احکام جاری ہو رہے ہیں۔

لہٰذا ماننا پڑے گا کہ یہ جھجک نہیں تھی اور ہم ایسا کر کے علیؑ کا درجہ بلند نہیں کر رہے ہیں بلکہ مولا علیؑ کی دل آزاری کر رہے ہیں۔ دراصل آیۂ بلغ میں اللہ کے شدت کے ساتھ اصرار کا دو مقصد تھا۔

(۱) مسلمانوں پر یہ ثابت کرنا تھا کہ اعلانِ ولایت علیؑ کا کام دوسرے کارہائے رسالت سے بالاتر تھا۔ یا یوں کہیں کہ ولایت علیؑ مانے بغیر مسلمان کا اسلام نامکمل ہے۔

(۲) اس وقت کے مسلمانوں اور رہتی دنیا تک کے مسلمانوں کو بتا دینا تھا کہ اصحاب رسولؐ میں بہت سے لوگ علیؑ سے بغض رکھتے تھے اور اس عداوت میں اس حد تک آگے بڑھ گئے تھے کہ رسولؐ کی جان لینا بھی ان کے لئے کوئی خاص بات نہ تھی۔ اور یہی ہوا بھی کہ بعد میں ایک درّہ کے اوپر سے رسولؐ کی جان لینے کے لئے ایک چٹان لڑھکائی گئی۔

بہر حال اس حکم کے آنے کے بعد رسولؐ اسلام نے غدیر خم کے میدان میں قیام کیا۔ اذان میں حی علیٰ خیر العمل کا اعلان ہوا۔ جو آگے چلے گئے تھے ان کو واپس بلایا گیا جو ابھی دور تھے ان کا انتظار کیا گیا۔ وہاں کی چلچلاتی دھوپ میں لوگوں کو کھڑا کیا گیا۔ اونٹ کے کجاووں کا منبر بنایا گیا اور اس پر کھڑے ہو کر رسولؐ اللہ نے ایک طویل خطبہ دیا۔ اس کے بعد حضرت علیؑ کو ہاتھوں میں لے کر اٹھایا اور اعلان کیا:

من کنت مولا فھذا علی علیہ السلام مولا۔ یعنی میں جس کا مولا ہوں اس کے یہ علیؑ مولا ہیں۔ پھر دعا کی کہ اے اللہ علیؑ سے بغض رکھنے والوں سے تو بغض رکھ اور ان سے محبت رکھنے والوں سے تو محبت رکھ۔

اس کے بعد ہی سورۂ مائدہ کی آیت نمبر ۴ نازل ہوئی کہ:

"الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا" یعنی آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دیا ور دین اسلام سے راضی ہوا۔

اب کیا تھا مبارک باد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے حضرت عمر نے یہ کہہ کر مبارک باد دی کہ آج سے اے علیؑ تم ہمارے اور سب مومنین کے مولا ہو گئے۔ رسولؐ اللہ نے ایک خیمہ نصب کرا کر اس میں حضرت علیؑ کو بٹھایا اور تین دن تک صحابی وصحابیات نے جا جا کر حضرت علیؑ کی بیعت کی۔

اگر حکم غدیر کو مان لیا گیا ہوتا تو آج اسلام کا نقشہ کچھ اور ہوتا لیکن برا ہو نفس پرستی کا کہ رسولؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی تقریباً اکثریت نے اس حکم کو بھلا دیا کیوں کہ ثقیفہ میں بھی جہاں حضرت عمر نے کسی ترکیب سے حضرت ابو بکر کو خلیفہ بنوا دیا یہ جھگڑا تو ہو رہا تھا کہ خلیفہ مہاجر سے ہو یا انصار سے لیکن کسی نے بھی غدیر کے اعلان کو کوئی اہمیت نہ دی۔ حد یہ کہ رسولؐ اللہ کی میت دفن ہو جانے کے بعد تین دن تک حضرت علی نے گھر گھر جا کر اعلان غدیر کی یاد دلائی لیکن چالیس آدمی بھی آپ کی حمایت میں کھڑے نہ ہوئے، حکمِ رسالت کو پوری طرح بھلا دیا گیا۔

غدیر کا واقعہ اتنا اہم تھا کہ اگر اس کو مان لیا جاتا تو ثقیفہ میں بنائی گئی خلافت کے لئے کوئی جواز نہ رہتا اس لئے اس خلافت کو برحق ثابت کرنے کے لئے اہل سنت کے علماء نے پہلے تو واقعہ غدیر سے ہی انکار کیا لیکن چونکہ قدیم مؤرخین اس کو تفصیل سے لکھ چکے تھے اس لئے ان کا یہ حربہ کام نہ آیا۔ تب انھوں نے دوسرا طریقہ اپنایا اور اس خلافت کے دفاع میں مولا کے معنی ہی بدل دئے یعنی مولا کے معنی دوست کر دئے

ہوگا۔ آپ خود بتائیں کہ اس طبقہ کے عقیدہ والا نبی کیسا ہوگا کیوں کوئی اس کے نقش قدم پر چلے گا۔ لہٰذا اگر وہ حدیبیہ میں صلح کرے گا تو اس کی نبوت پر شک کیا جائے گا کہ کیوں اس کے لئے جان قربان کی جائے؟ اس لئے اگر احد میں اپنی جان کا خطرہ ہو تو فوراً چھوڑ کر بھاگنا بہتر ہوگا۔ وہ اگر جیش اسامہ میں جانے کو کہے گا تو اس کی بات کو ماننے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر وہ کچھ لکھنے کے لئے قلم دوات مانگتا ہے تو اس کی بات کو کیوں نہ ہذیان سمجھا جائے؟ وہ اگر متعہ کو حلال کرے گا تو حرام کیوں نہ قرار دیا جائے؟

دوسرا طبقہ بحمد اللہ محبان رسول کا طبقہ ہے وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عام انسان نہیں مانتا بلکہ تمام کمزوریوں سے پاک معصوم مانتا ہے، دنیا کی تمام مخلوق سے افضل مانتا ہے بلکہ انھیں نور اور اللہ کی پہلی تخلیق مانتا ہے اس طبقہ کو رسول کی ان حدیثوں پر یقین کامل ہے کہ:

(۱) اللہ نے سب سے پہلے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نور خلق کیا

(۲) وہ اس وقت بھی نبی تھے جب آدم مٹی اور پانی کے درمیان تھے۔ لہٰذا جب وہ حضرت آمنہ کی گود میں آئے تب بھی نبی تھے۔ چالیس سال بعد تو اس نبوت کا صرف اعلان کیا گیا۔ اس لئے اعلان سے پہلے بھی ان کا ہر کام نبوت کا کام تھا اور اعلان کے بعد بھی قرآن کے مطابق محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کچھ اور نہیں صرف اور صرف رسول تھے۔ وہ تو بولتے بھی نہیں تھے جب تک خدا کا حکم نہ آجاتا۔ (قرآن) اس لئے حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا، حضرت علیؑ اور حسنینؑ کے بارے میں ان کے ارشادات و اقدامات مطابق حکم خدا تھے۔ جبرئیل کی کیا مجال تھی کہ ان کے دل کو صاف کرتے انھوں نے تو حضرت محمدؐ تک خدا کا پیغام پہنچایا کہ آج اس آیت کو پڑھئے تو رسول نے وہ آیت پڑھی جب جب خدا کا حکم جس جس جگہ پر پڑھنے کے لئے آیا ویسے ویسے اور وہاں وہاں وہ پڑھتے رہے۔ ان کو معراج جسمانی ہوئی۔ مزید یہ کہ کسی بھی لمحہ نبی کی حکم عدولی کرنے والا خدا کا نافرمان بندہ کہلائے گا اور اسی کے مطابق اس کو سزا بھی ملے گی۔

اور اس پر اصرار کرنے کے لئے بڑی بڑی تاویلیں کی گئیں۔ یمن کے واقعہ کو اعلان غدیر کی وجہ بتایا گیا۔ اس طرح مولا والے اعلان کو خلافت کی بنیاد سے الگ کر دیا۔ اس مولا معنی دوست کو کہنے میں اتنی شدت پیدا کی گئی کہ اب ہر اہل سنت عالم مولا بہ معنی دوست ماننے اور منوانے پر مُصر ہے۔ مجھے تو حیرت اس وقت ہوئی جب علی گڑھ کے خسرو قاسم صاحب نے فضائل امیر المومنینؑ کے سلسلہ میں کئی کتابیں شائع کیں لیکن جہاں جہاں مولا لفظ آیا وہاں وہاں اس کے معنی انھوں نے دوست ہی لکھے ہیں۔ یہ ایک مثال یہاں اس لئے دی گئی کہ اہل سنت حضرات مولا کے معنی لکھتے وقت ثقیفہ والی خلافت کے دفاع کو ہمیشہ مدنظر رکھتے ہیں۔

اس سلسلہ میں مجھے مولا بہ معنی دوست نہ ہونے کی ایک منطقی مگر دل چسپ دلیل پڑھنے کو ملی۔ میرے حالیہ دورۂ ایران کے دوران ایک فارسی کتاب پڑھنے کو ملی۔ ایران کے شہر زاہدان کے ملا محمد شریف زاہدی سنی سے شیعہ ہو گئے اور انھوں نے ایک کتاب ''باید شیعہ شدم'' (یعنی مجھے شیعہ ہونا ہی تھا) لکھی ہے جس میں انھوں نے ایک دل چسپ واقعہ لکھا ہے۔ لکھتے ہیں کہ افغانستان کا ایک سنی عالم ان کا بہت پکا دوست تھا۔ وہ ان سے ملنے زاہدان آیا اس کے ان کے یہاں قیام کے دوران غدیر کا واقعہ چھڑ گیا۔ اس نے بھی مولا کا مطلب دوست بتایا۔ انھوں نے بہت سی دلیلیں دیں لیکن اس نے نہ مانیں اور اس بات پر اڑا رہا کہ غدیر میں علیؑ سے دوستی کا اعلان ہوا تھا۔ آخر میں کچھ دن رہ کر اسے گھر کی یاد آئی اور وہ افغانستان کے لئے روانہ ہو گیا۔ جب وہ گھر کے قریب پہنچ رہا تھا تو ملا محمد شریف نے اسے فون کیا کہ ایک بہت ضروری اور اہم بات اس سے کرنی ہے، وہ فوراً واپس آ جائے۔ افغانی دوست نے ان سے کہا کہ وہ اب گھر کے بالکل قریب پہنچ چکا ہے اور بعد میں کبھی آ جائے گا لیکن انھوں نے شدت سے اصرار کیا کہ وہ فوراً جہاں کہیں بھی پہنچا ہے وہاں سے میرے پاس پلٹ آئے۔ چونکہ دوستی پکی تھی اس لئے افغانی دوست نے گھر پہنچنے پر اپنے دوست کے پاس پہنچنے کو ترجیح دی اور زاہدی صاحب کے پاس آیا اور کہا کہ ایسی کیا بات تھی کہ جو بعد کے لئے ٹالی نہیں

جا سکتی تھی اور اس کے لئے مجھے جو گھر پہنچنے کے قریب تھا واپس بلا لیا۔
زاہدی صاحب نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ بات ایسی اہم تھی جو میں نے اتنا اصرار کیا۔ اس کے بعد جب دوست نے اسی اہم بات کے لئے دریافت کیا تو زاہدی صاحب نے کہا کہ میرے دوست میں نے آپ کو بس اس اہم بات کو کہنے کے لئے واپس بلایا ہے کہ ''میں آپ کو بہت دوست رکھتا ہوں'' یہ سن کر وہ افغانی دوست آگ بگولہ ہو گیا کہ عجیب بے وقوف آدمی ہو صرف اتنی سی بات بتانے کے لئے تم نے میرا سفر اور میرا وقت برباد کر دیا۔ یہ بات کبھی بعد میں بھی بتائی جا سکتی تھی۔ اس پر زاہدی صاحب نے کہا کہ میں نے تو صرف تمھیں واپس بلایا اور اس پر اسے بے وقوفی کا کام کہہ رہے ہو تو تمہارے حساب سے تو (معاذ اللہ) رسولؐ اللہ مجھ سے بھی بڑے بے وقوف تھے کہ غدیر سے دور چلے گئے مجمع کو صرف اس لئے واپس بلایا کہ یہ اعلان کر سکیں کہ ''جس کا میں دوست اس کے یہ علیؑ دوست ہیں'' تمھیں ماننا پڑے گا کہ رسول تو رسولؐ ہیں کوئی بھی عقل مند آدمی صرف دوستی کے اعلان کے لئے اتنا تام جھام نہ کریگا۔ زاہدی صاحب لکھتے ہیں کہ ان کا افغانی دوست یہ سن کر خاموش ہو گیا اور یہ مان گیا کہ غدیر میں اعلان مولا بہ معنی دوست کے نہ تھا۔
میں سمجھتا ہوں مولا کے معنی دوست سمجھنے والوں کے لئے یہ دلیل بہت کافی ہے۔ کتنا اچھا ہوتا کہ لوگ مولا کے معنی دوست ماننے کی ضد سے باز آ جاتے اور حضرت علیؑ کو مولا اولیٰ بالتصرف کے معنی میں مان لیتے جو الٰہی مقصد بھی تھا۔ اس طرح اسلامی اتحاد کی ایک نئی فضا پیدا ہوتی۔ اللہ سے دعا ہے کہ ہمیں محشر میں ہمارے مولا و آقا حضرت علیؑ کا ساتھ ملے تا کہ ہم سب کا انجام بخیر ہو۔ آمین

حضرت علیؑ اور جارج جرداق

جارج جرداق کا نام ادبی دنیا میں تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ جارج جرداق لبنان کے ایک عرب عیسائی اسکالر تھے۔ تھے اس لیے لکھ رہا ہوں کیوں کہ کچھ سال پہلے یعنی نومبر ۲۰۱۴ء کے دوسرے ہفتہ میں 118 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو چکا ہے اور دنیا ایک زبردست محب علیؑ سے محروم ہو چکی ہے۔ جارج جرداق (George Jurdac) عیسائی ہوتے ہوئے بھی حضرت علیؑ کے چاہنے والوں میں سے تھے۔ انھوں نے حضرت علیؑ پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن وہ سب سے زیادہ مشہور اپنی عربی کتاب (غالباً) صوت العدالت الانسانیہ کی وجہ سے ہوئے۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ "The Voice Of Human Justice" کے عنوان سے ہوا ہے۔ اس کتاب کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ خوش قسمتی سے اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے اور یہ کتاب "ندائے عدالت انسانی" کے عنوان سے لکھنؤ سے نکلنے والے ماہ نامہ اصلاح کے ذریعہ شائع ہو چکی ہے۔ مزید خوش قسمتی یہ کہ "ادارہ اصلاح" اپنے پرانے چھپ چکے کتابی سلسلے "نفس رسول نمبر" کی تمام جلدیں دوبارہ شائع کر رہا ہے اور اسی "نفس رسول" نمبر کی ایک جلد ندائے عدالت انسانی بھی ہے۔ یہ اللہ کا ہم سب پر کرم ہے کیوں کہ اردو میں یہ کتاب نایاب ہو چکی تھی۔ یہ وہی جارج جرداق ہیں جنھوں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ علیؑ کو انصاف کی انتہائی بلندی پر پہنچ جانے کی وجہ سے مسجد میں شہید کیا گیا تھا۔ جارج جرداق کی اسی شہرت کو دیکھتے ہوئے ایرانی مصنفین کے ایک گروپ نے جناب رضا امیر خانی کی سربراہی میں جارج جرداق کا

انٹرویو لیا تھا۔ یہ انٹرویو انگریزی میں تھا اور یہ پورا انٹرویو تہران (ایران) سے شائع ہونے والے انگریزی رسالہ ''Safinah'' (سفینہ) میں چھپا تھا اور اب میں اس کا اردو ترجمہ کر کے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

جارج جرداق کا مکان بیروت (Beirut) لبنان کے شمالی مغربی حصہ کے عیسائی علاقہ میں ''الحمراء'' ضلع میں ہے۔ لبنان کے بارے میں دل چسپ بات یہ ہے کہ ساٹھ لاکھ سے زیادہ آبادی والے اس ملک میں سرکاری طور پر اٹھارہ رجسٹرڈ مذاہب ہیں اور آپس میں اتحاد برقرار رکھنے کے لیے یہ طریقہ اپنایا گیا ہے کہ وزیر اعظم اہل سنت سے ہوگا، اسپیکر (پارلیمنٹ) شیعہ ہوگا اور صدر عیسائی ہوگا۔ رضا امیر خانی کہتے ہیں کہ میں ہمیشہ یہ سوچتا تھا کہ اتنا چھوٹا سا ملک کیسے ہمیشہ خبروں میں رہتا ہے اور تہذیب کے معاملے میں بہت زیادہ ترقی پر کیسے ہے۔ دوسری بات یہ کہ عرب ملک کی پہچان کے طور پر سوائے عربی زبان کے عرب ملکوں کی طرح ان کے عربی ہونے کی کوئی نشانی نہیں ہے۔ بات جارج جرداق کی ہو رہی تھی کہ ان کا مکان ایک متوسط طبقہ کے لوگوں کی طرح ایک پرانی سڑک پر ایک پرانی عمارت میں تھا۔ الحمراء ہاؤس تقریباً سو میٹر کا ایک فلیٹ تھا جو اخباروں میگزینوں اور چھوٹی چھوٹی کتابوں سے پٹا پڑا تھا۔ رضا امیر خانی کہتے ہیں کہ میں ہمیشہ یہ سوچتا تھا کہ ایک لبنانی شخصیت کیسی ہوتی ہوگی کیوں کہ یہ بہت ہی تعجب کی بات ہے کہ ایک ایسا مصنف جس کی ایک کتاب کی دس لاکھ کاپیاں بک گئی ہوں، وہ ایسی جگہ رہتا ہے۔

اسی تجسس کے ساتھ رضا امیر خانی نے جارج جرداق کا انٹرویو لینا شروع کیا۔

رضا امیر خانی: پہلے آپ کچھ اپنے بارے میں بتائیں۔

جارج جرداق: میں جنوبی لبنان میں مرجعیون'' (Marjaoon) گاؤں میں 1896ء میں پیدا ہوا تھا۔ یہ ایک ایسا گاؤں تھا جہاں ادب

(Literature) کے لئے رجحان ایسا ہی تھا جیسا دوسرے آس پاس کے گاؤں میں تھا۔لبنان میں گاؤں میں رہنا وفاداری کی علامت ہے۔ میرا گاؤں مرجعیون دو الفاظ مرج اور عُیون سے مل کر بنا ہے، جس کا مطلب ہے ''ایسی جگہ جس میں چشمے زمین سے نکلتے ہیں'' میرا گاؤں چشموں سے بھرا تھا اور میرا بچپن خوشی سے بھرا تھا۔ میں ہر روز اسکول سے بھاگ آتا تھا اور کسی نہ کسی چشمہ کے پاس پہنچ جاتا تھا۔اسکول کے پرنسپل اور ٹیچر ہمیشہ مجھ پر نظر رکھتے تھے اور میرے گھر والوں سے ہر روز میری شکایت کرتے تھے۔میرے گھر والوں میں صرف میرے بھائی فواد جرداق میرا ساتھ دیتے تھے۔

رضا امیر خانی: وہی مشہور فواد جرداق؟

جارج جرداق: ہاں میرے بڑے بھائی فواد جرداق ایک شاعر اور کتابوں کے بہت شوقین تھے اور ہمیشہ مطالعہ میں ڈوبے پڑے رہتے تھے۔ان کی وجہ سے مجھے کتابوں کے مطالعہ میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ جب کبھی میرے والدین سے ٹیچر یا اسکول کے پرنسپل نے میری شکایت کی تو میرے بھائی نے ہمیشہ میرا دفاع کیا اور مجھ سے کہا ''اسکول سے باہر تم زیادہ سیکھو گے''۔

اور یہ حقیقت بھی ہے کہ جب مجھے ادب سے دلچسپی پیدا ہوئی اور میں اس میں ڈوبا تو ایک دن انھوں نے مجھے ایک بھاری سی کتاب تحفہ میں دی اور کہا ''عربوں کا سارا ادب (Literature) اس کتاب میں سمویا ہوا ہے''۔

رضا امیر خانی: نہج البلاغہ؟

جارج جرداق: ہاں میں نے نہج البلاغہ اپنے ساتھ لی اور اسکول سے بھاگ کر ایک چشمہ کے پاس بیٹھ گیا۔ایک چٹان پر جھکتے ہوئے میں نہج البلاغہ میں ڈوب گیا۔

رضا امیر خانی: اسی لیے اس کتاب کے ذریعے آپ امام علیؑ کو جان پائے؟

جارج جرداق: نہیں! میں صرف امام علیؑ کی ادبی زبان کے طلسم میں جکڑ کر رہ گیا،

ان کی ہستی میں نہیں ۔ یہ مت بھولیئے کہ ہم عیسائی تھے اور ایک عیسائی گاؤں میں رہتے تھے ہم امام علیؑ میں بہت زیادہ دل چسپی نہیں رکھتے تھے، حالانکہ جب کبھی ہمارے یہاں مہمان آتے تھے تو میرے بھائی فواد امام علیؑ کی تعریف کرتے ہوئے کچھ اشعار پڑھتے تھے اور اس بات نے میری بہت مدد کی

رضا امیر خانی: پھر کس طرح آپ امام علیؑ کی بے داغ شخصیت کے قریب آئے؟

جارج جرداق: میں نے جب یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو میں نے عربی ادب اور عربی فلسفہ کو پڑھنا شروع کیا اور بعد میں وہیں پڑھانا بھی شروع کر دیا۔ ان دنوں علوم میں یعنی عربی ادب اور عربی فلسفہ میں میں نے امام علیؑ کو ایک عظیم شخصیت پایا میں نے پھر اس شخصیت پر گہرائی سے تحقیق کا مصمم اراوہ کرلیا۔ عغاد (Ighaad) اور طٰہ حسین سے لے کر شیعہ علماء تک کی کتابوں کو پڑھا۔ میں نے ہر اس کتاب یا مضمون کو پڑھا جس میں امام علیؑ کے بارے میں کچھ بھی لکھا تھا۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ ان سب میں ان کی ولایت و امامت اور ان کے حق پر ہونے کے بارے میں بحث کی گئی ہے اور ان کی عظیم شخصیت ان بحثوں میں کھوگئی ہے۔ یہ لوگ امام علیؑ کے نورانی چہرے کی نورانیت کو نہ سمجھنے کی قیمت پر خلافت کے مسئلے پر اٹک گئے۔ انھوں نے حضرت علیؑ کی حکومت کو تو دیکھا لیکن ان کے انسانی پہلو کو نظر انداز کر دیا۔ مجھے اطمینان نہیں ہوا اس لئے میں نے ان کی لاجواب شخصیت کا جائزہ لینا شروع کیا۔ میں مرجیعون کے چشمے کی طرف واپس آیا اور بچپن میں ملی نہج البلاغہ کو سامنے رکھا۔ اس طریقہ سے میں نے امام علیؑ کے بارے میں اپنی ساری کتابیں لکھیں۔

رضا امیر خانی: پروفیسر صاحب اپنی پہلی کتاب ''وائس آف ہیومن جسٹس'' Voice of human justice کے بارے میں کچھ بتایئے۔

جارج جرداق: آپ سوچتے ہوں گے کہ یہ کتاب مسلمانوں کی مدد سے چھپی ہے

لیکن یہ غلط ہے۔ جس وقت میں اس کتاب کو لکھ رہا تھا تبھی ''الرسالہ'' میگزین کے ایڈیٹر میرے پاس آئے اور مجھ سے اس کتاب کو انھیں دینے کو کہا تاکہ وہ اسے اپنے رسالہ میں قسط وار چھاپ سکیں۔ پہلے میں نے انکار کیا لیکن اس ایڈیٹر کے شوق کو دیکھتے ہوئے میں نے اس کی دو قسطیں انھیں دے دیں۔

ان دو قسطوں کے چھپنے کے بعد کرملیہ (Kirmiliyeh) قبیلہ کی میرونی شاخ کے عیسائی پادری اور راہب نے کہا کہ میں خود اس کتاب کو اپنے مالی ذرائع سے چھپواؤں گا۔ میں بہت خوش ہو گیا۔

رضا امیر خانی: تب مسلمانوں کو آپ کی کتاب کا پتہ چلا؟

جارج جرداق: نہیں اصل میں پہلے عیسائیوں کو اس کتاب کا پتہ چلا اور وہ بہت تعجب اور خوشی کے ساتھ میرے پاس آئے۔ انھوں نے کہا ''آپ نے عربوں کی عزت بڑھائی ہے''۔ انھوں نے اس کتاب کو چھپوانے کی رقم مجھے دینے کے لیے پیسے اکٹھا کیے۔ میں نے ان سے کہا ''میں نے یہ کتاب اپنے پیسے سے نہیں چھاپی ہے بلکہ کرملیہ کے راہبوں کے صدر نے خود اپنے طور پر چھپوائی ہے۔'' وہ لوگ وہاں کے پادریوں کے پاس گئے۔ انھوں نے کہا ''نہیں'' میں نے نہیں چھپوائی، چھپائی کے لیے رقم ان راہبوں نے اور پادریوں نے دی ہے جو یہاں عبادت کرتے ہیں۔ جایئے اور اپنی اکٹھا کی ہوئی رقم ان غریب لوگوں کو دے دیجیے، بہت بعد میں اس پادری نے مجھے بتایا، ''میں امام علیؑ سے محبت کرتا ہوں اور ان کی مہربانی سے ہمارے غریب لوگوں میں بھی خوش حالی آئی ہے۔''

رضا امیر خانی: آخر مسلمانوں نے بھی کچھ کیا یا نہیں؟

جارج جرداق: پہلے بغداد کے ایک اسکول کے مالک قاسم رجب نے یہ کتاب لی اور حضرت علیؑ کے روضہ پر لے گئے۔ ان کے بعد کچھ شیعہ بھائیوں نے بار بار یہ کتاب چھپوائی۔

رضا امیر خانی: کیا آپ خود بھی کبھی نجف گئے ہیں؟

جارج جرداق: نہیں، میں نجف نہیں گیا ہوں لیکن میں تقریر کرنے دو بار کربلا ضرور گیا ہوں۔ میں نے ان کے بیٹے امام حسینؑ کے روضہ کی زیارت کی ہے۔

اس کے بعد پروفیسر جارج جرداق نے کہا کہ انھوں نے پیرس (فرانس) کے ایک بک اسٹال سے پیغمبر اسلام کے بارے میں لی مارٹین Le Martin کی ایک کتاب لی۔ کتاب بہت پرانی اور قیمتی تھی۔ بدقسمتی سے مسلمان ان چیزوں کی تلاش میں نہیں رہتے۔ مثال کے طور پر کسی مسلمان نے ''علیؑ والصورۃ الفرانسیہ'' (علیؑ اور فرانس کا انقلاب) نامی کتاب کا فرنچ (فرانسیسی) زبان میں ترجمہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کیا اس کتاب کا فرنچ زبان میں ترجمہ کرنا علیؑ اور اسلام کی خدمت نہیں تھی؟ کیا عیسائیوں کو اس کتاب کا ترجمہ کرنا چاہیے؟ کتاب امام علیؑ اور عرب قومیت (Ali & Arab nationalism) پر تحقیق (ریسرچ) نہیں ہونی چاہیے؟ اس کتاب میں صاف طور پر بتایا گیا ہے کہ امام علیؑ نے کس طرح قومی مسئلہ کو اٹھاتے ہوئے بغیر قومیت پر زور دیے انسانیت کو سب سے اوپر رکھا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ امام علیؑ کا مقام عیسیٰؑ سے بھی اونچا ہے۔

میں اس عظیم انسانیت کی معراج پر پہنچی ہوئی شخصیت کی چکا چوندھ میں ڈوبا ہوا ہوں۔ ہم عیسائی ہیں اور قدرتی طور پر ہم امام علیؑ کی امامت میں یقین نہیں رکھتے (اور مجھے یعنی رضا امیر خانی کو تعجب ہے کہ کس طرح کا نہ ماننا ہے کہ انھوں نے کہیں بھی علیؑ کا نام بغیر امام لفظ جوڑے نہیں لیا ہے)۔ میں عیسائی گھرانے میں پلا بڑھا ہوں جو ان چیزوں پر یقین نہیں رکھتا لیکن میں آپ کو اپنی زندگی کی ایک کہانی سناتا ہوں۔ میرے والد ایک عمارتی مستری (معمار) تھے۔ وہ دوسرے گاؤں میں جا کر یہ کام کرتے تھے۔ انھوں نے گھر میں دو بڑے بڑے پتھر رکھے تھے اور ان پر دو سال تک کچھ کام کیا تھا۔ پھر ان پر کام پورا کرنے کے بعد ان دو پتھروں کو انھوں نے اپنے گھر کے

دروازے کے دونوں طرف لگا دیا تھا۔

رضا امیر خانی: اُن پر کیا لکھا تھا؟

جارج جرداق: (ہنستے ہوئے) ایک پتھر پر "**لا فتیٰ الاّ علیؑ**" اور دوسرے پر "**لا سیف الاّ ذوالفقار**" لکھا تھا۔

انٹرویو ختم

تبصرہ: یہ ہیں علیؑ۔ اس لیے اس بات پر کوئی تعجب نہیں ہے کہ وہ لوگ بھی جو اللہ میں یقین نہیں رکھتے، وہ بھی حضرت علیؑ کی فوٹو عزت کے ساتھ رکھتے ہیں۔ وہ ایف ڈی کرا کا جو انگریزی ہفتہ وار کرنٹ Current. کے ایڈیٹر تھے اور مذہباً پارسی تھے مگر ان کا اقرار تھا کہ نہ صرف حضرت علیؑ نے انھیں اپنا دیدار کرایا بلکہ ان کی مشکلوں میں مشکل کشائی کی۔ یہاں تک کہ نجف میں اپنے روضہ تک بلا لیا۔ (دیکھئے کرا کا کی کتاب۔ پھر حضرت علیؑ آئے)۔ اس میں بھی کوئی تعجب نہیں کہ مرونی (Maroni) کے گرجا گھر میں ایک دعا پڑھی جاتی ہے جس کے الفاظ کی اگر تھوڑی سی ترتیب بدل دی جائے تو یہ دعائے کمیل بن جائے گی۔ اس پر بھی کوئی تعجب نہیں کہ مائکل نعیمہ (Michael Naeema) نے جارج جرداق کی کتاب کے پیش لفظ میں حضرت علیؑ کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ پیغمبر کے بعد عرب کے زندہ لوگوں میں عظیم شخصیت کا ذکر ہے۔

کاش دنیا نے علیؑ کے مرتبہ کو پہچانا ہوتا۔

حضرت علیؑ علیہ السلام بطور حکمراں

جولوگ تاریخ سے رتّی بھر بھی دل چسپی رکھتے ہیں ان میں حضرت علیؑ کا نام تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ حضرت علیؑ جو رسول اسلام کے چچازاد بھائی، ان کی اکلوتی بیٹی کے شوہر اور اعلان غدیر کے بعد ہر اس شخص کے مولا تھے جس کے مولا رسول اللہ تھے۔ ان کے ذکر کے بغیر اسلامی تاریخ مکمل نہیں مانی جائے گی۔ رسول اسلام کی زندگی میں جو جہاد ہوئے اور جن میں حضرت علیؑ شریک ہوئے ان میں فتح کا سہرا حضرت علیؑ کے سر بندھا۔ کہا جاتا ہے کہ علم اور تلوار ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے لیکن حضرت علیؑ کی شخصیت اس سے مستثنیٰ تھی۔ جہاں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کے مطابق باب علم کہلائے وہیں جنگ کے میدان میں "لافتیٰ الاّ علی علیہ السلام" تھے۔

یہ تاریخ اسلام کا بہت بڑا المیہ ہے کہ رسول اسلام کی وفات کے بعد اس فاتح اور عالم کو نظر انداز کر دیا گیا۔ حدیث غدیر بھلا دی گئی، اور سازش کر کے خلافت میں بندر بانٹ ہوئی، مزہ یہ کہ رسول پر الزام رکھنے والوں نے خلافت کے معاملہ میں کوئی ایک اصول نہیں رکھا۔ چند آدمیوں کے اجتماع کو اجماع کا نام دے کر ثقیفہ بنی ساعدہ میں کعبہ کے پاس کئے جانے والے معاہدہ (کتاب سلیم بن قیس ہلالی) کے مطابق دوسرے نمبر پر پہلے سے طے خلیفہ حضرت عمر نے حضرت ابو بکر کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور انھیں پہلا خلیفہ بنا دیا۔ چونکہ حضرت عمر خلیفہ گر تھے اس لئے پہلی خلافت کے دور میں چلتی انھیں کی تھی۔ جیسا کہ پہلے سے طے تھا حضرت ابو بکر نے آخری وقت میں حضرت عمر کو دوسری خلافت کے لئے نامزد کر دیا۔ دوسرے نے بھی

(۳) آدم ان کے باپ تھے اور وہ بھی آدم کے باپ تھے آدم ان کے باپ اس لئے تھے کہ کہ وہ انسانی جسم میں آدم کی نسل میں تھے لیکن وہ آدم کے باپ اس لئے تھے کہ ان کی وجہ سے ہی آدم پیدا کئے گئے تھے اور مسجود ملائکہ بنے تھے۔

اب دونوں طبقوں کے عقیدہ کو پڑھئے اور نتیجہ خود نکالئے کہ آپ کی نظر میں آخری نبی پہلے طبقہ کے عقیدہ والا ہو سکتا ہے یا دوسرے طبقہ کے عقیدہ کے مطابق ۔اس تمہید کے بعد ہم اس عقیدہ کے سلسلے میں کہ نور محمدی ہی تخلیق اول تھا تفصیل میں جانا چاہیں گے۔ ہم اپنی کتابوں سے جو کچھ لکھیں گے وہ ہمارا عقیدہ کہلائے گا لیکن اگر ہم دوسرے مذاہب کی کتابوں سے یہ بات ثابت کریں تو یہ ہمارے لئے دلیل ہوگی جس سے ہمارا عقیدہ اور پختہ ہوگا۔

ہندو مذہب کی قدیمی کتاب وید اور ان کی تفسیریں دیکھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ تخلیق اول نور تھی، وید چونکہ سنسکرت زبان میں ہیں اور اس زبان کی مجبوری یہ ہے کہ اس میں نور کے لئے کوئی مناسب لفظ نہیں ہے۔انھوں نے اس کے لئے ہر جگہ اگنی (अग्नि) لفظ کا استعمال کیا ہے جو عام طور پر آگ کے معنی میں لیا جاتا ہے۔انھوں نے اللہ کو بھی اگنی کہا ہے اس کے معنی اگر نور لے لیا جائے تو یہ بات مطابق قرآن ہو جائے گی کہ اللہ بھی ایک نور ہے۔ رِگ وید کا پہلا منتر اگنی کی حمد وثنا سے شروع ہوتا ہے۔ پہلے منتر میں ہے کہ ساری عبادتیں اور تعریفیں اگنی کے لئے ہیں'' ظاہر ہے کہ یہاں اگنی سے مراد خدا ہے۔لفظ اگنی کے معنی ''اگرنی'' (अग्रणी) کے لئے گئے ہیں یعنی جس سے پہلے کوئی نہ ہو لیکن اسی لفظ اگنی کو ویدوں نے تخلیق اول کے لئے بھی استعمال کیا ہے، یعنی ایک اگنی نے دوسری اگنی کو پیدا کیا۔رِگ وید ۲:۱۲:۱ میں ہے کہ اگنی (خدا) جس نے اگنی (تخلیق اول) کو پیدا کیا وہ تمام عالمین کا رب اور عبادت کے لائق ہے''۔رگ وید میں ہی ۶:۱۲:۱ میں ہے کہ ''ذہین، گرہوں کی حفاظت کرنے والے اور نورانی چہرے والے اگنی (تخلیق اول) اگنی (خدا) سے پیدا

اس بات کا دھیان رکھا کہ حضرت علیؑ خلیفہ نہ ہونے پائیں اس لئے انھوں نے اپنے آخری وقت میں شوریٰ کا ڈرامہ رچا جس میں حضرت علیؑ کو چھوڑ کر سب ان کے آدمی تھے۔ انجام پہلے سے طے تھا اور حضرت عثمان تیسرے خلیفہ بن گئے۔ دراصل یہ سب خلافت رسول نہ تھی بلکہ حکمرانی تھی اور ہر حکمراں اپنے اپنے طریقے پر اسلام کی روح کو نقصان پہنچاتا رہا۔ پھر حالات نے کروٹ لی۔ تیسرے خلیفہ کے خلاف بغاوت ہوگئی اور انھیں قتل کر دیا گیا۔ اب وہاں کے مسلمان بغیر کسی خلیفہ کے تھے۔ بہت دنوں بعد عقل آئی اور مدینہ کے صحابہ نے حضرت علیؑ کے گھر پر ہجوم کیا کہ اب وہ خلیفہ ہو جائیں۔ اس میں مصر اور کوفہ سے آئے ہوئے حضرات بھی شامل تھے۔ دو دن تک حضرت علیؑ نے انکار کیا آخر تیسرے دن اس شرط پر قبول کیا کہ وہ صرف قرآن وسنت کے مطابق حکومت کریں گے۔ معاملہ ختم ہو جانا چاہئے تھا لیکن ثقیفائیوں کی بچی کھچی شخصیتوں نے پھر سازش کی اور حضرت علیؑ کو جنگوں میں الجھا دیا جو ان کی شہادت تک جاری رہا مگر اسکے باوجود حضرت علیؑ نے اپنے دور میں روح اسلام کو زندہ کیا۔

سب سے پہلا کام جو حضرت علیؑ نے کیا وہ اپنے دائرۂ حکومت کو منظم کرنا تھا۔ لوگوں کے شعور کو بیدار کرنے کے لئے انھوں نے ایک مرکزی محکمہ بنایا جس کے تحت لوگوں کو قرآن کی صحیح قرأت، حساب، انجینئرنگ، علم فلکیات، ادب، منطق، اور طریقۂ نظم ونسق کی ٹریننگ دی جاتی تھی۔

مندرجہ بالا باتوں میں انھوں نے طریقہ نظم ونسق (Administration) پر اپنی پوری توجہ مرکوز کی۔ انھوں نے مملکت چلانے کے لئے ملازمتوں کو پانچ شعبوں میں بانٹا۔

(۱) محکمہ مالیات

(۲) فوج

(۳) مرکزی دفتر معتمدین (Secretariat)

(۴) عدلیہ (Judiciary)

(۵) صوبائی دفاتر

مالیات

یہ محکمہ دو ضمنی شعبوں میں بنٹا تھا۔ شعبۂ وصولی، شعبۂ تقسیم۔

شعبۂ وصولی

یہ شعبہ ٹیکسوں کی وصولی کے لئے تھا۔ حضرت علیؑ نے صرف تین ٹیکس کی وصولی کا حکم جاری کیا تھا، وہ تھے۔

(۱) زمین کی مال گزاری:

یہ ٹیکس عموماً سونے اور چاندی کے سکّوں یا سونے چاندی کے ڈلوں یا اینٹوں کی شکل میں لیا جاتا تھا۔ وصولیٔ مال گزاری مرکزی حکومت کے افسران کرتے تھے لیکن صوبائی گورنروں کو بھی یہ اختیار دیا گیا تھا کہ ہنگامی معاملات میں اپنے یہاں سے اس کام کے لئے افسر مقرر کریں۔

(۲) زکوٰۃ اور صدقہ:

یہ ٹیکس عموماً اشیاء میں یا جانوروں کی شکل میں وصول کیا جاتا تھا لیکن یہ کام حضرت علیؑ کے ذریعہ براہ راست مقرر کئے گئے ایمان دار اور متقی افسران کے ذریعہ کیا جاتا تھا جن کے حرکات واطوار پر وہ خود نظر رکھتے تھے۔

(۳) جزیہ:

یہ ٹیکس غیر مسلموں سے زکوٰۃ اور دوسرے اسلامی ٹیکسوں کے بدلہ میں لیا جاتا تھا اور اس کے عوض میں ان کے جان و مال کی حفاظت کی گارنٹی تھی اور انھیں تمام سہولتیں دی جاتی تھیں۔ کوئی بھی اسلامی ٹیکس ان سے نہیں لیا جاتا تھا۔ اس میں بھی

ایک چھوٹ تھی وہ یہ کہ جزیہ ۵۰ سال سے اوپر یا ۲۰ سال سے نیچے کی عمر والوں ،عورتوں ،مفلوجوں ،معذوروں ،اندھوں اور پاگلوں سے نہیں لیا جاتا تھا۔

شعبۂ تقسیم: عوامی مال کی تقسیم حضرت علیؑ کے لئے ایک اہم مسئلہ کی حیثیت رکھتی تھی۔وہ چاہتے تھے کہ اسلامی شریعت کے مطابق اس مال کی منصفانہ تقسیم ہو۔اس کے لئے انھوں نے محکمۂ خزانہ اور حساب کی تنظیم نو کی اور بے ایمان افسروں کو ہٹا دیا۔وہ اس کام کے لئے اتنے مخلص تھے کہ دارالحکومت میں انھوں نے خود عوامی مال کی تقسیم کی نگرانی کی۔جب بیت المال خالی ہو جاتا تھا تو وہ وہاں شکرانے کی نماز پڑھتے تھے۔وہ پہلے حکمراں تھے جنھوں نے مال کی وصولی اور تقسیم کے لئے بجٹ سسٹم بنایا تھا۔ہر ایک صوبہ کو اپنا سالانہ بجٹ منظوری کے لئے پیش کرنا پڑتا تھا ۔زکوٰۃ وصدقہ سے ہونے والی آمدنی مرکز کے لئے تھی اور مال گزاری اور جزیہ کی آمدنی کی تقسیم صوبہ کے ذمہ تھی۔

زکوٰۃ اور صدقہ سے ہونے والی آمدنی محکمۂ وصولی اور تقسیم کو چلانے ،عطیات ،غریبوں ،مفلسوں ،یتیموں ،عمر رسیدہ لوگوں اور معذور اشخاص کی مدد ،رضا کارانہ طور پر جنگ میں شامل ہونے والوں کو اعزازیہ ،فوج کے افسران اور سپاہیوں کی بیوہ عورتوں اور ان کے یتیموں کو پنشن (وظیفہ) دینے ،غلاموں کو لے کر انھیں آزاد کرانے ،سرکاری قرضوں کی بھرپائی اور بھٹکنے والے حاجیوں کی مدد کرنے کے کام آتی تھی۔جزیہ کی آمدنی فوج رکھنے ،قلعہ ،سڑکیں ،پل بنانے ،کنوئیں کھودنے اور سرائے بنانے اور انھیں قائم رکھنے کے کام آتی تھی۔

مال گزاری کی آمدنی بقیہ تمام کاموں میں صرف ہوتی تھی ،لیکن مال گزاری کے معاملے میں حضرت علیؑ نے مال گزاری سے زیادہ ٹیکس دینے والوں کو اہمیت دی تھی۔انھوں نے اپنے ایک گورنر کو ہدایت کی تھی کہ مال گزاری وصولتے وقت ٹیکس

دینے والوں کی فلاح مدنظر رکھنی چاہئے کیوں کہ وہ ٹیکس سے زیادہ اہم ہے۔ٹیکس دینے کی لوگوں کی استطاعت اور زمین کی زرخیزی پر منحصر ہے اس لئے زمین کو زرخیز بنانے پر زیادہ دھیان دینا چاہیے تا کہ لوگ خوش حال ہوں اور وہ ٹیکس دے سکیں۔

فوج

حضرت علیؑ ایک پیدائشی مجاہد تھے اور انھوں نے اپنے بچپن میں بھی رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت کی تھی۔ یہ ان کی بہادری اور جاں بازی تھی جس کی وجہ سے ابتدائے اسلام میں اسلام کو کامیابی ملی۔

انھوں نے اسی جاں بازی کی توقع ہر مسلمان سے رکھی اور اسی لئے قومی خزانہ کی سب سے پہلی ذمہ داری فوج پر دھیان دینا تھا۔ ہر سپاہی اللہ اور دین کی خدمت کے لئے تھا۔فوج کے لئے ان کے سخت احکام یہ تھے کہ ہمیشہ خدا کا خوف رکھو، کسی بھی آدمی کو مت مارو سوائے اس کے کہ دفاع میں یہ قدم اٹھانا پڑے، حملہ کے دوران جو بھاگ جاتے ہیں ان دشمنوں کا پیچھا نہ کرو اور بھاگنے والوں کو قتل نہ کرو۔ جو لوگ تم سے رحم اور زندگی کی بھیک مانگ رہے ہوں انھیں نہ مارو۔عورتوں کو بے عزت نہ کرو۔ بوڑھوں اور بچوں کو کوئی نقصان نہ پہنچاؤ۔انھوں نے ایک مستعد اور متحرک فوج رکھنے کو ترجیح دی۔

مرکزی دفتر معتمدین (Secretariat)

حضرت علیؑ نے خود مرکز میں سارے محکمے قائم کئے تھے جو مرکز کے علاوہ صوبائی محکموں کی نگرانی کرتے تھے اور یہ مرکز خود حضرت علیؑ کے ذریعہ کنٹرول کیا جاتا تھا۔

عدلیہ (Judiciary)

حضرت علیؑ کا نظریہ اس معاملے میں بالکل واضح تھا کہ اچھے فیصلے کے لئے جج کو غیر جانب دار اور آزاد ہونا چاہئے۔ اس پر کسی کا دباؤ نہیں ہونا چاہئے۔عدالت

میں خود خلیفہ کو برتری حاصل نہیں تھی۔ حضرت علیؑ نے ججوں کے سلسلے میں کچھ رہنما اصول بنائے تھے وہ یہ ہیں۔

(۱) اسلامی شریعت میں ماہر لوگوں کو ہی جج بنانا چاہیئے۔ اسے قرآن وحدیث کا کافی علم ہونا چاہیئے، اس کے علاوہ جج کو دوسرے مذاہب کے قوانین معلوم ہونے چاہیئے تاکہ غیر مسلم کے معاملہ میں فیصلہ ان کی شریعت کے مطابق کیا جائے۔

(۲) جج ایک حیثیت اور رتبہ کا مالک ہو۔

(۳) اسے جلد غصہ آنے والا یا بے صبر نہیں ہونا چاہیئے

(۴) اگر کسی مرحلہ پر جج یہ محسوس کرتا ہے کہ اس نے غلط فیصلہ دیا ہے تو اس پر اٹل نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اس سے ہوئی بے انصافی کا تدارک کرنا چاہیئے۔

(۵) جج کو مقدمہ کی گہرائی میں جانا چاہیئے اور جلد فیصلہ دینا چاہیئے اور مقدمہ کو غیر ضروری طور پر طول نہیں دینا چاہیئے۔

(۶) جج کو غیر جانب دار ہونا چاہیئے اور کسی کی بھی کسی سفارش کو اہمیت نہیں دینی چاہیئے۔

(۷) جج کی تنخواہ اتنی مقرر کرنی چاہیئے جس سے وہ رشوت یا عطیہ کے لالچ میں نہ آئے۔

(۸) خلیفہ کی حیثیت سپریم کورٹ یا عدالت عالیہ کی ہوگی، جس کا فیصلہ آخری ہوگا۔

صوبائی دفاتر

صوبائی دفاتر کا سربراہ گورنر ہوتا تھا جو خلیفہ کو جواب دہ ہوتا تھا۔ حضرت علیؑ نے اچھی حکمرانی کے لئے اپنے گورنروں کو کچھ رہنما ہدایات دی تھیں۔ ہدایات تو بہت ہیں لیکن ہندوستان کے حالات کے مطابق یہاں جو ہدایات لاگو ہو سکتی ہیں وہ یہاں دی جا رہی ہیں جس سے حضرت علیؑ کے طریقۂ حکمرانی کا ہلکا سا اندازہ ہو سکے گا۔

(۱) تم اپنی رعایا کے لئے سخت مگر مہربان رہو۔

(۲) مسلمان اور غیر مسلم کے ساتھ ایک سا برتاؤ ہونا چاہئے۔ جہاں مسلمان آپ کے بھائی ہیں وہیں انسان ہونے کے ناطے غیر مسلم آپ جیسے ہیں۔

(۳) حکمرانی میں غصہ اور بدلہ لینے کی خواہش سے کوئی فائدہ نہیں پہنچنے والا۔

(۴) طرف داری اور اقربا پروری کو اپنی حکومت میں کوئی جگہ نہ دو اس سے اللہ کے حکم کی خلاف ورزی ہوگی اور مستحق کی حق تلفی ہوگی۔ اس سے ظلم و جبر میں اضافہ ہوگا۔

(۵) اپنے علاقہ کے رئیس لوگوں کی دعوتوں میں شریک نہ ہونا کیوں کہ اس سے غریبوں میں غلط پیغام جائے گا۔ تمہارا مقدس فرض غریبوں، معذوروں اور یتیموں کی نگہداشت کرنا ہے، ان کی مدد کرو، ان کی حفاظت کرو اور ایسا ماحول پیدا کرو کہ جب بھی انھیں مدد کی ضرورت ہو وہ بے جھجھک تم سے رابطہ قائم کریں۔

(٦) ایمان دار اور مہربان افسروں کا تقرر کرو نہ کہ جابر افسروں کا۔

(۷) اپنے افسروں کو اتنی تنخواہ دو کہ رشوت خوری اور غبن کی طرف مائل نہ ہوں۔

(۸) کسان مملکت کے لئے سرمایہ ہیں اور ان کی سرمایہ کی طرح حفاظت کرو۔ وغیرہ وغیرہ

یہ بھی تاریخ کا ایک المیہ ہے کہ حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد کسی بھی حکمراں نے ان ہدایتوں پر عمل نہیں کیا جس سے غریب اور امیر کے بیچ کی دوری بڑھتی گئی۔

حضرت علیؑ کو سچا خراج عقیدت یہ ہوگا کہ حکمراں ان کے بتائے ہوئے راستہ پر چلیں جو وقت کی ضرورت ہے۔

اقوام متحدہ نے حضرت علیؑ کی حکمرانی کو مثالی نمونہ قرار دیدیا۔ دوست داران حضرت علیؑ کے لئے خوش خبری یہ ہے کہ جن حضرت علیؑ کو سواد اعظم ایک ناکام حکمراں جتانے پر تلا ہے۔ اقوام متحدہ (.U.N.O) نے حضرت علیؑ کو ایک مثالی حکمراں مانا ہے۔ اقوام متحدہ کے ایک شعبہ اقوام متحدہ ترقیاتی پروگرام (.U.N.D.P) نے ۲۰۰۲ء میں عربوں پر ایک ریسرچ کی تھی اور اسی کے تحت اپنی عرب انسانی ترقیاتی

رپورٹ Arab Human Resource Development Report میں حضرت علیؑ کے چھ اقوال جو مثالی حکومت کے لئے ضروری ہیں انھیں شامل کیا ہے اور اسے دنیا کی تمام حکومتوں میں تقسیم کیا ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ عرب کے تمام علاقائی ممالک جمہوریت، وسیع سیاسی نمائندگی، عورتوں کی شمولیت، ترقی اور علم و دانش کے معاملے میں دوسرے ملکوں سے بہت پیچھے ہیں۔ اقوام متحدہ نے عرب ممالک کو مشورہ دیا ہے کہ وہ عدل، جمہوریت، علم و دانش کی حوصلہ افزائی پر مشتمل حکومت قائم کرنے میں امام علیؑ ابن ابی طالبؑ کی مثال کو اپنے سامنے رکھیں۔

حضرت علیؑ کے جو چھ اقوال مندرجہ بالا رپورٹ میں شامل کئے گئے ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) وہ جس نے اپنے کو لوگوں کا امام (حکمراں) مقرر کیا ہے اسے دوسروں کو سبق دینے سے پہلے خود اس پر عمل کرنا چاہئے۔ خالی الفاظ سے کام نہیں چلے گا بلکہ اس کو اپنے کو ایک مثال کے طور پر پیش کرنے کے بعد دوسروں کی ہدایت کرنی چاہئے کیوں کہ جو پہلے خود اس نصیحت پر چلتا ہے وہ زیادہ عزت کا اہل ہے بہ نسبت اس کے کہ جو صرف دوسروں کو تعلیم و تربیت دیتا ہے۔

(۲) تمہاری فکر زرعی زمین کو زیادہ زرخیز بنانے کے سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ ہونا چاہئے بہ نسبت اس کے کہ تم ٹیکس وصولنے کی زیادہ فکر کرو کیوں کہ ٹیکس کی وصولی زیادہ پیداوار پر منحصر ہے۔ برخلاف اسکے جو زمین کو زرخیز بنائے بغیر ٹیکس وصول کرنا چاہتا ہے وہ ملک اور عوام کو برباد کرتا ہے۔

(۳) اپنے ملک کے مسائل کو حل کرنے اور لوگوں کو راست بازی پر چلانے کے سلسلہ میں تعلیم یافتہ اور عقل مند لوگوں کی صحبت اختیار کرو۔

(۴) طریقۂ حکمرانی پر خاموش رہنے اور بے خبری کی حالت میں بولنے سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہونے والا ہے۔

(۵) راست باز لوگ با صلاحیت ہیں جن کی منطق بالکل سیدھی اور سچی ہے جن کے لباس نمائشی نہیں ہیں، جن کا راستہ معتدل ہے، جن کے عمل متفرق ہیں اور جو پریشانیوں سے نہیں گھبراتے۔

(٦) اپنے لوگوں کے درمیان سے بہترین لوگوں کو چنو جو عوام میں صحیح عدل قائم کر سکیں۔ ایسے لوگوں کو چنو جو آسانی سے پست نہ ہو جائیں، جو دشمنی ہو جانے سے نہ ڈریں، جو غلط کام ہو جانے پر اس پر اصرار نہ کریں اور غلط کو صحیح کرنے میں نہ جھکیں، وہ جس کے دل میں کوئی لالچ نہ ہو وہ جو پوری بات سمجھے بغیر معمولی تشریح سے مطمئن نہ ہو، وہ جو شک پیدا کئے جانے پر بھی ثابت قدم رہے، وہ جو اپنے مخالف کو درست کرنے میں رتی بھر بے تاب نہ ہو، سچائی کی پیروی کرنے میں مستقل مزاج ہو، فیصلے کے بعد سزا دینے میں سخت ہو، وہ جو چاپلوسی سے متاثر نہ ہو اور رجھانے سے نہ بہکے اور یہ تمام ہدایتوں میں سے کچھ ہیں۔ کاش اقوام متحدہ کا یہ تجزیہ لوگوں کی آنکھ کھولے۔

پھر حضرت علیؑ آئے

ایک زمانہ میں بمبئی سے دو انگریزی ہفتہ وار نکلتے تھے۔ایک تو بلٹز (Blitz) جس کے ایڈیٹر آر کے کرنجیا تھے اور دوسرا تھا کرنٹ (Current) جس کے ایڈیٹر ڈی ایف کراکا (D.F.Karaka) تھے۔دونوں ہی پارسی تھے۔دونوں ہی ہفتہ وار اب بند ہو چکے ہیں اور ان دونوں حضرات کا انتقال ہو چکا ہے۔ان میں سے ڈی ایف کراکا نے اپنی سوانح حیات لکھی جو انگریزی میں تھی اور 1972 میں چھپی۔اس میں ایک باب ہے جس کا عنوان ہی ''Then Came Hazrat Ali'' یعنی ''پھر حضرت علیؑ آئے''۔یہ باب وہ ہے جس میں انھوں نے وہ واقعات لکھے ہیں جو حضرت علیؑ سے متعلق انھیں پیش آئے۔کراکا کو مذہب سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اس لئے جب یہ باب لوگوں کی نظروں سے گزرا تو انھیں بہت حیرانی ہوئی۔ٹائمس آف انڈیا کے ایڈیٹر خشونت سنگھ نے لکھا کہ ''یہ ایک ایسے شخص نے لکھا ہے جس پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے''۔اس باب کا اردو ترجمہ ہو چکا ہے اور کتاب ''پھر حضرت علیؑ آئے'' کے نام سے چھپ چکی ہے۔ہندوستان میں اسے نظامی پریس بک ڈپو، لکھنؤ نے چھاپا ہے اور یہ کتاب ان کے یہاں دستیاب ہے ہم عام لوگوں کی جانکاری کے لئے کہ کراکا پر کیا گزری تھی، خاص باتیں لکھ رہے ہیں۔

کراکا لکھتے ہیں کہ ''میری ماں کی ایک سہیلی ایک پابند مذہب پارسی خاتون (جس کا نام سونا مائی تھا) تھیں۔میں نے 1949 میں ''کرنٹ'' نکالنا شروع کیا تو پریشان تھا۔اسی دوران مجھے سونا مائی کے ذریعہ گجراتی زبان میں ایک پیغام ملا جس کا

آخری جملہ یہ تھا کہ ''میں ہمیشہ تمہاری مدد پر مستعد ہوں تم ہمت پیدا کرو'' میں نے جب سونا مائی سے پوچھا کہ یہ پیغام کس نے بھیجا تھا؟ تو انھوں نے بتایا کہ یہ ''باوا'' کی طرف سے تھا۔ میں حیران تھا کہ یہ ''باوا'' کون ہیں؟ اس پیغام کے پانچ سال بعد ایک خواب دیکھنے کے بعد یہ راز کھلا کہ وہ ''باوا'' حضرت علیؑ تھے۔

اس خواب کے بارے میں کراکا لکھتے ہیں کہ 6 اپریل 1954 کی صبح انھوں نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ وہ کہتے ہیں کہ ''میں خواب کی حالت میں خود کو ایک دوست کے ساتھ ایک تنگ گلی میں چلتا پا رہا تھا۔ اس گلی میں بڑے غریب لوگ چل پھر رہے تھے۔ وہ لوگ اسی ایک سمت کی طرف چل رہے تھے جدھر ہم جا رہے تھے۔ یہ بات کہ وہ بہت غریب تھے' ان کے کھردرے' ملگجے کپڑوں سے عیاں تھی جو وہ پہنے ہوئے تھے۔ اس کے بعد ہمیں احساس ہوا کہ کوئی اہم شخصیت ہمارے پیچھے آ رہی تھی۔ مجمع میں ایک طرح کا ہلکا شور تھا۔ وہاں دھکّم دھکّا تھا۔ ہم دونوں ایک طرف ہو گئے تاکہ ہم پیچھے آنے والے شخص کو راستہ دے دیں تاکہ وہ گزر جائے۔ خواب کے اس موڑ پر میرا دوست غائب ہو گیا۔ میری توجہ پیش منظر کی طرف مبذول ہو گئی۔ مجھ سے آگے ہر شخص عبادت میں جھکا ہوا تھا۔ جونہی یہ آدمی نزدیک آیا، لوگوں نے اس کی ایک بشر سے زیادہ تعظیم کی۔ اجسام کا ایک سمندر تھا جو گھٹنوں کے بل جھکا ہوا خشوع میں جسم دوہرا ہو کر سرنگوں تھا۔ ان کی پیشانیاں بھوری مٹی کو چھو رہی تھیں۔

یکایک روشنی کی ایک شعاع اس سربسجود مجمع پر پڑی گویا آسمان شگافتہ ہو گیا تھا تاکہ یہ روشنی گزر جائے۔ وہ روشنی تیز تر ہوتی گئی اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ روشنی جھکے ہوئے اجسام پر گردش کرنے لگی۔ جیسے جیسے روشنی گھومتی اجسام لرزنے لگتے۔ ایک لمحے کے بعد میں نے ان آدمیوں کی، جو زمین پر سکڑے سمٹے پڑے تھے، گہری، اثر انگیز ٹھنڈی آہیں سنیں اور بعد میں ایسے الفاظ سنے جو میں نے پہلے کبھی نہیں سنے تھے۔ وہ الفاظ تھے ''حضرت علیؑ۔ حضرت علیؑ۔'' ان کی گہری آہیں

اور روشن ہیں ۔ان دونوں اگنی کے بارے میں شت پت برہمن کے اشلوک ۲۱:۲:۵:۷ میں واضح کیا گیا ہے کہ ''اگنی جو کہ اگنی سے پیدا ہوا کیوں کہ بلاشبہ اگنی (خدا) نے ہی اگنی کو پیدا کیا۔اس کی وضاحت خود رگ وید کرتا ہے۔رگ وید کے مطابق منتر ۵، ۱۲۹:۴:۱۰ر میں ہے کہ ''اس برہم (ब्रह्म) نے سب سے پہلے کائنات کی تخلیق کا ارادہ کیا اور اس کے لئے اسی ایک نے اپنی مَنَن شکتی (मनन शक्ति) یا ''کُن'' سے نہ ظاہر ہونے والی چیز کی تخلیق کی اس طرح آدی پرش (आदि पुरुष) ''تخلیق اول'' کی تخلیق ہوئی''۔

ویدوں نے سب سے پہلے جس وجود کا ذکر کیا ہے وہ تین ہیں :۔

(۱) پر برہم (परब्रह्म) وہ جو ہمیشہ سے ہے جس سے پہلے کچھ بھی نہ تھا یعنی خدا

(۲) پہلی روح یا آدی پرش (आदि पुरुष) پر برہم کی سب سے پہلی تخلیق جو اس کی تخلیق سے پہلے پر برہم کا ارادہ تھی جسے اس نے مَنن شکتی (मनन शक्ति) یا کن سے پیدا کیا۔ یہ تخلیق پر برہم کی صفات کا مظہر تھی اسی کو پر برہم نے تخلیق کائنات کا ذریعہ بنایا۔

(۳) پہلا انسان ۔زمین پر پہلا انسان جس سے نسل انسانی چلی یعنی حضرت آدمؑ۔

آپ خود دیکھ رہے ہیں کہ وید پکار کر کہہ رہے ہیں کہ تخلیق اول اگنی یا نور تھی جسے اللہ نے اپنے ارادہ سے پیدا کیا۔

اب اسی تخلیق اول اگنی کے بارے میں رگ وید اور وضاحت کرتا ہے رگ وید کے منتر ۱:۴۵۔۱۰ میں ہے کہ ''اگنی کی پہلی پیدائش سورگ لوک (جنت) میں بجلی یا نور (विद्युत) کے روپ میں ہوئی۔اسی رگ وید کے منتر ۱۱:۲۹:۳ر میں ہے کہ ''جب وہ ظاہر ہوتے ہیں یا سامنے (साक्षात) ہوتے ہیں تب آسر (आसुर) اور نر شنس (नराशंस) کہلاتے ہیں۔اب یہ منتر ایسا ہے جس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ تخلیق اول یعنی اگنی کے دنیا میں آنے کے بعد بھی صفت کے مطابق اسی اگنی نے دیو دوت (پیغمبر) کا بھی کام انجام دیا۔اب اگر اس وضاحت کی روشنی میں ہم آسر کے

ظاہر کرتی تھیں گویا انھیں درد سے نجات مل گئی ہو۔

روشنی آگے ہی بڑھتی رہی حتّٰی کہ وہ اس جگہ آ گئی جہاں میں کھڑا تھا۔ یہ روشنی ایک قوی الجثّہ شخص کے آگے آگے رواں تھی۔ وہ دائیں طرف ایک احاطہ کی طرف مڑ رہے تھے جو چٹائیوں سے گھرا ہوا تھا اور اس کے اندر ایک تنگ شگاف تھا۔ میں اس کے آگے کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن ایک طرح کا احساس تھا کہ کوئی متبرک جگہ تھی۔ جونہی وہ شگاف کے قریب پہونچے انھوں نے اپنا بایاں ہاتھ بلند کیا تا کہ اس بانس کو پکڑ رکھیں جس کے ساتھ چٹائی باندھی گئی تھی۔ وہ ارادتاً ہاتھ سے بتائے ہوئے ایک مٹی کے پشتے پر ٹہلتے چلے گئے جس کے ساتھ پانی کی تنگ سی ندی بہہ رہی تھی۔ یہ بات عجیب لگی کہ وہ شخص اتنی چھوٹی سی آڑ کو اتنی احتیاط سے پار کر رہے تھے۔ میں نے ان کے جسم پر نظر ڈالی۔ وہ سراپا قوت تھے۔ جو لباس انھوں نے پہن رکھا تھا وہ ڈھیلا چست تھا۔ ان کے سر پر عجیب سی ٹوپی تھی جس کی پشت پر ایک کپڑا لٹک رہا تھا جو ان کی گردن کے پچھلے حصے کو ڈھانپے ہوئے تھا۔ ان کی ٹانگیں مضبوط تھیں۔ ان کا رنگ روپ ایک خوبصورت عرب کی طرح گندمی تھا۔

چٹائیوں کے اندر بنے ہوئے شگاف سے وہ اندر چلے گئے ایک انسان جن کا نام مجھے صرف اسوقت ان لوگوں کی اطمینان بھری گہری سانسوں سے معلوم ہوا جب وہ ان کے آگے فرط تعظیم و تکریم سے جھکے ہوئے تھے۔ میں جانتا تھا کہ حضرت کے معنی ولی ہوتے ہیں اور علیؑ ظاہر ہے ان کا اپنا نام تھا لیکن میں نے اس سے قبل کسی شخص کی زبانی یہ نام نہ سنا تھا۔

تھوڑی دیر بعد یکا یک ایک شعاع پھر نمودار ہوئی جو چٹائیوں میں بنے ہوئے شگاف میں سے نکل رہی تھی۔ یہ آگے بڑھنے لگی۔ لوگ جلدی سے پھر اس قدر جھک گئے کہ ان کی پیشانیاں زمین کو چھونے لگیں۔ وہ پہلے کی طرح اسی مقدس ہستی کی موجودگی سے باخبر معلوم ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ پھر وہ شعاع نور ان کی جھکی ہوئی

پشتوں پر پڑنے لگی اوران زمیں بوس اجسام سے پھرایک اطمینان کی گہری سانس ابھری۔ یہ اطمینان کی گہری سانس گویا زمین میں سے نکلتی محسوس ہوتی تھی اور پھرایک گہری طمانیت آمیز آہ سرد کے ساتھ وہی نام جلدی سے پھر پکارا گیا۔ پہلے کی طرح دو مرتبہ ''حضرت علیؑ حضرت علیؑ''۔

اس شگاف کے در پر وہ مقدس ہستی کھڑی تھی۔ ہمارے درمیان گلی میں سجدہ ریز لوگوں کے اجسام پھیلے ہوئے تھے۔ان کا چہرہ اور گردن ڈھکے ہوئے تھے۔انھوں نے ایک بار اپنے بائیں ہاتھ سے چہرہ کے کپڑے کو ایک طرف ہٹایا تاکہ اپنا چہرہ مجھ پر ظاہر کریں لیکن میں کچھ نہ دیکھ سکا ماسوائے ایک خیرہ کن روشنی کے۔ یہ ایسا ہی تھا جس طرح سورج کو دیکھ لیا جائے۔ میں اپنی جگہ جما رہا۔ میں نے اپنی نگاہ شوق ان کے کھلے چہرے پر جما دی۔ تب میں نے انھیں واضح طور پر دیکھ لیا۔ یہ ایک تیس سے چالیس سال کے درمیان کی عمر کے آدمی کا نورانی چہرہ تھا۔ انھوں نے مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا۔ پھر انھوں نے اپنا داہنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ ہمارے درمیان فاصلہ ایک ہاتھ سے بڑھ کر تھا۔ لیکن جونہی میں نے ان کے پھیلے ہوئے ہاتھ کو تھامنے کیلئے کوشش کی یہ فاصلہ گھٹ گیا۔ میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا تاکہ ان کا ہاتھ پکڑلوں انھوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ تب ایک ہلکے شفقت آمیز جھٹکے سے انھوں نے مجھے اپنے آگے سے کھسکا کر اپنی دائیں طرف کرلیا۔ میں لطیف ہوا میں تحلیل ہوگیا۔ میں بیدار ہوگیا۔ میری سانس پھول رہی تھی اور میرا پسینہ بہہ رہا تھا۔''

کراکا نے اس خواب کی تعبیر کیلئے اسی پارسی مقدس عورت سونا مائی کو فون کیا۔ جب انھوں نے سونا مائی کو خواب میں سنے الفاظ ''حضرت علیؑ۔ حضرت علیؑ'' بتایا تو وہ خوشی سے بول اٹھیں ''باوا'' تمہارے پاس آگئے''۔ کراکا نے پوچھا کہ یہ آدمی جو خواب میں دکھائی دئے تھے کون تھے؟۔ سونا مائی نے کہا'' نادان لڑکے کیا تمہیں معلوم نہیں کہ سالہا سال سے تم کس کو پکارتے چلے آئے تھے؟۔ کراکا نے کہا'' لیکن مائی ہم

ہمیشہ انھیں ''مشکل آسان صاحب'' پکارتے چلے آئے ہیں۔آپ نے ہمیشہ اسی طرح ان کا نام لینا سکھایا ہے۔مائی نے کہا''مشکل آسان (ہماری زبان میں مشکل کشا) صاحب، مولا علیؑ حضرت علیؑ یہ سب ایک ہی ہیں۔انھوں نے پسند فرمایا کہ تم پر بطور حضرت علیؑ ظاہر ہوں'' مائی نے یہ بھی کہا کہ ''لوگ انھیں الگ الگ ناموں سے پکارتے ہیں لیکن یہ وہی ''علیؑ'' ہیں۔لوگوں کے نزدیک وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اسلام میں سب سے بزرگ ہستی ہیں۔تم یہ خواب کسی کو نہ بتانا۔

کراکا لکھتے ہیں کہ'' دھیرے دھیرے ان کے بارے میں تفصیلات مجھ تک پہونچتی رہیں۔حضرت علیؑ نے اپنے مقلدین پر واضح کردیا تھا کہ وہ خدا نہیں ہیں۔میں بھی اس اعتقاد پر جمارہا کہ حضرت علیؑ خدا نہیں ہیں لیکن میں جو کئی سالوں سے ان کی تقلید میں محور رہا اگرچہ میں ایک پارسی ہوں اور مسلمان نہیں ہوں، وہ میرے لئے ایک طرز حیات ہیں اور میں نے جونہی اس کے مطابق زندگی بسر کرنی شروع کی تو مجھے پورا اندازہ ہوگیا کہ وہ عین دین ہیں۔وہ میرے لئے کلّ دین ہیں۔

کراکا نے حیدرآباد کی ''مولا علیؑ پہاڑی'' کے بارے میں سنا تھا۔ایک بار وہ حیدرآباد گئے تو نظام نے ان کو اس پہاڑی تک بھیجنے کا انتظام کیا جیسے ہی وہ پہاڑی کی چوٹی پر واقع درگاہ تک پہونچے تو وہاں در کے پاس بورڈ لگا تھا جس پر لکھا تھا''غیر مسلموں کے لئے اس جگہ سے آگے بڑھنا منع ہے'' وہ مایوس ہوگئے کہ زیارت نہ ہو سکے گی۔

اچانک اس مقدس درگاہ کے اندر سے کچھ ہلچل سنائی دی۔انھیں ان کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ایک مجاور جو گہری نیند سے اٹھ کر آیا تھا وہ درگاہ کے دروازہ سے باہر آیا۔اس بورڈ کے پاس آکر اس نے مجھے اندر آنے کے لئے اشارہ کیا۔اندر ایک ستون تک مجاور مجھے لے گیا۔کراکا نے پوچھا کہ''اس ستون کی موجودگی کا کیا مطلب ہے''؟ مجاور نے جواب دیا''مولا علیؑ یہاں عبادت

کے لئے تشریف لائے۔اس ستون کے پیچھے ایک پتھر پر ان کی ہتھیلی کا نقش موجود ہے۔وہ انھیں ستون اور اس دیوار کے درمیان تنگ جگہ میں وہاں لے گیا جہاں وہ پتھر ابھرا ہوا تھا مگر نظروں سے پوشیدہ نصب تھا۔اس نے کراکا کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے پتھر پر رکھ دیا۔یہ ایک تختی تھی جیسے ہی کراکا نے اس ہتھیلی پر اپنا ہاتھ رکھا انھیں اپنا خواب یاد آ گیا۔ایسا لگا کہ حضرت علیؑ اس کا ہاتھ تھامے ہیں۔

کراکا کہتے ہیں کہ ''مجھے تجسّس تھا کہ بورڈ کی تحریر کے باوجود مجاور اندر کیوں لے گیا؟ میں نے اس سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ میں گہری نیند سو رہا تھا کہ مولیٰ علیؑ نے جگایا اور حکم دیا کے دروازہ پر جاؤ اور انھیں اندر لے آؤ۔میں نے جب دروازہ پر آپکو دیکھا کہ آپ مسلمان نہیں ہیں تو انھوں نے پھر حکم دیا کہ انھیں اندر آنے دو میں نے مجاور سے پوچھا ''مولا علیؑ تم سے کیسے بات کرتے ہیں؟ اس نے کہا ''میرے کان میں مجھے ایک آواز سنائی دیتی ہے۔میں نے سیڑھیوں سے اتر کر حضرت علیؑ کا شکریہ ادا کیا کہ مجھے پتھر تک آنے کی اجازت دی۔

کراکا کا بیان ہے کہ اسکے بعد حضرت علیؑ نے ان کی کئی بار مدد کی۔ 1968 کے شروع میں ہی انھیں حضرت علیؑ کے روضہ کی زیارت کرنے کے لئے نجف جانے کی آرزو پیدا ہوئی۔انھوں نے عراق کے قونصل جنرل سے ملاقات کر عراق کے ویزہ کے لئے گذارش کی تاکہ وہ نجف جا کر حضرت علیؑ کے روضہ کی زیارت کریں۔قونصل حیران ہوا اور کہا ''آپ مسلمان نہیں ہیں۔آپ کیوں جانا چاہتے ہیں؟ کراکا نے اسے اپنے خواب کے بارے میں بتایا۔قونصل نے عراق حکومت کو ویزے کے لئے لکھا کیونکہ اسوقت جرنلسٹوں کو ویزہ پر پابندی تھی۔

کراکا نے کچھ دن بعد ویزے کے لئے حماد نامی عراق کے قونصل کو پھر فون کیا۔اس نے حیرت بھرا جواب دیا کہ ''اگر حضرت علیؑ آپ کو وہاں بلانا چاہتے ہیں تو میری حکومت بھی آپ کو نہیں روک سکتی۔اس نے بتایا کہ اچانک ہی عراقی حکومت نے

جرنلسٹوں پر ویزے کی پابندی اٹھالی ہے۔اس سے مجھے پتہ چلا کہ حضرت علیؑ آپ کو بلانا چاہتے ہیں۔یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ جس دن وہ ہوائی جہاز سے بغداد ایر پورٹ سے ہوکر نجف پہونچے وہ 13 رجب یعنی مولا کی ولادت کا دن تھا۔

جب کرا کا بغداد ایر پورٹ پہونچے وہاں ایک عرب ''کھورا کھا کھورا کھا'' کہہ کر پکار رہا تھا۔بعد میں پتہ چلا کہ وہ کرا کا کو ہی پکار رہا تھا۔کرا کا اس کے ساتھ کار سے بغداد سے نجف تک پہونچے اور گائڈ کے ساتھ روضے کی طرف بڑھے۔چونکہ انھوں نے گائڈ کو بتا دیا تھا کہ وہ مسلمان نہیں ہیں اس لئے اس نے کہا کہ وہ روضہ کو صرف باہر سے دیکھ سکتے ہیں۔کرا کا بالکل مایوس ہوگئے کہ حضرت علیؑ نے انھیں ہندوستان سے بلایا اور اب وہ اچھوت کی طرح باہر کھڑے ہیں۔پھر یکا یک کوئی بات ہوگئی کہ گائڈ اب انھیں خاص روضے کے اندر لے جا رہا تھا اور اب وہ خواب دیکھنے کے چودہ برس بعد حضرت علیؑ کے مزار کے سامنے کھڑے تھے۔

کرا کا کہتے ہیں۔میں نے وہاں دعائیں تو مانگیں مگر میرا دل بہت رنجیدہ تھا کہ میں جو اپنے آپ کو اس ولی سے جو اس جگہ دفن ہیں اتنا قریب سمجھا کرتا تھا انکی ضریح کی جالی کو چھو نہیں سکتا تھا جبکہ میرے خواب میں حضرت علیؑ نے اپنی مرضی سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔اسی دم ایک بوڑھے پیشوا (مزار کے خادم) میرے پاس آئے اور جیسا کہ گائڈ نے بتایا میرے لئے عربی میں دعا مانگنے لگے۔پھر انھوں نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور بالکل قریب لے جا کر مجھ سے دعا منگوائی اور پھر میرا ہاتھ پکڑ کر اندر سرہانے والے حصے پر رکھ دیا جسکے لئے میرے گائڈ نے منع کیا تھا۔ان پیشوا نے گائڈ سے کہا کہ میں جانتا ہوں یہ کون ہیں۔شاید جس طرح حیدرآباد میں مولا علیؑ درگاہ کے مجاور کو حکم ملا تھا ویسا ہی اس پیشوا کو بھی حکم ملا تھا کیونکہ اس نے میرے واپس ہوتے وقت مجھے عجیب انداز میں جھک جھک کر سلام کیا۔واپسی میں میں قبر کی طرف مڑا اور دعا مانگنے کے انداز میں ہاتھ اٹھا کر کہا'' بابا آپ نے مجھے اچنبھے

میں ڈال دیا ہے۔میں سمجھتا تھا کہ میں ایک فقیر کے روضے پر جا رہا ہوں لیکن کوئی شہنشاہ بھی آپ جیسا شاندار مقبرہ نہیں پا سکتا''۔

اسکے بعد کرا کا دو بار اور نجف گئے۔دوسری بار 1970 میں اور تیسری بار ستمبر 1971 میں۔وہ تیسری بار کی زیارت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ''شب معراج کی تاریخ ہونے کی وجہ سے اتنی زیادہ بھیڑ تھی اور اتنی دھکا مکی تھی کہ مجھے ریلے میں بہت پیچھے دھکیل دیا گیا اور میرے دل میں درد شروع ہو گیا جیسے میرا آخری وقت آ گیا۔روضہ ابھی دور تھا۔میرے اوپر بیہوشی چھانے لگی۔یکا یک مجھے احساس ہوا کہ کہ مجھے کسی مضبوط ہاتھ نے پیچھے سے پکڑ کر آگے دھکیلا اور کھلے سے اٹھا کر روضہ کے پاس پہونچا دیا۔میں نے چپل اتاری اور اس کے پہلے کہ یہ سوچتا کہ میں کدھر جاؤں، مجھے نادیدہ ہاتھوں نے اٹھالیا مجھے کھڑا کیا اور مجھے اٹھا کر روضہ کے اندر پہونچا دیا۔ایک معجزہ ہوا کہ میرے سینہ کا درد بالکل غائب ہو گیا میرے منھ سے بے اختیار نکلنے لگا''یا علی میں حاضر ہوں''۔میں نے ضریح کے چاروں طرف طواف کیا۔اس کے بعد میں وہاں سے واپس پلٹا۔آج میں نے انھیں (حضرت علیؑ کو) اپنے بہت قریب پایا۔وہ ضرور مجھے لینے کیلئے موجود تھے۔ان کے 1949 کے الفاظ کہ''میں ہمیشہ تمہاری مدد کے لئے تیار ہوں۔تم ہمت پیدا کرو''اب ایک حقیقت بن چکے تھے۔

یہ ہیں حضرت علیؑ جنہیں تھوڑا سا بھی سمجھنے کے لئے ڈی۔ایف۔کرا کا جیسا دل، دماغ اور یقین چاہیئے۔

امام حسینؑ اور مشاہیر عالم

دنیا کی تمام مہذب اقوام کے یہ گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ قوم اللہ کے جس رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کلمہ پڑھ رہی ہے اور پانچ وقت کی نمازوں میں اسکی رسالت کی گواہی دے رہی ہے، وہی قوم اسی رسول کے نواسے حسینؑ کو کربلا کے میدان میں اس درندگی اور بربریت کے ساتھ قتل کرے گی کہ اسے تین روز تک پانی نہ دے گی۔ خود حسینؑ کو ہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ آنے والے بوڑھے، جوان، بچے اور عورتوں کو بھی بھوکا پیاسا رکھا جائیگا اور مردوں میں تمام لوگوں کو قتل کر دیا جائیگا۔ حد تو یہ ہے کہ ایک چھ مہینے کے بچے کو بھی پانی نہ ملے گا اور جب حسینؑ اس کے لئے پانی مانگنے جائیں گے تو بچے کو پانی کے بجائے تیر سہ شعبہ ملے گا۔ یہ ظلم یہیں پر ختم نہیں ہو جائیگا بلکہ لاشوں کو عریاں کر کے ان پر گھوڑے دوڑائے جائیں گے اور اپنے نبی کی نواسیوں کو قید کر بے پردہ ایک جگہ سے دوسری جگہ گھمایا جائیگا۔ لیکن ایسا ہی ہوا۔ اس قتل وغارتگری میں سارے جنگی قانون خصوصاً اسلامی قوانین کی دھجیاں اڑادی گئیں۔

کربلا مین ہوئے اس واقعہ نے دنیائے اسلام کو حیرت زدہ اور شرمندہ کر دیا۔ وہ اسلام جو سلامتی کا پیغام لیکر آیا تھا، خود اس کے ماننے والوں نے اسلام کا نام لیکر اس ظلم و بربریت کا کھیل کھیلا۔ جس رسول نے یہ کہا کہ "حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں" اس کے کلمہ گویوں نے رسول کی حدیث کا اس طرح جواب دیا۔

اس المناک حادثہ سے پوری دنیائے انسانیت چیخ اٹھی اور حسینؑ کی مظلومیت نے تمام مشاہیر عالم کو مجبور کر دیا کہ وہ حسینی مقصد کی تحقیق کریں اور اپنے

تاثرات سے باطل کو برہنہ کریں۔

ہم یہاں کچھ مشاہیر عالم کے تاثرات قلمبند کر رہے ہیں تا کہ قارئین دیکھیں کہ اس خونِ ناحق نے کتنے لوگوں کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا:

۱۔انیتا رائے کہتی ہیں کہ ''امام حسینؑ حق کیلئے باطل سے اس طرح ٹکرائے کہ انھوں نے ہمیشہ کیلئے باطل اور جھوٹ کی ریڑھ کی ہڈی کو توڑ کر رکھ دیا۔ حسینؑ نے ہدایت اور حکومت کے بیچ ایک حد فاصل قائم کر دی۔ رہنمائی کا امتحان یہ ہے کہ ہنگامی حالت پیدا ہونے سے پہلے کسی مسئلہ کو پہچاننے کی صلاحیت ہو۔ حسینؑ میں یہ صلاحیت ورثہ میں ملی تھی۔انھوں نے پایا کہ اسلام بیمار ہو گیا ہے اور خون جاری ہے۔ یزید اسلام کے جسم میں ناسور کی طرح تھا۔اس کی روح پر تیزی سے حملہ ہو رہا تھا اور اسلام مدد کیلئے پکار رہا تھا۔ایسے میں حسینؑ اس کے محافظ بن کر سامنے آئے'' (اَین افیرَ آف دی ہارٹ an affair of the heart صفحہ ۹۴)۔

۲۔امام شافعی: ''میرا دل غمزدہ ہے کیونکہ میرے اندر مایوسی چھائی ہے مجھے نیند نہیں آئی ۔بےخوابی پریشان کئے ہے۔کون ہے جو میرا ایک پیغام حسینؑ تک پہونچا دے جو بے قصور قتل کر دیا گیا۔اُسکی قمیص گہرے لال رنگ میں رنگی ہے۔اب خود تلوار گریہ وزاری کرتی ہے اور برچھی چیختی ہے۔اور گھوڑا جو کبھی ایک بار خوشی میں ہنہنایا تھا اب واویلا کرتا ہے۔وہ شخص جو کبھی بنی ہاشم سے دعائیں چاہتا تھا مگر آج انکی اولادوں پر حملہ کرتا ہے۔ در حقیقت یہ حیرت کی بات ہے'' (لنڈا کلارک کی کتاب حسین پر مرثیہ Elegy on Husayn سے لیا گیا)

۳۔امام سِنائی: ''کربلا کتنی شاندار ہے اور اسے کیا مرتبہ ملا ہے۔یہ انسانیت کیلئے ہوا کے دوش پر جنت کی خوشبو لائی ہے۔اور وہ بےسَر لاش مٹی اور دھول میں پڑی ہوئی ہے اور وہ نایاب لوگ جن کے دل تلوار سے شگافتہ ہیں اور پوری دنیا میں ایک منتخب قتل کر دیا گیا۔اس کا جسم مٹی اور خون میں سَنا ہے۔اور وہ ظالم لوگ، وہ شیطنت کرنے

والے۔ وہ لگاتار ظلم کررہے تھے۔ تلواریں حسینؑ کے خون سے یاقوت کی طرح سرخ ہیں۔ اس دنیا میں اس سے زیادہ ذلیل بات کیا ہوسکتی ہے۔ جان لو کہ جواُن کتّوں (حسینؑ کے قاتل) کو برا کہے گا وہ دوسری دنیا (عاقبت) میں حاکم ہوگا'' (حدیقۃ الحقیقہ)۔

۴۔ علامہ اقبال: ''حسینؑ سچائی کی خاطر خون اور خاک میں لتھڑ گئے۔ امام حسینؑ نے تاقیامت آمریت کو ختم کردیا۔ انھوں نے اپنے خون سے آزادی کے خشک ہوتے ہوئے باغ کو سینچا اور انھوں نے واقعی مسلم قوم کو سوتے سے بیدار کیا''۔

۵۔ ایڈورڈ جی براؤن (پروفیسر کیمبرج یونیورسٹی): ہمیں کربلا کے خون آلود میدان کی یاد آتی ہے جہاں اللہ کے رسول کا نواسہ تشنہ لب اپنے اصحاب اور اقربا کی لاشوں کے درمیان زمین پر آیا۔ اسکی یاد سرد مہر اور غافل ماحول میں بھی جذبات، غم اور روح کو بلندی عطا کرنے کیلئے کافی ہے جس کے سامنے درد، خطرہ اور موت کا ڈر ہیچ نظر آتے ہیں (اے لٹریری ہسٹری آف پرشیا)۔

۶۔: پنڈت جواہر لعل نہرو: ''یہ تاریخ کی ایک اہم حقیقت ہے کہ کربلا کے المناک واقعہ نے دنیائے انسانیت پر زبردست اور پائیدار اثر ڈالا ہے۔ یہ تعجب خیز ہے کہ پچھلی تمام صدیوں کے درمیان اس واقعہ نے سینکڑوں اور لاکھوں کو متاثر کیا ہے اور دوسرے تمام لوگوں کی ہمدردی حاصل کی ہے لیکن تعجب نہیں کرنا چاہئے کیونکہ ایک مقصد کیلئے قربانی نے ہمیشہ انسانوں کو متاثر کیا ہے اور قربانی جتنی خالص ہوگی اور مقصد جتنا عظیم ہوگا وہ وقت کی سرحدوں کو پار کرتے ہوئے مردوں اور عورتوں کو متاثر کرے گا۔ یہ لازمی ہے کہ ایک المناک واقعہ غم کا احساس پیدا کرے گا۔ یہ ضروری ہے کہ ہم اسے یاد رکھیں اور اس سے اپنے اندر حوصلہ پیدا کریں''۔

۷۔ محمد علی جناح: ''حسینؑ سے بہتر اور کوئی مثال ہمارے سامنے نہیں ہوسکتی جو ہمت، یقین کامل اور قربانی کے عظیم مجسمہ تھے۔ ہر مسلمان کو انکے کارنامے اور ان کی زندگی کی

مثال کو اپنے سامنے رکھنا چاہئے اور ان کے نقش قدم پر چلنا چاہئے''۔

۸۔مہاتما گاندھی: ''یہ میں نے امام حسینؑ سے سیکھا ہے کہ مظلوم اور ستایا ہوا ہونے کے باوجود کس طرح فتح حاصل کی جاتی ہے''

۹۔ایڈورڈ گبن (مشہور مورخ): ایک گزرے ہوئے زمانے اور آب و ہوا میں حسینؑ کی موت کا المناک منظر سرد سے سرد مزاج قاری کی ہمدردی کو جگائے گا۔(دی ڈکلائن اینڈ فال آف دی رومن اِمپائر)

۱۰۔ڈاکٹر کے شلڈریک (Dr.K.Sheldrake): ''اُس جانباز جتھہ کے مرد اور عورتیں بخوبی جانتے تھے کہ انکے چاروں طرف دشمن فوجیں بے رحم ہیں اور نہ صرف لڑنے کیلئے تیار ہیں بلکہ مار ڈالنے پر آمادہ ہیں۔انھوں نے بچوں تک کو پانی نہیں دیا ہے۔یہ جانباز جلتے ہوئے سورج کے نیچے اور سخت گرم ریت پر کھڑے تھے۔اس کے باوجود ان میں سے ایک کے بھی قدم نہیں لڑکھڑائے۔حسینؑ اپنے مختصر ساتھیوں سمیت آگے بڑھے لیکن شہرت کیلئے نہیں، دولت کیلئے نہیں بلکہ ایک عظیم قربانی کیلئے اور ان میں کے ہر شخص نے بغیر ہچکچائے بہادری کے ساتھ ان زبردست مصیبتوں کا سامنا کیا''۔

۱۱۔چارلس ڈِکنس Charles Dickens (ایک انگریزی ناول نگار): ''اگر حسینؑ اپنی دنیاوی خواہشوں کیلئے لڑے تھے تب مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی بہن بیوی اور بچے ان کے ساتھ کیوں آئے۔اس لئے اس سے ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ انھوں نے اپنی قربانی صرف اور صرف اسلام کیلئے دی۔''

۱۲۔سورِن کِرک گارڈ (Soren Kierkegard): ''ظالم مرتا ہے اور اسکی حکومت ختم ہوجاتی ہے لیکن شہید مرتا ہے اور اس کی حکومت شروع ہوتی ہے۔''

۱۳۔تھامس کارلائل (Thomas Carlyle. اسکاٹ لینڈ کا مورخ): ''کربلا کے المیہ سے جو ہمیں سبق ملتا ہے وہ یہ کہ حسینؑ اور انکے ساتھی اللہ میں زبردست یقین

معنی کو لیں تو آسر کے مطلب ہوتے ہیں ''سب سے نیچے یا سب سے بعد میں آنے والا'' اور ہم جس رسول کو سب سے آخر میں آنے ولا کہتے ہیں وہ کوئی اور نہیں تخلیق اول نور محمدی کی بشری جامہ میں ذات ہے۔

یہی آسر نراشنس بھی کہلایا۔ یہ لفظ دو الفاظ کا مرکب ہے نر + آشنس (नर + आशंस) نر معنی مرد اور آشنس کے معنی تعریف یا حمد کیا گیا۔ پنڈت وید پرکاش اپادھیائے نے اپنی کتاب نراشنس اور انتم رشی (नराशंस और अंतिम ऋषि) میں حوالوں کے ساتھ اور کتابوں میں نراشنس کی دی گئی صفتوں کی پوری تشریح کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ نراشنس اور کوئی نہیں حضرت محمدؐ ہیں ویسے بھی نراشنس کا عربی ترجمہ محمدؐ ہی ہوتا ہے اس لئے ہم اپنی دلیلیں نہ دیتے ہوئے اس بات پر ویدوں کی روشنی میں یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ اللہ کی تخلیق اول یعنی نور محمدی یا بقول ویدا گنی جب اس دنیا میں آخری پیغمبر کی شکل میں آئی تو وہ نراشنس (ویدک زبان میں)اور عربی زبان میں محمد کہلائی۔

آیئے ذرا انجیل کو بھی دیکھیں یوحنا کی انجیل ۱:۱میں ہے کہ ابتدا میں ہیوتھیوس (Hotheos) تھا اور ٹونتھیوس (Tontheos) خدا کے ساتھ تھا اور ہیوتھیوس خدا تھا''

مندرجہ بالا دونوں الفاظ یونانی ہیں پہلے کا مطلب خدا اور دوسرے کا مطلب خدائی طاقت والا۔ عیسائیوں نے ترجمے میں دونوں کا مطلب خدا کے لے لئے۔ لیکن یونانی زبان کے مطابق شروع میں اللہ تھا اور وہ جو الٰہی طاقت والا تھا وہی تخلیق اول تھا۔ یہ اور کوئی نہیں نور محمدی تھا جس کے لئے حضرت عیسیٰؑ نے کہا تھا ''اور اب میں نے اس کے ہونے سے پہلے (دنیا میں آنے سے پہلے) تم سے کہہ دیا ہے کہ جب وہ ہو جائے تو اس پر ایمان رکھو۔ میں اب سے تمہارے ساتھ اور باتیں نہ کروں گا، کیوں کہ اس دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں (انجیل یوحنا

رکھتے تھے۔انھوں نے یہ ثابت کردیا کہ تعداد کی بڑھت صداقت اور جھوٹ جانچنے
کیلئے پیمانہ نہیں بن سکتی آدمیوں کی قِلت کے باوجود حسینؑ کی فتح نے مجھے حیران کردیا
ہے"۔

۱۴۔پنڈت رگھونندن پرساد:"اگر تعصب ہماری عقل کو اندھا نہیں کردیتا ہے تو ہم
چاہے کسی بھی مذہب کے ماننے والے ہوں یا مبلِّغ ہوں، ہم حق وصداقت کیلئے جان
دینے والے کربلا کے شہیدوں کی قربانی کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے کیونکہ حق
وصداقت کی اپیل عالمگیر ہے اسے جغرافیائی اور عقیدہ کی حدود میں محدود نہیں کیا جا
سکتا۔تب اس مکمل انسان امام حسینؑ کے نام کو شہرت دینے کیلئے پوری دنیا کو محبت اور
عقیدت کے ساتھ اس میں شامل ہونا چاہئے اور تاریخ کے اس اہم واقعہ کو ہر سال منانا
چاہئے کیونکہ اس یاد کو باقی رکھنے کا مطلب پوری انسانی برادری میں امن، صداقت،
ایمانداری، آزادی اور فرض شناسی کی جڑوں کو پانی دینا ہے"۔

۱۵۔ڈاکٹر راجندر پرساد (ہندوستان کے پہلے صدر جمہوریہ):"کربلا کا المیہ انسانی
شہادت کا اتنا اہم تاریخی واقعہ ہے کہ اسے کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔یہ ہر زمانہ میں دنیا
کے اربوں مردوں اور عورتوں کی زندگیوں پر اپنا اثر ڈالتا رہے گا۔واقعۂ کربلا
ہندوستان میں مکمل عقیدت کے ساتھ منایا جاتا ہے۔محرم کی رسوم میں نہ صرف مسلمان
حصہ لیتے ہیں بلکہ غیر مسلم بھی اسی طرح اس میں مکمل دلچسپی لیتے ہیں"۔

۱۷۔پیٹر جے چلکوسکی Peter J. Chelkowski (نیو یارک یونیورسٹی کے شعبہ
مطالعہ مشرق وسطیٰ کے پروفیسر):"حسینؑ اپنے ستر ساتھیوں (اپنے گھر والوں سمیت
) مکہ سے چلے۔لیکن کربلا کے میدان میں یزید کی فوجوں کے گھیرے میں آگئے۔حالا
نکہ شکست یقینی تھی لیکن حسینؑ نے یزید کی بیعت سے انکار کردیا۔دشمن کی ایک بڑی
فوج سے گھرے ہوئے حسینؑ اور انکے ساتھی کربلا کے جلتے ہوئے صحرا مین دس دن
تک بغیر پانی کے رہے۔انجام کار حسینؑ، تمام مرد اعزا و اقارب واصحاب اور انکے گھر

کے مرد بچے یزید کی فوج کے تیروں اور تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔انکی عورتیں اور بچے ہوئے بچّے یزید کے سامنے دمشق لے جانے کیلئے قیدی بنا لئے گئے ۔مشہور مؤرخ ابوریحان البیرونی کہتا ہے کہ تب انکے خیموں میں آگ لگادی گئی اور انکی لاشوں پر گھوڑے دوڑا دئے گئے۔انسانی تاریخ میں کسی پر بھی ایسے ظلم نہیں ڈھا ئے گئے''۔

Book Taziyeh : Ritual In Iran- Published in New York (,1979,P.2)

یہ تو مشاہیر عالم کے تاثرات کے چند نمونے تھے ورنہ کتابیں ایسے بیانات سے بھری پڑی ہیں۔ہم اس مضمون کو کنور مہندر سنگھ آئی اے ایس کے اس قطعہ پر ختم کرتے ہیں:

زندہ اسلام کو کیا تو نے
حق و باطل دکھا دیا تو نے
جی کے مرنا تو سب کو آتا ہے
مر کے جینا سکھا دیا تو نے

حسینی برہمن

یوں تو امام حسینؑ کی بامقصد قربانی نے جہاں عالم اسلام میں انقلاب برپا کر دیا اور امام حسینؑ کے معاملہ میں پورا عالم اسلام ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گیا۔ سب اس بامقصد شہادت سے غم زدہ ہوئے اور یزید خباثت کی علامت بن گیا یعنی بقول جوش ملیح آبادی:

نام یزید داخل دشنام ہو گیا

وہیں پوری دنیائے انسانیت واقعۂ کربلا سے متاثر ہوئی اور امام حسین کو انسانیت کا مسیحا قرار دیا۔ جب سارے جہاں کے انسانوں نے یہ جانا کہ امام حسین لڑائی کے خیال سے نہیں نکلے تھے بلکہ وہ گھر کی عورتوں اور بچوں کے قافلہ کو لے کر آئے تھے تو غلط فہمیاں دور ہوئیں۔ پھر جب یہ معلوم ہوا کہ امام حسین کا ایک چھ ماہ کا بچہ علی اصغر بھی تین دن کا پیاسا تھا اور جب امام عالی مقام عصر عاشور میں آخر میں اس بچے کو ساتھ لے کر مخالف فوج سے اس کے لئے پانی لینے گئے تو بچہ کو پانی کے بجائے تیر سے شہید کر دیا گیا۔ اس پر انسانیت چیخ اٹھی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد دانشوروں نے یہ سوچا کہ پھر عالم گیر جنگ نہ ہو اس کے لئے کسی ایسے نام سے اپیل کی جائے جس کا کسی مذہب یا مسلک سے تعلق نہ ہو۔ سب نے متفقہ طور پر اس بچے علی اصغر کے نام پر اپیل کی۔ یہ اپیل نظم کی صورت میں الگزینڈر گوئنل ایک فرانسیسی شاعر نے لکھی۔ اس کا ترجمہ تقریباً تمام اہم زبانوں میں ہو چکا ہے۔

ہندوستان بھی اس شہادت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور تمام دانشوروں نے امام حسینؑ کے لئے اپنے احساسات لکھے۔

لیکن میں ہندوستان کے جس طبقہ کے بارے میں یہاں بیان کرنا چاہتا ہوں اس کا معاملہ بالکل الگ ہے۔ جو حضرات نہیں جانتے ہیں انھیں یہ پڑھ کر بہت تعجب ہوگا کہ ہندوستان میں برہمنوں کا ایک ایسا طبقہ بھی ہے جو اپنے کو حسینی برہمن کہنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ آیئے ہم ان سے آپ کا تعارف کرائیں۔

اگر آپ پی این بالی کی کتاب ''دی ہسٹری آف موہیالس۔ اے لجنڈری پیپل''(The History of Mohyals. A Legendary People) ٹی پی رسل اسٹریسی کی کتاب ''دی ہسٹری آف موہیالس۔ دی ملیٹنٹ ریس آف انڈیا (The History of Mohyals.The Militant Race of India) اور ششر کمار مترا کی کتاب دی ویزن آف انڈیا (The Vision of India) کا مطالعہ کریں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ قدیم زمانے میں برہمنوں کا کام مذہبی ارکان کو پورا کرانا تھا۔ یہ لوگ اپنی زندگی گزارنے کے لئے خود نہ کماتے تھے بلکہ ہندو سوسائٹی ان کا خیال رکھتی تھی، اور ان کے گزارے کا انتظام کرتی تھی۔ لیکن انھیں برہمنوں میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو اس طریقہ کو برا سمجھتا تھا اور اپنی روزی خود کمانا چاہتا تھا۔ ایسے برہمنوں نے فوجی بننے کا پیشہ اپنایا۔ اس وقت یہ روایت تھی کہ راجہ اپنے یہاں فوج میں داخل لوگوں کو زمین کی شکل میں مزدوری دیتا تھا۔ یہ زمین ان کے خاندان میں رہتی تھی اور وہ لوگ اس زمین کے مالک ہو جاتے تھے۔ یہ لوگ موہیال کہلائے۔ موہیال لفظ پراکرت بھاشا کے دو الفاظ ''موہی'' اور ''آل'' سے مل کر بنا ہے موہی یعنی زمین اور آل یعنی مالک۔ یعنی موہیال لفظ کا مطلب ہوا ''زمین کا مالک'' بعد میں برہمنوں کے اس موہیال طبقہ نے بہار اور یوپی میں موہیال کا سنسکرت لفظ ''بھومی ہار'' اپنا لیا۔ اب یہ ''بھوئیں ہار'' کہلاتے ہیں۔ متحدہ ہندوستان کے شمالی مغربی حصوں

خاص کر پنجاب اور سرحد وغیرہ کے علاقہ میں ان موہیالی برہمنوں کی سات شاخیں تھیں۔ان کے نام(۱) دت (दत्त)(۲) بالی (बाली)(۳) چھبر (छिब्बर) (۴) وید (वेद) (۵) لو (लौ) (۶) بھیم وال (भीमवाल) (۷) موہن (मोहन) تھے ملک کے دوسرے حصوں میں موہیال کی دوسری شاخیں ہیں جو تیاگی (त्यागी) پروہت (पुरोहित) ویاس (व्यास) چت پاون (चित्तपावन) مشرا (मिश्र) سنہا (सिन्हा) بھاڈری (भादुरी) چکرورتی (चक्रवर्ती) گانگولی (गांगुली) گوسوامی (गोस्वामी) موئترا (मोइत्रा) سانیال (सान्याल) داس (दास) اور ایّر (अय्यर) کہلاتے ہیں۔

بالی صاحب کے مطابق مہا بھارت کے زمانہ میں کوروؤں اور پانڈوؤں (कौरवों और पाण्डवों) کے جو گرو درونا چاریہ (गुरू द्रोणाचार्य) تھے وہ موہیال کی دت برہمن شاخ کے تھے۔گرو درونا چاریہ نے کوروؤں کا ساتھ دیا تھا کیوں کہ وہ تخت کے وفادار تھے اور تخت پر کورو تھے۔ان کا بیٹا اشوت تھامہ (अश्वत्थामा) بھی کوروؤں کی طرف تھا۔جنگ کے دوران اشوت تھامہ بری طرح زخمی ہو کر میدان جنگ میں گر پڑا تھا اور اسے مردہ سمجھ لیا گیا تھا۔جنگ ختم ہونے پر جب اسے ہوش آیا تو پانسہ پلٹ چکا تھا۔درونا چاریہ مارے جا چکے تھے اور اب وہاں پانڈوؤں کی حکومت تھی۔کسی طرح اشوت تھامہ چپکے سے وہاں سے نکلا اور راستہ طے کرتے کرتے عراق پہنچ گیا اور وہیں بس گیا۔

اشوت تھامہ کی نسل کے دت برہمنوں نے اپنی بہادری کی وجہ سے عراق میں اپنا سکہ جما لیا۔یہ لوگ عرب، وسط ایشیا، ایران اور افغانستان میں پھیل گئے۔انھوں نے یہاں کے ایک علاقہ میں اپنی حکومت قائم کی۔رسول اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں دت برہمنوں کا راجہ راہب سدھ دت تھا۔وہ عیسائی نہیں تھا لیکن اس کا نیک انسانوں جیسا رویہ دیکھ کر لوگ اسے راہب کہنے لگے۔یوں تو سدھ

دت کو ساری خوشیاں مہیا تھیں لیکن اس کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس درمیان جب اس نے مسلمانوں کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں سنا تو اس کے دل میں امید جاگی اور وہ اولاد کی نعمت پانے کے لئے مدینہ رسول اللہ کے پاس پہنچا۔ رسول اکرم نے اسے بتایا کہ اس کے نصیب میں اولاد نہیں ہے۔ وہ مایوس ہو کر لوٹ رہا تھا کہ اسی وقت رسول کے چھوٹے نواسے امام حسینؑ اپنے نانا کے پاس آرہے تھے۔ جب امام حسینؑ نے سدھ دت کے چہرے پر مایوسی دیکھی تو انھوں نے اس کی وجہ پوچھی۔ وجہ جاننے پر وہ پھر سے رسول اللہ کے پاس لے گئے۔ نانا سے ساری بات جان کر انھوں نے اللہ سے دعا کی اور انھوں نے اسے ایک کے بعد ایک کُل سات بیٹوں کا مژدہ سنایا۔ رسول اسلام نے سدھ دت کو بتایا کہ اللہ نے حسین کی دعا قبول کر لی ہے۔ سدھ دت خوشی خوشی واپس ہوا۔ بعد میں اس کے یہاں سات بیٹے ہوئے جن کے نام (۱) سہَس رائے (۲) ہرش رائے (۳) شیر خاں (۴) رائے پُن (۵) رام سنگھ (۶) دھارو اور (۷) بِرور کھے گئے۔

اولادیں ہونے کے بعد سدھ دت رسول اور آل رسول کا محب ہو گیا جس کی وجہ سے علاقہ میں اس کی بہت عزت تھی۔ پی۔ این۔ بالی کہتے ہیں کہ یہی وجہ ہے کہ امام حسین کے والد حضرت علی نے جنگ جمل میں بیت المال کی حفاظت کی ذمہ داری دت برہمنوں کے مسلح دستہ کے سپرد کی تھی۔ ان کے علاوہ کربلا کے غمناک واقعہ کے وقت اکیلے بغداد میں 1400 دت برہمن رہتے تھے۔

راہب سدھ دت امام حسین کا احسان نہیں بھولا تھا اور اسی لئے امام حسین جب سفر میں تھے تو بہت دور تک اس کا فوجی دستہ امام حسین کے ساتھ چلا۔ بعد میں امام حسین نے دستہ کو واپس بھیج دیا کیوں کہ آپ کا مقصد فوج کشی نہ تھا اور آپ قافلہ کو فوج میں تبدیل کرنا نہیں چاہتے تھے۔

جب 10 / اکتوبر 680ء کو کربلا کا دردناک واقعہ ہوا اور سدھ دت کو پتہ چلا

تو اسے بہت قلق ہوا اور غصہ آیا۔ جب اسے پتہ چلا کہ یزیدی فوج امام حسین کے سر کو لے کر کوفہ کے گورنر ابن زیاد کے محل میں لے جارہے ہیں تو اس نے اپنے فوجی دستہ کے ساتھ یزیدی دستہ کا پیچھا کیا اور ایک جگہ ان سے سر کو چھین لیا۔ متر ا کے مطابق وہ سر کو لے کر دمشق کی طرف بڑھا۔ راستہ میں وہ ایک جگہ ٹھہرا تھا کہ ایک بڑے یزیدی فوجی دستہ نے اسے گھیر لیا اور امام حسینؑ کا سر لینا چاہا۔ راہب نے اپنے ایک بیٹے کا سر کاٹ کر انھیں دیا لیکن وہ پہچان گئے کہ یہ امام کا سر نہیں ہے۔ راہب نے امام کا سر بچانے کے لئے اپنے ساتوں بیٹے قربان کر دئے لیکن یہ قربانی کام نہ آئی اور یزیدی دستہ نے امام کا سر چھین لیا۔

دت برہمنوں کے دل میں امام حسین کے قتل کا بدلہ لینے کی آگ بھڑک رہی تھی اور یہی وجہ تھی کہ جب انھیں پتہ چلا کہ امیر مختار قاتلان حسین کو چن چن کر مار رہے ہیں تو یہ لوگ امام حسین کے خون کا بدلہ لینے کے لئے امیر مختار کے ساتھ ہو گئے۔ وہ بہت بہادری سے لڑے اور چن چن کر امام حسین کے قاتلوں سے بدلہ لیا۔ کوفہ کے گورنر ابن زیاد کے قلعہ پر قبضہ کیا اور اسے گرا دیا۔ گرے ہوئے قلعہ کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس قربانی کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے ان دت برہمنوں نے درجنوں دوہے کہے جو محرم میں ان کے گھروں میں پڑھے جاتے تھے۔ میں غازی پور میں یونین بنک کا ڈسٹرکٹ منیجر تھا ، وہاں ہمارا ریجنل آفس ایک دت خاندان کے مکان میں تھا۔ ان کی عورتیں جو محرم میں دوہے پڑھتی تھیں وہ امام حسین کے لئے دت برہمنوں کی قربانی کو یاد دلاتے تھے۔ یہی دت برہمن حسینی برہمن کہلائے۔ یزید کی موت کے بعد بھی آل رسول کے دشمنوں کی حکومت جاری رہی اور ان لوگوں نے محبان آل رسول کے ساتھ ساتھ حسینی برہمنوں پر بھی ظلم ڈھانا شروع کیا تو مجبوراً یہ لوگ سیریا، ایشیائے کوچک اور بصرہ ہوتے ہوئے افغانستان کی طرف آئے جہاں انھوں نے غزنی ، بلخ ، بخارا اور قندھار

پر قبضہ کیا۔ پھر بعد میں سندھ کے اٹک علاقہ سے ہوکر وہ پنجاب اور راجستھان واپس آگئے۔ دت سلطانوں کے بارے میں کہا جاتا تھا ''وہ دت سلطان آدھے ہندو آدھے مسلمان''

امام حسین کا غم منانے والوں نے امام حسین کے لئے دی گئی دت برہمنوں کی قربانی کا احترام کرتے ہوئے انھیں ہمیشہ حسینی برہمن کہا اور یہ لوگ بھی اپنے کو حسینی برہمن کہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہ حسینی برہمن آج ہندوستان کے کونے کونے میں پائے جاتے ہیں۔

منزل شہادت کا جغرافیائی راستہ

یہ بات ہر محب حسینؑ کو معلوم ہے کہ معاویہ کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا یزید مسلم حکومت کا خلیفہ بن بیٹھا۔ اس نے جہاں تمام امت مسلمہ سے بہ جبر بیعت لی وہیں اس نے مدینہ کے گورنر ولید کو حکم دیا کہ حسینؑ سے بیعت لے اور اگر انھوں نے انکار کیا تو ان کا سر قلم کر دیا جائے۔ ولید نے امام حسینؑ کو بلوایا۔ شب میں جب امام آئے تو ان کے ساتھ بنی ہاشم کے جانباز بھی تھے آپ نے انھیں باہر رکنے کو کہا اور خود اندر گئے۔ وہاں ولید کے ساتھ مروان بھی بیٹھا تھا۔ ولید نے معاویہ کی موت اور اس کے بعد بننے والے خلیفہ یزید کی بیعت کا مطالبہ پیش کیا۔ آپ نے کہا یہ کام شب کی تاریکی میں مناسب نہیں ہے اور دن میں اس پر بات ہوگی۔ ولید مان گیا لیکن اسی وقت مروان ملعون نے کہا کہ اگر اس وقت تم نے چھوڑا تو پھر حسینؑ ہاتھ نہیں آئیں گے۔ مروان کی اس بیہودہ بات پر غصہ میں امام کی آواز بلند ہوگئی اور بنی ہاشم کے جوان دندناتے ہوئے اندر آ گئے۔ آپ مع جوانوں کے واپس تو آ گئے لیکن آپ نے ترک وطن کو مناسب سمجھا۔ آپ نے ۲۸؍رجب کو شب میں اپنے خاندان کے بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کے ساتھ مدینہ سے مکہ کی جانب جانے کا ارادہ کیا۔ آپ نے ۲۸؍رجب کو مدینہ چھوڑا۔ امام نے مدینہ میں خاص شخصیتوں محمد بن حنفیہ، عمر اطرف، ام المومنین ام سلمٰی سمیت دیگر خواتین بنی ہاشم کو مدینہ ہی میں چھوڑا۔ امام نے ان سے وداع ہوتے وقت اپنے مدینہ چھوڑنے اور اپنے سفر کے ارادہ سے آگاہ کیا۔ اور ان لوگوں سے اس سفر کے مقصد کو پوشیدہ اور مخفی رکھنے کی تاکید کی۔ ساتھ ہی محمد

بن حنفیہ کے سپرد اپنا وصیت نامہ کیا جس میں ان سے کہا کہ وہ مدینہ ہی میں قیام کریں اور مدینہ میں پیش آنے والے حالات سے مسلسل آگاہ کرتے رہیں۔امام حسینؑ نے سفر رات کی تاریکی میں اس لئے اختیار کیا کیوں کہ

(۱) آپ کو خدشہ تھا کہ حکومت وقت آپ کو اس سفر سے روک دے گی اور آپ کو شہر میں محصور کردے گی۔

(۲) معلوم ہو جانے پر یزید کے حامیوں اور امام کے اصحاب میں جنگ ہوگی اور مدینہ جنگ کا میدان بن جائے گا۔

(۳) خطرہ تھا کہ آپ کو گرفتار کر کے قید کر دیا جائے گا۔

(۴) ہوسکتا تھا کہ مروان جیسے خبیث کی تجویز کے تحت آپ کو قتل کر دیا جائے

اب یہاں سے آپ کے ذریعہ اپنائے گئے راستہ کا بیان ہوتا ہے۔آپ نے محسوس کیا کہ مکہ مسلمانان عالم کا مرکز ہے اور امن کی سرزمین ہے اور حج کا زمانہ تمام مسلمانوں سے ملاقات اور ان سے گفتگو کا بہترین وقت تھا،لہٰذا مکہ پہنچنا ضروری تھا۔آپ مدینہ سے سفر کرتے ہوئے ۳؍شعبان سنہ ۶۰ھ کو مکہ پہنچے۔آپ نے ۳؍شعبان سے لے کر ۸؍ذی الحجہ تک مکہ میں قیام کیا۔اس بات پر ذہن حیران ہوتا ہے کہ آخر آپ نے عین وقت پر حج کا ارادہ کیوں ترک کیا؟اس کا راز اس وقت کھلا جب آپ نے حجاج سے بار بار فرمایا کہ اگر میں یہاں سے نہ نکلوں تو یہ لوگ مجھے قتل کر دیں گے،اس وقت کے حالات ایسے تھے کہ سب طرف کے مسلمان وہاں آئے ہوئے تھے اور سب امام کے مرتبہ کو پہچانتے تھے اور مکہ کو جائے امن سمجھتے تھے ایسے میں یزید کی حکومت اتنا بڑا رسک نہیں لے سکتی تھی کہ کھلے عام امام حسینؑ کو قتل کر دیا جائے،اس لئے حکومت نے مکہ کی سرزمین میں امام کے خفیہ قتل کی سازش تیار کی اور حاجیوں کے لباس میں اپنے کارندے مکہ بھیجے تاکہ امام کو مکہ میں قتل کر دیں اور عوام کو اصل قاتل کا پتہ بھی نہ چل سکے۔لیکن امام حسینؑ نے ان کی اس سازش کو نہ صرف

۱۴:۲۹،۳۰)

مندرجہ بالا دلیلوں کے بعد ہم کو یہ بات کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ اللہ نے سب سے پہلے نور محمدی کو خلق کیا اور یہ نور باعث تخلیق کائنات ہے چونکہ اسی نور کو بشری جامہ میں سب سے آخر میں آکر انسانوں کی مکمل ہدایت کر کے اللہ کے دین کو مکمل کرنا تھا اسی لئے حضرت آدمؑ اور ان کے بعد آنے والے تمام رسول و نبی ان کے آنے کے بارے میں پیشین گوئی کرتے رہے اور ان کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کی تلقین کرتے رہے۔ اللہ ہم سب کو اس نورانی نبی کے بتائے ہوئے صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا کرے۔ آمین

کامیاب ہونے کا موقع نہیں دیا بلکہ ان کے مکروہ عزائم کو اپنے قول وفعل دونوں سے برملا فاش کر دیا۔آپ نے مکہ چھوڑنے کا باقاعدہ اعلان کیا اور مکہ چھوڑنے کی تین وجوہات بیان کیں۔

(۱) اگر میں مکہ نہ چھوڑوں تو یہ لوگ مجھے مکہ ہی میں قتل کر دیں گے

(۲) مکہ سے باہر مجھے قتل ہونا زیادہ پسند ہے۔

(۳) میں نہیں چاہتا کہ میرے قتل ہونے کی وجہ سے اس گھر (بیت اللہ) کی حرمت برباد ہو۔

امام حسینؑ نے جب یہ دیکھا کہ غاصب متولیان حرم، اس بیت اللہ اور حج کے ظاہری چہرے کو بھی مسخ کرنے پر تلے ہیں تو آپ نے بڑے دانش مندانہ طریقہ سے ان کے ناپاک ارادوں کو حجاج کرام اور عام اسلام کو آگاہ کرنے کے لئے حج کو عین ایام حج میں چھوڑ کر نکلنے کا فیصلہ کیا تاکہ لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہو کہ حسینؑ کیوں موسم حج میں حرم کو اور حج کو چھوڑ کر نکلنے پر مجبور ہوئے؟ آپ نے حج کو ترک کر کے عراق جانے کا اعلان کیا۔ یہ معلوم ہونے پر بہت سے لوگوں نے آپ کو باز رکھنے کی کوشش کی جن میں عبداللہ ابن جعفر (جناب زینب کے شوہر) عبداللہ ابن عباس (حضرت علی کے چچازاد بھائی) محمد ابن حنفیہ (امام حسینؑ کے بھائی)، عبداللہ ابن زبیر، ابوبکر مخزومی، جابر ابن عبداللہ انصاری، عبداللہ مطیع، عبداللہ ابن عمر اور سعید ابن مسیب وغیرہ ہیں لیکن آپ اپنے جانے کا راز جانتے تھے اس لئے آپ نے ان کے مشوروں پر عمل نہیں کیا۔

تنعیم

امام حسینؑ جب ۸/ذی الحجہ کو مکہ سے عراق کے لئے نکلے تو آپ کی پہلی منزل وادیٔ تنعیم تھی جہاں آپ نے قیام کیا۔ یہ مکہ سے تین یا چار فرسخ کے فاصلہ پر ہے۔اس کے دائیں جانب ایک پہاڑ ہے جسے "نعیم" کہتے ہیں اور بائیں جانب کے

پہاڑ کو "ناعم" کہتے ہیں دونوں کے بیچ وادی کو نعمان کہتے ہیں اور اسی مناسبت سے اس جگہ کا نام "تنعیم" ہے۔ یہاں میقات کے لئے ایک مسجد ہے جس کو مسجد تنعیم یا مسجد عائشہ کہتے ہیں۔

صفاح

تنعیم کے بعد آپ کی دوسری منزل صفاح تھی۔ صفاح، صفحہ کی جمع ہے اور صفحہ عراق میں صاف ستھری جگہ کو کہتے ہیں۔ یہاں پر آپ کی ملاقات فرزدق شاعر سے ہوئی، آپ نے جب ان سے یہ پوچھا کہ "کوفہ کی کیا خبر ہے" تو فرزدق نے کہا کہ:

"لوگوں کے دل آپ کے ساتھ ہیں جب کہ ان کی تلواریں بنی امیہ کی حمایت میں ہیں"۔ یہ وہی فرزدق ہیں جنھوں نے امام زین العابدین کی حمایت میں ان کی امامت کے زمانہ میں جابر و ظالم خلیفہ ھشام بن عبدالملک سے ٹکر لے کر اپنے لئے خطرہ مول لیا تھا۔

ذات عرق

امام حسینؑ صفاح سے چل کر عراق کے راستے میں پڑنے والے علاقہ "ذات عرق" پہنچے۔ آج کل اس کو "طریق شرقی" یا "ذات عرق مندثرہ" کہتے ہیں۔ یہاں آپ کی ملاقات بشر ابن غالب سے ہوئی جو عراق سے آ رہے تھے۔ امام نے ان سے بھی اہل عراق کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے بھی وہی جواب دیا کہ "لوگوں کے دل آپ کے ساتھ ہیں لیکن ان کی تلواریں بنی امیہ کی حمایت میں ہیں"۔ ذات عرق پر عبداللہ ریاشی نے بھی امام سے ملاقات کی اور عراق کے وہی حالات بیان کئے۔

بطن عقبہ

ذات عرق کے بعد آپ بطن عقبہ پہنچے۔ وہاں جعفر ابن سلیمان ضبعی سے ملاقات ہوئی۔ وہاں سے آپ رہیمیہ پہنچے جہاں ابوھرم نامی شخص سے ملاقات ہوئی

اور آپ نے ان سے کہا کہ بنی امیہ کے لوگ میرا خون بہانا چاہتے ہیں تو میں کعبہ سے نکل کر آیا ہوں۔

حاجر

منزل رہیمیہ سے امام حاجر پہنچے۔ حاجر، حجر سے لیا گیا ہے جس کے معنی روکنے اور منع کرنے کے ہیں، یہ ایک وادی ہے جو بطن رمہ کے بعد آتی ہے۔ اسی وادی کا نام حاجر ہے۔ بصرہ سے مدینہ جانے والے اور کوفہ سے مدینہ جانے والے یہیں ایک دوسرے سے ملتے ہیں یعنی یہ بصرہ سے مدینہ جانے والے اور کوفہ سے مدینہ جانے والے راستے کا سنگم ہے۔ امام جب حاجر سے پہلے بطن رمہ میں پہنچے تو قیس ابن مسہر صیداوی کے ہاتھ ایک خط کوفہ والوں کو روانہ کیا۔ قیس کو راستہ میں ہی حصین ابن نمیر نے گرفتار کرلیا اور آپ شہید کردئے گئے۔

عیون

حاجر سے امام ''عیون'' نامی جگہ پہنچے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں سے چند چشمے نکلتے ہیں۔ یہاں عبداللہ ابن مطیع عدلی نے ان سے ملاقات کی اور انھیں روکنے کی کوشش کی لیکن امام نے ان کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی اور اپنے سفر کو جاری رکھا۔

خزیمیہ

عیون کے بعد آپ خزیمیہ پہنچے۔ کوفہ سے نزدیک یہ ایک جگہ کا نام ہے۔ امام حسینؑ نے یہاں ایک دن اور ایک رات قیام کیا۔ اسی جگہ پر جناب زینب نے امام حسینؑ سے کہا کہ انھوں نے کسی کی ایک آواز سنی جو یہ شعر کہہ رہا تھا کہ۔

''یہ قافلہ موت کی طرف بڑھ رہا ہے اور موت ان کی طرف بڑھ رہی ہے''۔

زورد

امام حسینؑ نے پھر خزیمیہ سے آگے ''زورد'' میں قیام کیا جو خزیمیہ سے ایک

میل بعد ہے۔اس کو''زورد'' کہنے کی دو وجہیں ہیں۔

(ا)حلق سے نیچے اتر جانے کو زورد کہتے ہیں چونکہ یہ ریگستانی علاقہ ہے اور یہاں کی زمین بارش کے پانی کو فوراً جذب کرلیتی ہے اس لئے اس لحاظ سے اس جگہ کو زورد کہتے ہیں۔

(۲)ایک شخص یثرب بن قانیہ کی تین بیٹیاں تھیں جن میں سے ایک کا نام''زورد'' تھا اس لئے اس کے نام سے یہ جگہ منسوب ہے۔یہی وہ مقام ہے جہاں زہیر ابن قین بجلی کی ملاقات امام حسینؑ سے ہوئی، یہ عثمانی عقیدہ کے تھے۔یہ حج کر کے مکہ سے آرہے تھے انھیں معلوم تھا کہ امام حسینؑ بھی سفر کر رہے ہیں لیکن وہ امام سے بچ کر چل رہے تھے تاکہ ملاقات نہ ہو سکے۔ایک جگہ پانی نہ ہونے کی وجہ سے مجبوراً ان کو اپنا خیمہ امام کے خیمہ کے نزدیک لگانا پڑا۔خیمہ لگانے کے بعد وہ کھانا کھانے کی تیاری کر رہے تھے کہ امام کا قاصد پہنچا اور کہا کہ امام بلا رہے ہیں۔زہیر خاموش رہے تو ان کی نیک اور صالحہ زوجہ دلہم بنت عمرو نے تعجب سے زہیر سے کہا کہ''سبحان اللہ! فرزند رسول تم کو بلا رہے ہیں اور تم ان کی آواز پر لبیک نہیں کہتے۔بیوی کے اصرار پر وہ چہرے پر ناگواری کے تاثرات لئے امام کے خیمہ میں گئے لیکن تھوڑی دیر بعد خوش خوش امام کے خیمہ سے واپس آئے اور اپنے خیموں کو امام کے خیموں کے ساتھ لگانے کے لئے کہا۔پھر اپنی زوجہ سے کہا کہ میں تم کو اجازت دیتا ہوں، تم چلی جاؤ۔میں نہیں چاہتا کہ تم خیر کے علاوہ کوئی بری خبر سنو۔

ثعلبیہ

زورد کے بعد امام حسینؑ نے ثعلبیہ پر قیام کیا۔یہ جگہ ثعلبہ بن مالک بن دودان بن اسد سے منسوب ہے۔اس نے یہاں ایک کنواں کھودا تھا۔مکہ سے ثعلبیہ پہنچنے کے بعد کوفہ کا دو تہائی راستہ طے ہو جاتا ہے۔ثعلبیہ میں عبداللہ ابن سلیم اور منذر ابن مشعل نامی دو لوگوں نے امام حسینؑ سے ملاقات کی۔یہ دونوں امام کے پیچھے پیچھے آ

رہے تھے۔ انھوں نے منزل زورد پر دیکھا کہ امام کوفہ سے آنے والے ایک شخص کی طرف شاید اس خیال سے بڑھے کہ اس سے کوفہ کے حالات معلوم کریں تو اس شخص نے اپنا راستہ بدل دیا تا کہ امام سے ملاقات نہ ہو۔ لیکن ان دونوں نے اس کو جالیا اور اس سے کوفہ کے حالات پوچھے۔ اس سے ان کو حضرت مسلم ابن عقیل اور ہانی ابن عروہ کی شہادت کی خبر ملی۔ ان دونوں نے ثعلبیہ میں یہ خبر امام کو بتائی۔ یہاں آپ نے سب کا مشورہ لیا اور آخر میں کوفہ کا سفر جاری رکھنے کا فیصلہ ہوا۔

شقوق

ثعلبیہ سے امام حسینؑ شقوق پہنچے۔ یہ ایک جگہ کا نام ہے جو مکہ سے کوفہ جاتے ہوئے زبالہ سے پہلے آتی ہے۔ یہاں بھی کوفہ سے آنے والے ایک شخص سے آپ نے وہاں کے حالات پوچھے۔ اس نے بتایا کہ کوفہ کے لوگ امام سے جنگ کے لئے متحد ہو چکے ہیں۔

زبالہ

امام حسینؑ شقوق سے زبالہ پہنچے۔ یہاں ایک قلعہ ہے اور بنی غاضرہ کی ایک مسجد بھی ہے۔ زبالہ نام کی وجہ یہ ہے کہ ''زبل'' دراصل مشک میں پانی جمع کرنے کو کہتے ہیں۔ یہاں چونکہ بارش کا پانی جمع ہوتا ہے، اس لحاظ سے اسے زبالہ کہتے ہیں ۔ یہاں امام نے اپنے ساتھ آنے والوں سے خطاب کر کے کہا کہ کوفہ والوں نے بے وفائی کی ہے اور ہمیں تنہا چھوڑا ہے، ان حالات کے تحت تم لوگوں میں سے اگر کوئی واپس جانا چاہے تو وہ یہیں سے واپس چلا جائے۔ مقاتل میں لکھا ہے کہ مکہ سے نکلنے کے بعد جو لوگ آپ کے ساتھ یہاں تک آئے تھے وہ سب آپ کو چھوڑ کر چلے گئے۔

بطن عقبہ

منزل زبالہ کے بعد امام نے بطن عقبہ پر قیام فرمایا۔ یہاں عمر ابن لوذان ابن عکرمہ اور جعفر ابن سلیمان زباعی نے امام سے ملاقات کر کے کوفہ کے تشویشناک

حالات بتائے مگر امام نے کہا میں ان حالات سے خوب آگاہ ہوں۔

شراف

بطن عقبہ کے بعد امام حسینؑ نے منزل شراف پر قیام فرمایا۔ آپ اس جگہ صبح کے قریب پہنچے۔ اس سے دو میل پر واقصہ ہے۔ شراف اور واقصہ حضرت نوح کے بیٹے سام کی نسل سے دو مرد تھے۔ ان دونوں جگھوں کے درمیان تین بڑے کنوئیں تھے جن کا پانی بہت شیریں تھا۔ ان کنوؤں کو نسل عمالیق میں سے شراف نے کھدوایا تھا۔ امام نے یہاں پر اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ جتنا ہو سکے یہاں سے پانی لے کر ذخیرہ کرلیں ۔ یہاں سے کوچ کرنے کے بعد ظہر کے قریب امام نے کوفہ کی طرف سے آتے ہوئے ایک بڑے لشکر کو دیکھا۔ لشکر کو دیکھ کر آپ نے اپنی بائیں جانب ذوحسُم نامی پہاڑ کے دامن میں قیام کیا۔ آپ نے دیکھا کہ حُر کی قیادت میں ایک ہزار کا لشکر عبیداللہ ابن زیاد کے حکم پر اس غرض سے بھیجا گیا ہے کہ وہ آپ کو کوفہ کی طرف بڑھنے دے اور نہ مدینہ واپس جانے دے۔ یہ لشکر جب امام کے مقابل پہنچا تو آپ نے دیکھا کہ پورا لشکر پیاس کی شدت سے بے حال ہے۔ امام نے اپنے ساتھ والوں کو حکم دیا کہ حر کے تمام لشکر اور ان کے جانوروں کو پانی سے سیراب کیا جائے۔ پیاس بجھ جانے کے بعد حر نے امام سے یہاں آنے کی وجہ اور کہاں جا رہے ہیں کی بات پوچھی۔ امام نے حُر کو کوفہ والوں کے خطوط کے بارے میں بتایا۔ اس درمیان نماز کا وقت ہو گیا تو حُر کے لشکر نے بھی امام کی اقتدا میں نماز پڑھی۔

رہیمیہ اور قصر بنی مقاتل

امام حسینؑ نے جس جگہ حُر سے خطاب کیا تھا، وہ ایک بڑا میدان ہے۔ اس جگہ کو بیضا کہتے ہیں ، وہاں سے امام رہیمیہ پہنچے۔ یہ جگہ کوفہ سے ایک منزل پہلے ہے۔ رہیمیہ کے بعد قصر بنی مقاتل آتا ہے۔ یہاں سے امام بیس میل دور قطقطانہ یا قطقطہ پہنچے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ نماز کے بعد امامؑ نے حر سے آنے کا سبب

پوچھا تو اس نے کہا کہ آپ کو گرفتار کر کے کوفہ لے جانے کے لئے آیا ہوں۔امام نے حر کے ساتھ جانے سے انکار کیا اور وہ مشہور کلمہ کہا" تیری ماں تیرے غم میں بیٹھے "۔گفتگو کے بعد حر نے ایک حل نکالا کہ امام قادسیہ اور عذیب الہجنات کے درمیان کوئی ایسا راستہ اختیار کریں کہ نہ آپ حجاز جاسکیں اور نہ ہی میں آپ کو کوفہ لے جاؤں۔حر سے اس گفتگو کے بعد امام عذیب الہجنات پہنچے،اس اثنا میں حر آپ کے ساتھ ساتھ رہا۔

عذیب الھجنات

اس جگہ ایک نہر ہے جو قادسیہ اور مغیشہ کے درمیان ہے۔عذیب ،عذب سے بنا ہے اور عذب خوشگوار پانی کو کہتے ہیں۔یہ وہ جگہ ہے جہاں ہلال بن نافع ،مجمع بن عبداللہ مزحی،اس کا غلام عمر ابن خالد صیداوی اور طرماح وغیرہ کوفہ سے آکر امام حسینؑ کے ساتھ شامل ہوئے۔یہ لوگ کوفہ سے امام کے لشکر میں شامل ہونے کے لئے امام کی طرف آرہے تھے کہ حر نے ان کا راستہ روکا۔امام نے حر سے فرمایا کہ یہ میرے انصار و جاں نثار ہیں اور میرے لشکر میں شامل ہیں اگر تم نے ان کا راستہ روکا تو میں مزاحمت کروں گا۔اس پر حر نے انھیں شامل ہونے دیا۔اس کے بعد امام قصر بنی مقاتل کی طرف روانہ ہو گئے۔

قصر بنی مقاتل

یہ جگہ مقاتل بن حسن تگالیہ سے منسوب ہے۔

امام نے یہاں پہلے سے ہی ایک بہت بڑا خیمہ لگا دیکھا جو عبیداللہ ابن حر جعفی کا تھا۔یہ شخص لوٹ مار کر کے مال دار ہو گیا تھا۔یہ حضرت علی کا مخالف تھا اور جنگ صفین میں معاویہ کے ساتھ تھا۔امام اتمام حجت کے لئے اس کے پاس گئے لیکن اس نے صاف جواب دیا کہ وہ ابھی مرنا نہیں چاہتا۔اس نے آپ کو اپنا گھوڑا پیش کیا جسے امام نے منظور نہ کیا۔امام نے اس جگہ پانی کا ذخیرہ کیا اور وہاں سے آگے روانہ ہو

گئے۔اب اس کے بعد امام جہاں پہنچے ہیں وہی آپ کی منزل شہادت تھی جسے کربلا کہتے ہیں۔آپ ۲ رمحرم کو کربلا پہنچے تھے۔

کربلا

امام حسینؑ جب کوفہ کے اطراف میں واقع نینوا کے مقام پر پہنچے تو آپ نے دیکھا کہ اونٹ پر سوار ایک شخص جس کا نام مالک بن نصر تھا وہاں پہنچا۔اس نے کوفہ کے گورنر عبید اللہ ابن زیاد کی طرف سے ایک خط حر کو دیا۔یہ خط پڑھ کر حر نے امام حسینؑ کا راستہ روکا۔آپ نے حر کو اس سمجھوتے کی یاد دلائی جس کے تحت امام اس راستہ پر سفر جاری رکھ سکتے تھے جو نہ کوفہ جاتا ہو نہ مدینہ۔حُر نے کہا کہ ابھی ابھی مجھے حکم ملا ہے کہ میں آپ کو آگے نہ بڑھنے دوں اور آپ کو ایسی جگہ قیام کرنے پر مجبور کروں جہاں پانی وغیرہ نہ ہو۔یہ قاصد میرے اوپر جاسوس ہے۔میں مجبور ہوں کہ اب آپ کو اور زیادہ سہولت نہیں دے سکتا۔اس اثنا میں آپ کی سواری نے بھی آگے قدم بڑھانے سے انکار کیا۔آپ نے اس جگہ کا نام پوچھا تو زہیر ابن قین نے کہا کہ اس سر زمین کا نام ''طف'' ہے آپ نے پوچھا کہ کیا اس کا کوئی اور نام بھی ہے تو زہیر نے کہا اسے ''کربلا'' بھی کہتے ہیں۔یہ سنتے ہی آپ نے فرمایا کہ ''ہم کرب و بلا سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں'' اس کے بعد آپ نے کہا کہ ''ہم یہیں رکیں گے''۔

اس منزل شہادت پر پہنچ کر محرم میں جو کچھ امام اور ان کے قافلہ پر گزرا وہ آپ ذاکرین سے سنتے رہتے ہیں۔چونکہ یہ میرا موضوع نہیں ہے اس لئے اسے یہاں ختم کرتا ہوں۔

بیکسوں کا سفر

۶۱ھ کے عاشورۂ محرم کا دن ختم ہو چکا تھا۔ حسینی قافلہ کے سارے مرد، بوڑھے ہوں یا جوان یا کم سن تین روز کی بھوک و پیاس کے باوجود اپنے امام کے لئے وفاداری دکھاتے ہوئے جہاد کر کے شہید ہو چکے تھے۔ حد یہ ہے کہ چھ مہینے کا ننھا اور پیاسا علی اصغر اشقیاء کے سامنے اپنی پیاسی زبان دکھانے کی شکل میں جہاد اکبر کرتے ہوئے حرملہ کا تیر سہ شعبہ کھا کر مسکراتے ہوئے خون اگل کر شہید ہو چکا تھا اور فوج یزیدی کی بے رحمی کا گواہ بن چکا تھا۔ خود قافلہ سالار امام حسینؑ عصر کے وقت سجدہ کی حالت میں شہید ہو چکے تھے۔ اس کے بعد تو یزیدی فوج کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں رہ گئی تھی۔ حسینی قافلہ میں عورتوں کے علاوہ بچ رہنے والوں میں کمسن پانچویں امام محمد باقرؑ سمیت بچے اور امام حسینؑ کے بعد ہوئے امام علی ابن الحسین زین العابدینؑ رہ گئے تھے۔ حالانکہ یہ جوان تھے لیکن اللہ کی مصلحت کہ آپ بیماری کی وجہ سے غشی کی حالت میں تھے، اگر تندرست رہتے تو ان پر بھی جہاد واجب ہوتا اور اگر وہ بھی شہید ہو جاتے تو امامت کا طے شدہ سلسلہ ختم ہو جاتا۔

جب ساری رکاوٹیں دور ہو گئیں تو یزیدی فوج نے حسینی قافلہ کے خیموں پر حملہ کر دیا اور سارا سامان لوٹ لیا۔ عورتوں کے زیورات چھین لیے گئے اور ان کو ذلیل کرنے کے لیے ان کی چادریں بھی چھین لی گئیں۔ ظلم کی انتہا اس وقت ہو گئی جب بچوں کو مارا پیٹا جانے لگا اور خیموں میں آگ لگا دی گئی۔ یہ سب باتیں وہی ہیں جو یزیدی رپورٹر حمید ابن مسلم نے اپنی رپورٹ میں لکھی تھیں۔ بہر حال اب بچے کھچے

قافلہ کی کمانڈ علیؑ کی بیٹی زینب سلام اللہ علیہا نے سنبھالی۔ انھوں نے جلتے ہوئے خیمہ میں جا کر وقت کے امام زین العابدینؑ کو اٹھایا اور شریعت کا حکم پوچھا کہ عورتیں خیمہ میں جل کر مر جائیں یا بے پردہ ہو کر اپنی جان بچائیں؟ چوتھے امام کے کہنے پر کہ جان بچانا واجب ہے، آپ عورتوں اور بچوں اور امام کو ساتھ لے کر جلتے خیموں سے باہر آ گئیں۔ رات بھر یزیدی فوج نے انھیں ان کے حال پر چھوڑا اور دوسرے دن سفر کا پروگرام بنایا۔

۱۱ رمحرم کو حسینی قافلے کے بچے ہوئے سارے مردوں، عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا گیا۔ امام زین العابدینؑ کو طوق و زنجیر میں جکڑ کر قافلہ سالار کی حیثیت سے آگے کھڑا کر دیا گیا۔ اور عورتوں اور بچوں کو اونٹوں پر بٹھایا گیا۔ اب مسئلہ ان قیدیوں کو دمشق (سیریا یا شام کی راج دھانی) لے جانے کا تھا۔ یزیدی فوج کے سامنے تین راستے تھے۔ پہلا راستہ کربلا سے دمشق جانے کا لمبا تھا۔ ابومخنف (اصلی نام لوط بن یحییٰ) نے اپنے مقتل میں کربلا سے دمشق کی دوری اس راستے سے 1439 چودہ سو انتالیس میل لکھی ہے۔ یہ راستہ یزیدیوں کے لیے محفوظ تھا کیوں کہ اس راستے میں پڑنے والی آبادیوں میں امام حسین کے چاہنے والے کم تھے۔

دوسرا راستہ دریائے فرات کے کنارے کنارے چل کر دمشق جانے کا تھا جس کی دوری صرف 844 آٹھ سو چوالیس میل تھی۔ لیکن یزیدی اس راستے سے جانے سے ڈر رہے تھے کیوں کہ اس راستہ میں حضرت علیؑ کے شیعہ زیادہ تھے۔ تیسرا راستہ شام کے صحرا سے ہو کر جاتا تھا اور اس کی دوری بہت کم تھی یعنی کُل 644 میل تھی لیکن یہ راستہ انھیں پسند نہ تھا، کیوں کہ ایک تو اس راستہ میں آبادی نہیں تھی جس کی وجہ سے اہل بیت رسول کو جگہ جگہ دکھایا نہیں جا سکتا تھا اور دوسرے اس راستے میں پانی ملنا مشکل تھا۔ چونکہ تینوں راستے میں کوفہ ضرور پڑتا تھا اس لئے عمر ابن سعد اور شمر ملعون نے طے کیا کہ کوفہ جا کر وہاں کے گورنر عبید اللہ ابن زیاد پر فیصلہ چھوڑا جائے۔

کیا انسان دوسری دنیا کی مخلوق ہے؟

امریکہ کے ایک سائنسدان ڈاکٹر ایلیس سلور (Ellis silver) نے 2013 میں ایک کتاب "Humans are not from earth" یعنی ''انسان اس کرّہ ارض کے نہیں ہیں'' لکھ کر سائنس کی دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا ہے۔ اس کتاب میں دی گئی تھیوری نے ڈارون (Darwin) کی تھیوری (انسان پہلے بندر تھا) کو بھی رد کر دیا ہے اور ایک نئی دنیا کا سفر کرایا ہے۔

ان کے دعوے کے مطابق انسان اس سیارۂ زمین کا اصل باشندہ نہیں ہے بلکہ اس کی تخلیق کسی دوسرے سیارہ پر ہوئی ہے اور اسے اس کے اصل سیارہ سے کرّہ ارض پر بھیج دیا گیا یا پھینک دیا گیا۔ ڈاکٹر ایلس، سائنسدان کے ساتھ ساتھ محقق ،مصنف اور امریکہ کے نامور ماہر ماحولیات (Ecologist) ہیں۔ یہ بھی دھیان رہے کہ بحیثیت سائنسداں وہ کسی مذہب پر یقین نہیں رکھتے۔ ان کا کہنا ہے کہ انسان جس سیارہ میں پیدا کیا گیا اور جہاں وہ رہتا رہا وہ جگہ اس قدر آرام دہ، پرسکون اور مناسب ماحول والی تھی جسے وی وی آئی پی (VVIP) جگہ کہا جا سکتا ہے۔ وہاں انسان بہت ہی نرم و نازک ماحول میں رہتا تھا۔ اس کی موجودہ نازک مزاجی اور آرام پسند طبیعت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے اپنے اصل سیارہ پر غذا کے لئے کچھ بھی تردّد نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اس سیارہ کی یہ ایسی لاڈلی مخلوق تھی جسے اتنی آرام دہ لائف میسر تھی۔ وہ ماحول ایسا تھا جہاں سردی اور گرمی کے بجائے مسلسل بہار جیسا موسم رہتا تھا اور وہاں سورج جیسے خطرناک سیارے کی دھوپ کی الٹراوائلٹ (Ultra Violet) شعاعیں

اس کے بعد کربلا سے بیکسوں کا سفر شروع ہوا۔ جلد ہی یہ قافلہ کوفہ پہنچا۔ کوفہ سے بیکسوں کے سفر کا پورا حال ابومخنف نے اپنے مقتل میں ایک راوی سہیل شہرزوری سے لیا ہے۔ سہیل کہتے ہیں کہ جب وہ حج کر کے کوفہ پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ کوفہ کا بازار پوری طرح بند ہے۔ کچھ لوگ خوش ہیں تو کچھ رو رہے ہیں۔ اس نے ایک بوڑھے سے پوچھا تو اس نے الگ لے جا کر بتایا کہ حسینؑ اور ان کے ساتھی شہید کر دیے گئے ہیں اور یزیدی فوج ان کے اہل حرم کو لے کر ابھی آنے والی ہے۔ ابھی یہ بات ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ بگل کی آواز سنائی دی اور جھنڈے دکھائی دیے اور فوج کوفہ میں داخل ہوئی۔ یکا یک اس کی نگاہ ایک نیزہ پر امام حسینؑ کے کٹے ہوئے سر پر پڑی۔ ان کا سر سورہ کہف کی تلاوت کر رہا تھا۔ اس سر کے پیچھے امام زین العابدینؑ اور سارے قیدی تھے۔ جناب ام کلثوم بنت علیؑ پکار کر کہہ رہی تھیں کہ اے کوفہ والو! اپنی آنکھیں بند کر لو۔ کیا اللہ اور اس کے رسول سے شرم نہیں کرتے؟ ان کے اہل حرم کی طرف نگاہ کر رہے ہو جن میں نبی کی نواسیاں بھی ہیں اور سب کے سر کھلے ہوئے ہیں۔ اب سہیل نے ارادہ کر لیا کہ وہ کوفہ سے دمشق تک اہل بیت کے قافلہ کے ساتھ رہیں گے تا کہ سفر کے واقعات کو وہ خود دیکھیں۔

ادھر ابن زیاد ملعون نے لمبے راستے کو پسند کیا اور شمر اور خولی کو (1500) پندرہ سو سوار دے کر حکم دیا کہ اہل حرم کو لمبے راستے سے دمشق لے جائے اور ہر شہر میں پھراتے ہوئے لے جائے۔ سہیل اس کارواں کے ساتھ ہو لیے۔

بیکسوں کا یہ قافلہ پہلے کوفہ سے 45 میل دور قادسیہ لے جایا گیا۔ قادسیہ سے 45 میل دور بغداد اور پھر وہاں سے حساسہ کے مشرق سے روانہ ہو کر بغداد سے 90 میل دور تکریت کے پاس قافلہ پہنچا۔ شمر نے وہاں کے حاکم کو لکھا کہ فوج اور جانوروں کے لیے کھانا پانی لے کر میرے پاس آؤ کیوں کہ ہم لوگ حسینؑ کا سر لے کر آئے ہیں۔ جب حاکم نے خط پڑھا تو جھنڈا اونچا کرنے، بگل بجانے اور شہر کو

سجانے کا حکم دیا اور شہر کے ہر کونے سے لوگ بلائے گئے۔ جب یزیدی فوجیوں سے لوگوں نے پوچھا تو انھوں نے کہنا شروع کیا کہ یہ سر (معاذ اللہ) ایک خارجی کا ہے، جس نے یزید کے خلاف بغاوت کی تھی۔ اس کو ابن زیاد نے قتل کرایا ہے اور اس کا سر یزید کے پاس بھیجا ہے۔ اس پر ایک عیسائی نے کہا کہ اے لوگو! اس سر کے کوفہ شہر میں داخل ہونے کے وقت میں وہاں موجود تھا۔ یہ سر خارجی کا نہیں بلکہ تمہارے نبی کے نواسے حسینؑ کا ہے۔ یہ سن کر عیسائیوں نے صور (شنکھ) بجانا شروع کیا۔ تمام راہب آواز سن کر گرجا گھروں سے نکل پڑے اور سچائی معلوم ہونے پر کہنے لگے کہ ہم ایسی قوم سے بیزار ہیں جس نے اپنے نبی کے نواسے کو قتل کیا ہے۔ جب یزیدی فوجی دستے کو اس کی خبر ملی تو وہ لوگ شہر میں داخل نہیں ہوئے۔ یہ لوگ وہاں سے روانہ ہو کر خشکی کے راستے سے وادیٔ النخلہ پہنچے۔ وہاں رات کو جنوں کے رونے کی آواز آئی ۔فوجی دستہ وہاں سے ہوتا ہوا موصل (تکریت سے موصل کی دوری 220 میل) کے پاس جہینہ پہنچا۔ یہاں بھی انھوں نے خارجی والا جھوٹ پھیلایا لیکن آبادی والوں کو پتہ چلا کہ حسینؑ کا سر لایا گیا ہے تو موصل شہر کے اوس اور خزرج قبیلہ کے چالیس ہزار سوار اس بات پر تیار ہوئے کہ یزیدیوں سے لڑ کر سر چھین لیا جائے اور موصل میں دفن کرنے کا شرف حاصل کیا جائے۔ یزیدی دستہ کو جب یہ خبر ملی تو وہ موصل شہر میں داخل نہیں ہوئے اور وہاں سے جلدی سے سنجار کی پہاڑیوں سے ہوتے ہوئے نصیبین پہنچے۔ موصل سے یہاں کی دوری 143 میل تھی۔

نصیبین میں دشمنان اہل بیت زیادہ تھے اس لیے یزیدی دستہ نے یہاں رکنے کا فیصلہ کیا اور امام حسینؑ کے سر کو اہل حرم کے ساتھ شہر میں پھرایا۔ پھر نصیبین سے عین ہوتے ہوئے دوغان یہ قافلہ پہنچا۔ (دوری 124 میل) وہاں بھی زیادہ تر دشمنان اہل بیت تھے۔ فوجی دستہ والوں نے دوغان کے حاکم سے وہاں آ کر ملاقات کرنے کو کہا۔ حاکم نے بگل بجانے کا حکم دیا اور یہ لوگ شہر میں داخل ہوئے اور سر

سمیت اہل حرم کو پورے شہر میں پھرایا اور ایک میدان میں دوپہر سے شام تک سر کو ایک نیزہ پر چڑھا کر رکھا، شہر میں کچھ لوگ روتے تھے لیکن زیادہ تر ہنستے تھے۔ یہاں یزیدی ملعونوں کو موقع ملا اور وہ سب شراب پی کر رات بھر نشے میں پڑے رہے۔ یہاں پر امام زین العابدینؑ نے دردناک اشعار کہے۔ صبح کو سب وہاں سے روانہ ہوئے اور حلب شہر کے باہر رکے۔ (دوری 147 میل)

حلب ایک بہت بڑا شہر تھا اور اب تو بہت ہی بڑا ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں حضرت ذکریاؑ پیغمبر دفن ہیں۔ یہاں ہی وہ دَیر راہب ہے جو اب مسجد النقطہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اصل میں یہ گرجا گھر تھا جس کے ایک طرف ایک کمرے میں وہ پتھر رکھا ہے جس پر امام حسینؑ کا سر رکھا گیا تھا اور سر سے خون ٹپک کر اس پتھر پر جم گیا تھا۔ آج بھی ایسا لگتا ہے کہ پتھر پر ابھی ابھی خون ٹپکا ہے۔ وہی سرخی ابھی بھی باقی ہے۔ میں خود اس کا چشم دید گواہ ہوں کہ وہ ابھی بھی تازہ خون لگتا ہے جب کہ اس واقعہ کو گزرے ہوئے پونے چودہ سو برس سے زیادہ گزر چکے ہیں۔ ہر سال یہ پتھر ۲۷ رجب کو دھویا جاتا ہے اور اس کا پانی مومنین بانٹ لیتے ہیں۔ کیا یہ امام حسینؑ کا ایک معجزہ نہیں ہے؟ پہلا معجزہ تو وہ تھا جب کٹا ہوا سر نیزہ پر سورہ کہف کی تلاوت کر رہا تھا۔ دوسرا معجزہ یہ کہ سر دس محرم کو کٹا تھا اور پتہ نہیں کتنے دنوں بعد یہ سر حلب پہنچا تھا اور اس سر سے اتنے دنوں بعد تازہ خون نکل کر ٹپکنا اور پھر اس پتھر پر آج بھی ایسا لگنا کہ خون ابھی تھوڑی دیر پہلے ٹپکا ہے، یہ سراسر معجزہ ہے اور یزید کو حق پر ماننے والوں کے لیے عبرت ہے۔ راوی سہیل اور وہاں لگے کتبہ کے مطابق جب حلب شہر والوں نے امام حسینؑ کے قاتل دستہ کو شہر میں آنے سے منع کر دیا اور شہر کا دروازہ بند کر دیا تو وہ ملعون شہر کے باہر اسی گرجا گھر کے پاس رات گزارنے کے لیے ٹھہرے۔ راہب نے شمر اور خولی کو رشوت دے کر سر کو رات بھر کے لیے لے لیا اور احترام کے ساتھ ایک کمرے میں ایک پتھر پر رکھ دیا۔ رات کو اس نے اس کمرے میں بہت روشنی

دیکھی۔اس نے بعد میں سر کو مخاطب کرتے ہوئے ماجرا پوچھا تو امام کے سر نے سارا واقعہ بتایا اور پھر اس پتھر پر اس سر سے خون ٹپکا جو آج تک موجود ہے۔نوٹ:۔گرجا گھر کے پاس ہی ایک پہاڑی ہے جہاں ایک بچے کی قبر ہے وہاں لگے کتبہ کے مطابق امام حسینؑ کی ایک زوجہ کے یہاں اس مقام پر ولادت ہوئی تھی لیکن اس بچے نے وہیں دم توڑ دیا تھا۔

اب یہاں سے ہم پھر راوی سہیل کے بیان کی طرف لوٹ آتے ہیں کہ حلب سے بیکسوں کا یہ قافلہ یزیدی فوجی دستہ کے ساتھ قنصرین (دوری ۱۹ میل) پہنچا۔اس شہر کے لوگوں نے بھی شہر کا دروازہ بند کر دیا اور یزیدیوں پر پتھر پھینکتے ہوئے کہتے تھے کہ ہم تمھیں شہر میں داخل نہیں ہونے دیں گے چاہے ہم سب مارے جائیں۔یزیدی دستہ یہاں نہ ٹھہر کر معرۃ النعمان (دوری 20 رمیل) پہنچا۔یہاں کے لوگ دشمنان اہل بیت تھے۔شہر والے اس کارواں کے استقبال کے لیے شہر کا دروازہ کھول کر آئے۔یزیدیوں کے لیے کھانے پینے کا انتظام کیا۔یزیدی دستہ ایک دن وہاں رہ کر شیرز (دوری 40 میل) پہنچا۔یہاں کے لوگوں کو جب معلوم ہوا تو وہ اس دستہ سے لڑے جس میں 70 مومنین شہید اور 76 یزیدی مارے گئے۔کسی طرح یہ قافلہ کفر تاب (دوری ۱۰ میل) پہنچا۔یہاں بھی لوگوں نے شہر کا دروازہ بند کر دیا۔خولی نے ان لوگوں سے پانی مانگا تو شہر والوں نے قسم کھا کر کہا کہ ہم تم کو ایک بوند پانی نہ دیں گے کیوں کہ تم نے نبی کے نواسے حسینؑ اور ان کے ساتھیوں پر پانی بند کر دیا تھا۔

یہاں سے یہ لوگ سیبور پہنچے جو پاس ہی میں تھا۔یہاں بوڑھوں کے سمجھانے کے باوجود جوانوں نے کہا کہ ہم ان ظالموں کو اپنے شہر سے گزرنے نہیں دیں گے اور جا کر پل کو توڑ دیا اور تلواریں کھینچ کر نکل پڑے اور یزیدیوں پر حملہ کر دیا۔گھماسان کی لڑائی ہوئی اور خولی کے 600 ساتھی مارے گئے اور وہاں کے جوانوں

میں سے صرف پانچ شہید ہوئے۔ جناب ام کلثوم کو جب معلوم ہوا تو انھوں نے اس شہر کا نام پوچھا۔ جب لوگوں نے بتایا کہ سیبور تو انھوں نے دعا دی کہ اللہ یہاں کے پانی کو میٹھا اور غلہ سستا رکھے اور ظالموں کا قبضہ ان پر سے اٹھائے۔

ظالم سیبور سے بھاگ کر حماہ (کفرتاب سے دوری 40 میل) پہنچے۔ یہاں بھی سخت مخالفت ہوئی تو وہاں سے چل کر یزیدی حمص (دوری 28 میل) پہنچے۔ وہاں کے حاکم نے توان کا استقبال کیا اور شہر میں لایا لیکن وہاں کے لوگوں نے پتھر برسانا شروع کر دیے جس سے 26 ظالم جہنم رسید ہوئے۔ حمص ہی وہ جگہ ہے جہاں جناب سکینہ شمر ملعون سے پانی مانگتی رہیں لیکن ملعون نے انھیں پانی نہ دے کر سارا پانی بہا دیا۔ بہر حال حمص سے یزیدی ظالم بھاگے اور وہاں سے بَعلبکّ (دوری 58 میل) پہنچے اور وہاں کے حاکم کو خبر کی۔ اس دشمن خدا نے لونڈیوں کو گانے بجانے کا حکم دیا۔ جھنڈے کے پھریرے کھلوا دیے اور بگل بجوایا۔ یزیدیوں کو خوش بو شکر اور ستّو دیا۔ جناب ام کلثوم نے اس شہر کے لیے بد دعا دی کہ اللہ یہاں کی سبزیوں کو برباد اور پانی کو نمکین کر دے۔

بعلبک سے یہ ظالم عسقلان (دوری 185 میل) پہنچے۔ یہاں بھی مظلوم قیدیوں اور سروں کو شہر میں پھرایا گیا۔ وہاں سے چل کر ظالم آخر کار دمشق (دوری 175 میل) پہنچے۔ اور اس طرح بیکسوں کا یہ سفر دمشق میں جا کر تمام ہوا۔

دمشق میں کیا کیا ہوا یہ ایک الگ موضوع ہے۔ بعد میں ان مظلوموں کو ایک قید خانہ میں رکھا گیا۔ مولانا سید محمد مہدی طباطبائی مرحوم بحر العلوم کے منظومہ صفحہ 104 میں دی گئی نعمان ابن منذر بدائنی کی روایت کے مطابق امام زین العابدینؑ نے کہا تھا کہ ہم کو ایسے قید خانہ میں رکھا گیا تھا جس پر چھت نہیں تھی اس لیے ہم لوگ گرمی اور سردی سے محفوظ نہیں تھے۔ آخر کار اسی قید خانہ میں سکینہ (وہاں رقیہ کے نام سے

موسوم) کا انتقال ہوگیا اور وہیں دفن ہوئیں۔ آج وہاں ان کا شاندار روضہ ہے۔

آخر کار ان مظلوم قیدیوں کو رہائی ملی اور دمشق سے دوبارہ کربلا گئے۔ اس سلسلہ میں دو روایتیں ہیں۔ پہلی تو یہ کہ اسی سال یعنی 61 ہجری کے 20 صفر کو یہ لوگ کربلا پہنچے اور دوسری روایت کے مطابق دوسرے سال یعنی 62 ہجری میں یہ لوگ کربلا آئے اور اس کے مطابق وہ سال بھر قید رہے۔ اگر ہم کربلا سے دمشق اور پھر وہاں سے کربلا کی دوری کو جوڑ لیں تو کل جوڑ 2878 میل آتا ہے اور سچائی یہ ہے کہ اتنی لمبی دوری کو قید خانہ میں رہنے سمیت 40 دن میں پار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اس میں کسی شک کی گنجائش بہت کم ہے۔ بیکسوں کا یہ سفر دوسرے سال 62 ہجری میں کربلا پہنچ کر مکمل ہوا۔ وہاں سے پھر وہ لوگ اپنے وطن مدینہ گئے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ ان مظلوموں کے ساتھ ہونے والے ظلم کے لیے ظالموں کے خلاف عذاب نازل کر جہنم میں جگہ دے۔ آمین

آخری خلیفہ

یہاں میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کہ رسول کا خلیفہ اجماع، نامزدگی، شوریٰ یا قہر و غلبہ سے بنے گا یا پھر منصوص من اللہ ہوگا۔ ہمیں تو اس بات پر غور کرنا ہے کہ رسول اسلام کے بعد کسی نبی کو نہیں آنا تھا اور ان کی شریعت آخری تھی تو خلیفہ کی ضرورت اس لیے ہوگی کہ وہ اس شریعت کا پاسبان ہو اور یہ سلسلہ قیامت تک چلتا رہے تاکہ زمانہ کو دوبارہ کسی نبی کی ضرورت نہ ہو۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ جب تک دنیا باقی رہے، رسول کا ایک خلیفہ بھی موجود ہو، اب ہم تاریخ اسلام کا مطالعہ کریں تو پتہ چلے گا کہ حکمرانوں کا سلسلہ بنام خلافت بہت دن چلا لیکن ترکی کی عثمانی خلافت کے دوران مصطفیٰ کمال پاشا نے اس خلافت ختم کر دیا۔ گویا چند بااثر لوگوں نے خلافت کا سلسلہ شروع کیا اور ایک مقتدر حاکم نے اس سلسلہ کو ختم کر دیا۔ بہرحال ایک بات تو طے ہوگئی کہ اس سلسلہ کی خلافت کا آخری خلیفہ ایک عثمانی خلیفہ ہوا جس کے بعد اب ہم کسی خلیفہ کا نام بھی نہیں سنتے۔ اب اگر رسول کی خلافت کا مقصد صرف حکمرانی تھا تو کوئی بات نہیں لیکن اگر خلافت رسول کا مقصد یہ تھا کہ شریعت رسول اسلام کا نفاذ اور اس کی پاسبانی رہتی دنیا تک ہو تو یہ خلافت اس پیمانے پر کھری نہیں اتری۔ لہٰذا اگر شریعت رسول کو قیامت تک باقی رہنا ہے تو رسول کی خلافت کا سلسلہ بھی قیامت تک چلنا ہے۔ اب ہمیں دیکھنا ہے کہ ایسا ہوا یا نہیں اس سلسلے میں آیئے دیکھیں کہ رسول نے اپنے خلفاء کے بارے میں کیا کہا۔

سید علی ہمدانی کی مودۃ القربیٰ میں رسول کی حدیث ہے کہ ''میرے بعد

میرے بارہ خلفاء ہوں گے جو سب کے سب بنی ہاشم سے ہوں گے'' صحیح بخاری باب ۲۹/صحیح مسلم جلد ۲/جامع ترمذی صفحہ ۲۶۹/اور سنن ابو داؤد جلد ۲/کی عبارت یہ ہے۔

''جابر ابن سمرہ سے روایت ہے کہ میں ایک دن اپنے باپ کے ساتھ رسول اللہ کی خدمت میں گیا۔ میں نے سنا پیغمبر نے فرمایا کہ ضرور یہ امر پورا نہ ہوگا، یہاں تک کہ اس میں بارہ خلفا نہ ہو جائیں۔ جابر بن سمرہ کہتے ہیں کہ آں حضرت نے اس کے بعد ایسا کلام فرمایا جو مجھ سے پوشیدہ رہا۔ پھر میں نے اپنے باپ سے پوچھا کہ رسولؐ نے کیا فرمایا؟ انھوں نے جواب دیا کہ رسولؐ نے فرمایا کہ وہ سب قریش سے ہوں گے۔

یہی بات کنز العمال اور مستدرک وغیرہ میں بھی درج ہے۔ اس سے ایک بات تو صاف ہوگئی کہ رسولؐ کے مطابق ان کے بعد ان کے خلفاء کل بارہ ہوں گے جو بنی ہاشم یا قریش سے ہوں گے۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ دنیا کی بنائی ہوئی خلافت کے یہ خلفاء رسول کے خلفاء نہ تھے کیوں کہ ان کی تعداد بارہ سے بہت زیادہ ہے۔

اب ہم یہ دیکھیں کہ رسولؐ نے اپنے بارہ خلفاء کا نام بھی ظاہر کیا ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں ہم عبداللہ ابن عباس کی روایت کردہ ایک حدیث پر اکتفا کرتے ہیں۔ اخطب خوارزمی اور شعبی نے کشف الغمہ میں ابن عباس سے روایت کی ہے کہ: ایک نقشل نامی یہودی رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سوال کیا کہ آپ کے بعد وصی و خلیفہ کون ہیں۔ رسول نے فرمایا کہ میرے بعد علیؑ ابن ابی طالب، ان کے بعد ان کے دونوں فرزند حسنؑ اور حسینؑ، ان کے بعد علی بن الحسینؑ، پھر محمد باقرؑ، پھر جعفر صادقؑ، پھر موسیٰ کاظمؑ، پھر علی الرضاؑ، پھر محمد جوادؑ، پھر علی الہادیؑ، پھر حسن عسکریؑ اور ان کے بعد محمد حجت اللہ مہدیؑ۔

علماء اہلسنت نے ابن عباس کی اس روایت پر بھروسہ نہ کرتے ہوئے

مختلف طریقہ سے بارہ کی تعداد پوری کرنے میں کھینچ تان کی ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ابوبکر، عمر، عثمان، علیؑ، امام حسنؑ، معاویہ، یزید، عبداللہ بن زبیر، عبدالملک بن مروان، ولید بن عبدالملک، سلیمان بن عبدالملک اور عمر بن عبدالعزیز کا نام جوڑ کر ۱۲ کی تعداد پوری کی ہے۔ کنزالعمال اور فتح الباری میں ۱۲ خلیفہ یہ ہیں۔ ابو بکر، عمر، عثمان، حضرت علیؑ، معاویہ، یزید، عبدالملک بن مروان، اس کے چار بیٹے، ولید، سلیمان، یزید ثانی، پھر ہشام، اور آخر میں عمر بن عبدالعزیز۔

اب اگر ہم اہلسنت کی مانیں تو آخری خلیفہ عمر بن عبدالعزیز ہوئے۔ اب اس آخری خلیفہ کے مرجانے کے بعد تو دنیا بغیر خلیفہ رسول کے چل رہی ہے۔ پھر شریعت محمدی کا محافظ کون ہے؟ کیا دنیا قیامت کے آخری دن تک بغیر خلیفہ رسول کے چلتی رہے گی؟ اس کے بعد اگر ہم عبداللہ بن عباس کی روایت کردہ حدیث دیکھیں تو خلافت کا سلسلہ جو انھوں نے لکھا ہے وہی ہم شیعوں کا عقیدہ ہے۔

جلال الدین سیوطی بہت دور کی کوڑی لائے ہیں۔ انھوں نے تاریخ الخلفاء میں سات تو اپنے عقیدے والے سلسلہ کو مانا ہے یعنی ابوبکر، عمر، عثمان، حضرت علیؑ، امام حسنؑ، معاویہ، عبداللہ بن زبیر، اور چھلانگ لگا کر آٹھواں عمر بن عبدالعزیز کو مانا ہے۔ ان کے حساب سے یہ ضروری نہیں ہے کہ ان خلفاء کا زمانہ تسلسل سے ہو۔ اسی لیے انھوں نے نواں مہدی عباسی کو مانا ہے جو عمر بن عبدالعزیز کے بعد ۱۹ر خلفاء گزر جانے کے بعد ہوا تھا۔ دسواں انہوں نے طاہر عباسی کو مانا ہے جو مہدی عباسی کے مر جانے کے بعد سولہ خلفاء بیچ میں گزرنے کے بعد ہوا۔ بقیہ بارہ میں دو بچے تو انھوں نے گیارہویں کا نام تو نہیں بتایا مگر بارھواں امام مہدی کو مانا جو ہونے والے تھے۔ بہر حال سنی علماء صرف قیاس سے کام لیتے رہے۔ یہ سوال اپنی جگہ موجود رہا کہ بارہ میں سے کسی خلیفہ کے مرنے کے بعد جو بیچ میں خلا رہا اس وقت محافظ شریعت کون تھا۔ لہٰذا حدیث رسول کی روشنی میں اہل سنت کے تمام قیاسات باطل ہیں۔

اب رہی شیعوں کی بات تو ہمارے عقیدے کے مطابق آخری خلیفہ امام مہدیؑ ہیں ۔ یہاں اگر اہل سنت اعتراض کریں تو آخری خلیفہ اتنے دن زندہ کیسے رہا اور قیامت تک کیسے رہے گا تو کارخانۂ قدرت پر اعتراض ہے۔ جب اللہ نے یہ طے کرلیا کہ رسول اسلام کے خلیفہ بارہ ہوں گے تو اس کی تعداد کو بڑھنے سے روکنے کے لیے ایک ہی حل ہے کہ اس آخری خلیفہ کو قیامت بپا ہونے تک باقی رکھا جائے۔اسی لیے اللہ نے یہ انتظام کیا کہ آخری خلیفہ کو پہلے غیبت صغریٰ میں رکھا پھر غیبت کبریٰ شروع ہوگئی۔اس دوران آخری خلیفہ زندہ بھی ہے۔،اس پر عمر کے تقاضے اثر انداز نہیں ہورہے ہیں اور وہ غیبت میں رہ کر ہدایت کا کام بھی انجام دے رہا ہے۔ہمیں اس غیبت پر شک اس لئے نہیں ہونا چاہئے کہ حضرت خضر پیغمبر بھی اللہ کے حکم سے پردہ میں ہیں اور حضرت موسیٰ تک کو ہدایت دے چکے ہیں۔لہٰذا غیبت کا عقیدہ ہی آخری خلیفہ کے لئے پیدا ہونے والے ہر سوال کا جواب ہے۔

اب ہم ذرا رسولؐ اسلام کے آخری خلیفہ کی زندگی کے بارے میں بھی ذکر کرتے چلیں ۔آخری خلیفہ کا نام رسولؐ کا نام ہے۔آپ کا مشہور لقب مہدی ہے،اس کے علاوہ مشہور القاب قائم ، حجت اور بقیۃ اللہ ہیں۔آپ کے والد ہمارے گیارھویں امام حسن عسکریؑ ہیں ،آپ کی والدہ قیصر روم کی پوتی نرجس ہیں۔آپ عراق کے شہر سامرہ میں ۱۵ر شعبان ۲۵۵ھ بروز جمعہ پیدا ہوئے۔سامرہ ہی میں آپ کے والد کا روضہ ہے،آپ ۸ر ربیع الاول ۲۶۰ھ کو آپ کے والد کی زہر سے شہادت کے بعد خلافت کے عہدہ پر فائز ہوئے۔گیارھویں امام کے روضہ کے سامنے ایک تہہ خانہ ہے جسے سرداب کہتے ہیں۔اپنے والد کی نماز جنازہ پڑھانے کے بعد معتمد عباسی خلیفہ کے شر سے بچنے کے لئے اللہ کے حکم سے اس سرداب میں داخل ہو گئے اور وہیں سے غیبت صغریٰ کا دور شروع ہوگیا تھا۔

امام مہدی علیہ السلام کے بارے میں رسول اکرم کی حدیث میں کی گئی

بالکل نہیں تھیں۔ جو اس کی برداشت سے باہر اور تکلیف دہ ہوسکتی تھی۔ کبھی اس مخلوق یعنی انسان سے کوئی غلطی ہوئی اور اسی غلطی کی وجہ سے اسے آرام دہ ماحول سے نکال کر زمین میں پھینک دیا گیا۔ جس نے انسان کو اس سیارہ سے نکالا، لگتا ہے کہ وہ کوئی ایسی طاقتور ہستی تھی جس کے کنٹرول میں سیاروں اور ستاروں کا نظام بھی تھا۔ وہ جسے چاہتا جس سیارہ پر چاہتا، جزا یا سزا کے طور پر کسی بھی طرح بھجوا سکتا تھا۔ وہ مخلوقات کو پیدا کرنے پر بھی قادر تھا۔ ڈاکٹر سلور کا کہنا ہے کہ زمین کسی ایسی جگہ کی مانند تھی جسے جیل قرار دیا جاسکتا ہے کہ جہاں صرف مجرموں کو سزا کے طور پر بھیجا جاتا ہو۔ کیونکہ زمین کی شکل کالا پانی جیل کی طرح ہے۔ خشکی کے ایک ایسے ٹکڑے کی شکل جسکے چاروں طرف سمندر ہی سمندر ہے۔ اور وہاں انسان کو بھیج دیا گیا۔ ڈاکٹر سلور ایک سائنٹسٹ ہیں جو مشاہدات کے بعد ہی کوئی رائے قائم کرتے ہیں۔ ان کی کتاب میں اس تھیوری کے سلسلے میں سائنسی دلائل کا ایک انبار ہے جن سے انکار ممکن نہیں۔ ان کے دلائل کی بڑی بنیاد جن نقطوں پر ہے ان میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ زمین کی کشش ثقل (Gravity) میں اور جہاں سے انسان آیا ہے وہاں کی کشش ثقل میں بہت زیادہ فرق ہے۔ جس سیارہ سے انسان آیا ہے وہاں کی کشش ثقل زمین سے بہت کم تھی، جس کی وجہ سے انسان کے لئے چلنا پھرنا، بوجھ اٹھانا وغیرہ بہت آسان تھا۔ اسی لئے انسان کے اندر کمر درد کی شکایت زیادہ تر کشش ثقل کی وجہ سے ہے۔ کیوں کہ یہاں زمین پر رہنے والی تمام مخلوق کی ریڑھ کی ہڈی ان کے متوازی (Parallel) پائی جاتی ہے. جبکہ انسان وہ واحد مخلوق ہے جس کی ریڑھ کی ہڈی نوے درجے کے زاویہ پر ہے۔

۲۔ انسان میں جتنے دائمی امراض پائے جاتے ہیں وہ کسی ایک بھی مخلوق میں نہیں۔ ڈاکٹر ایلس لکھتے ہیں کہ آپ اس دنیا میں ایک بھی ایسا انسان دکھا دیجئے جسے کوئی ایک بھی بیماری نہ ہو تو میں اپنے دعویٰ سے دست بردار ہوسکتا ہوں۔ وہیں کسی

پیشین گوئیوں کے علاوہ آپ کے آخری خلیفہ ہونے کی شہرت اتنی عام تھی کہ ہر امام کے دور میں اس کا چرچا ہوتا رہا۔۔امام جعفر صادقؑ کے دور میں اسماعیل حمیری نے آپ کے بارے میں قصیدہ پڑھا تھا جس کے دو اشعار ثبوت کے لئے کافی ہیں۔

''ان کے لئے ایک غیبت ہے جس میں وہ نگاہوں سے پوشیدہ ہو جائیں گے۔اللہ کا درود وسلام ہو اس غائب پر۔

وہ ایک مدت تک غیبت کے پردے میں رہیں گے اور پھر ظہور فرمائیں گے اور مشرق ومغرب کو عدل وانصاف سے بھر دیں گے''۔

الفصول المھمہ صفحہ ۲۵۱ ر میں امام رضا علیہ السلام کی حدیث ہے جو انھوں نے دعبل خزاعی (مشہور شاعر) کو مخاطب کر کے کہی تھی کہ:

''اے دعبل! میرے بعد میرا فرزند محمدؑ (محمد تقیؑ) ان کے بعد ان کا فرزند (علی نقیؑ) اور ان کے بعد ان کا فرزند حسنؑ (حسن عسکریؑ) امام ہو گا جن کے بعد ان کے فرزند حجتؑ قائم امام ہوں گے کہ ان کی غیبت میں ان کا انتظار کیا جائے گا۔جب ان کا ظہور ہو گا تو ہر ایک پر ان کا حکم نافذ ہو گا اگر دنیا کا صرف ایک دن باقی رہ جائے گا تو خدا اس دن کو اتنا زیادہ طولانی کر دیگا کہ امام قائمؑ کا ظہور ہو اور وہ زمین کو اس طرح عدل وانصاف سے بھر دیں جس طرح وہ ظلم وجور سے بھری تھی''۔

غیبت صغریٰ: گیارھویں امام کی شہادت کے بعد ۲۶۰ھ سے ۳۲۹ھ تک تقریباً ۶۹ سال غیبت صغریٰ کا زمانہ ہے۔

غیبت کبریٰ: ۳۲۹ھ کے بعد سے جب تک آپ کا ظہور نہیں ہوتا وہ زمانہ غیبت کبریٰ کا ہے۔

غیبت صغریٰ کے دور میں امام کے الگ الگ وقت میں چار نائب ہوئے جنھیں نواب اربعہ کہا جاتا ہے۔ان کے نام یہ ہیں

(۱) جناب ابو عمر و عثمان بن سعید عمری (۲) جناب ابو جعفر محمد بن عثمان بن سعید

عمری (۳) جناب ابوالقاسم حسین بن روح نوبختی، یہ وہی حسین بن روح ہیں جن کو مخاطب کر کے ہم لوگ پندرہ شعبان کی شب میں عریضہ ڈالتے ہیں۔(۴) جناب ابوالحسن علی بن محمد سمری۔امام ان حضرات کے ذریعہ سے شیعوں کے مسائل کا حل بتاتے تھے۔

غیبت کبریٰ میں مسلمانوں کے امور ''ولی فقیہہ'' کو سپرد کیے گئے۔گرچہ فتویٰ، قضاوت اور حکم دینے کا منصب پہلے ہی ائمہ علیھم السلام کی طرف سے فقہاء کو دیا جا چکا تھا لیکن فقہا کی مرجعیت اور رہبری غیبت کبریٰ سے شروع ہوئی اور امام کے ظہور تک قائم رہے گی۔

آخر کیوں؟

ہر تعلیم یافتہ یا سمجھدار آدمی آج کے سائنسی دور میں جب شریعت کی کسی بات کے بارے میں سنتا ہے تو اس کے دماغ میں بے ساختہ یہ بات آتی ہے کہ یہ کیوں؟ ایسا کیوں؟ یا آخر کیوں؟ یعنی اس کا دماغ اس بات کے پیچھے کی وجہ ڈھونڈھنے لگتا ہے اور اگر کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی ہے تو وہ اللہ کا حکم سمجھ کر خاموش ہو جاتا ہے لیکن اس کا دل مطمئن نہیں ہوتا۔ میرا اپنا پختہ عقیدہ یہ ہے کہ اللہ نے انسان کی بھلائی کو دھیان میں رکھتے ہوئے کسی چیز کو حلال یا کسی چیز کو حرام کیا ہے لیکن انسان اپنے دل کے اطمینان کے لیے وجہ جاننا چاہتا ہے۔ اس میدان میں ہم ہی لوگ اکیلے نہیں ہیں بلکہ حضرت ابراہیم جیسے اولوالعزم پیغمبر یہ جاننا چاہتے تھے کہ اللہ مردوں کو دوبارہ زندہ کیسے کرے گا اور اللہ نے ان کے اطمینان قلب کے لئے پرندوں کو مردہ کروایا اور پھر دوبارہ زندگی دی۔

یہاں یہ بتانا مناسب ہوگا کہ مشہور عالم دین شیخ صدوق نے ہر چیز کی وجہ بتانے کے لئے ایک کتاب ''علل الشرائع'' لکھی تھی جس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے لیکن یہ کتاب بہت سی باتوں کی وجہ لکھتی تو ہے لیکن وہ وجہ مطمئن نہیں کرتی۔ ظاہر ہے کہ ان کا دور سائنسی دور نہ تھا۔ مثال کے طور پر فقہ جعفریہ میں بغیر چھلکے والی مچھلی کھانا حرام ہے۔ میرے دماغ نے وجہ جاننی چاہی، علل الشرائع کو دیکھا تو اس میں ایک روایت ضرور ملتی ہے جس میں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بغیر چھلکے والی مچھلی، گدھ اور گدھے کا گوشت نہیں کھایا اور بلال سے اعلان کروایا کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بام مچھلی سمیت بغیر

چھلکے والی مچھلی ، گدھ اور پالتو گدھے کے گوشت کو حرام قرار دیا لیکن کیوں حرام ہے ،اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالی ۔اس کیوں ؟ کا جواب مجھے 1984ء میں ملا جب میں بنارس میں یونین بینک کا ڈسٹرکٹ منیجر تھا اور یونین بینک لیڈ بینک ہونے کی وجہ سے سرکاری محکمے اپنی اپنی اسکیمیں بینکوں کے توسط سے چلانے کے لئے میری مدد لیتے تھے ۔اسی سلسلے میں مچھلی پالنے کی اسکیم کو بڑھاوا دینے کے لئے بنائے گئے محکمہ نے تالاب میں مچھلی پالنے کی ترکیب بتانے کے لئے ایک ٹریننگ پروگرام میرے بینک میں رکھا ۔انھوں نے مجھے تالاب سے مچھلی دلانے کا آفر دیا ۔میں نے کہا ہم لوگ صرف چھلکے والی مچھلی کھاتے ہیں ۔محکمہ کے افسر کو میری بات پر بہت تعجب ہوا ۔اس نے کہا ہم لوگ بھی تالاب میں پانچ طرح کی صرف چھلکے والی مچھلی ڈلواتے ہیں ۔میں نے پوچھا کیوں؟ اس نے بتایا کہ چھلکے والی مچھلی سبزی خور ہوتی ہے اور مردار نہیں کھاتی ۔اس لئے انسانی جسم کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا ۔جب کہ بغیر چھلکے والی مچھلی مردار کھاتی ہے اور گندگی بھی کھاتی ہے اور وہ انسانی جسم کو نقصان پہنچا سکتی ہے ۔یہ سنتے ہی اس میں اللہ کی حکمت کا پتہ چل گیا اور کیوں؟ کا جواب پاکر دل مطمئن ہو گیا۔

حال ہی میں ڈاکٹر محمد حسین اکبر صاحب کی کتاب ''اسلام اور نئی منزلیں '' ماہنامہ اصلاح کے آفس سے پڑھنے کو ملی ۔مصنف نے اس کتاب میں بہت سے کیوں؟ کا سائنسی اور دل کو مطمئن کرنے والا جواب دیا ہے ۔میں قارئین کے سامنے ان میں کچھ کو رکھنا چاہتا ہوں ۔

ا ۔ناخن کاٹنا اور مونچھیں چھوٹی کرنا:

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ ''ناخنوں کو کاٹو اور مونچھوں کو چھوٹا کرو کیوں کہ شیطان لمبے ناخنوں کے نیچے اور بڑی مونچھوں میں اپنے ٹھکانے بناتا ہے''۔

ہم یہاں شیطان کا نام پڑھ کر چونک جائیں گے کہ اس میں شیطان کہاں سے آ گیا ۔لیکن یہاں شیطان سے مراد ہمارا پرانا دشمن شیطان نہیں ۔یہاں شیطان کا

مطلب کچھ اور ہے۔ عربی لغت ''المنجد'' کے مطابق ''شیطان بہت ہی شریر روح ہے ۔عرب ہر بے لگام اور منہ زور چیز کو شیطان کہتے ہیں''لغت ''مجمع البحرین''میں ہے کہ ''عرب ہر بے لگام اور منہ زور چیز کو شیطان کہتے ہیں چاہے وہ انسانوں میں ہو ،جانوروں میں یا دوسری مخلوقات میں ہو''اس سے یہ بات صاف ہوئی کہ نقصان پہنچانے والے کیڑے مکوڑے یا جراثیم بھی شیطان کہلائیں گے۔اب حدیث صاف ہے کہ ناخنوں کو کاٹو اور مونچھوں کو چھوٹا کرو ورنہ ناخن کے نیچے کی گندگی کے جراثیم اور مونچھوں کے نیچے پلنے والے جراثیم انسان کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

۲۔ آب جاری میں پیشاب نہ کرنا:

امام جعفر صادقؑ کی حدیث ہے کہ ''آب جاری میں پیشاب مت کرو کیوں کہ پانی میں بھی خدائی مخلوق رہتی ہے اور انھیں پیشاب و پاخانے سے تکلیف نہ پہنچاؤ'' (وسائل الشیعہ اور مستدرک الوسائل) اگر ان مخلوق کو اچھے جراثیم مان لیں تو وہ اس گندگی سے مر جاتے ہیں۔انھیں اچھے جراثیم میں سے ایک معدہ میں وٹامن ''بی'' پیدا کرتے ہیں۔

۳۔ وبائی جراثیم:

صحیفۂ سجادیہ میں امام زین العابدینؑ کی ایک دعا ہے کہ ''اللہ ان کافروں کے پانی میں وبائی جراثیم ملا دے اور ان کی غذا میں امراض کو شامل کر دے۔آج کے سائنس نے یہ مان لیا ہے کہ پانی وبائی جراثیم پنپنے کا سب سے بڑا مرکز ہے اور اکثر وبائی امراض پانی ہی سے پھیلتے ہیں۔

۴۔ جذام کے جراثیم۔

امام جعفر صادقؑ کی حدیث ہے کہ ''جو آدمی جذام کا مریض ہو، اس سے بات نہ کرو مگر یہ کہ اس کے اور تمہارے درمیان ایک نیزے کے برابر (تقریباً ڈیڑھ میٹر) کی دوری ہونی چاہئے۔(طب الصادق)

میڈیکل سائنس کے ماہر موجودہ ڈاکٹروں نے یہ ثابت کیا ہے کہ جذام کے جراثیم مریض سے ڈیڑھ میٹر تک ہوا میں پھیلے ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے کہ ''جذام کے مریض سے اس طرح دور رہو جس طرح شیر سے ڈر کر بھاگتے ہو''۔آج کی ریسرچ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جذام کے جراثیم کی شکل بھی شیر کی طرح ہوتی ہے اور ان کا نقصان بھی اسی طرح ہوتا ہے۔

۵۔ اُبلا ہوا پانی:

امام رضاؑ کی حدیث ہے کہ ''ابلا ہوا پانی ہر چیز کو فائدہ پہنچاتا ہے۔اور کسی چیز کو نقصان نہیں پہنچاتا'' آج جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ جراثیم کی بڑی تعداد پانی میں پائی جاتی ہے تو وہ کون سا آسان اور سستا طریقہ ہے جس سے پانی کو جراثیم سے پاک کیا جا سکے، وہ صرف پانی کا ابالنا ہے۔آج کل آپ ٹی، وی اور اخبارات میں دیکھتے ہوں گے جس میں کہا جاتا ہے کہ پانی ابال کر پیو۔امام جعفر صادق علیہ السلام کا قول ہے کہ روزہ گرم پانی سے کھولا کرو۔اس سے تم بیماریوں سے بچو گے۔چین میں لوگ ہر کھانے کے وقت پینے کے لئے ہمیشہ گرم پانی استعمال کرتے ہیں۔

۶۔ غسل مس میت۔:

اسلامی قانون کے مطابق اگر کوئی آدمی میت کے ٹھنڈے جسم کو چھوئے یا مردہ جسم کا کوئی حصہ ٹھنڈا ہونے کے بعد کسی زندہ انسان کے بدن کے کسی حصہ سے چھو جائے تو اس پر غسل مس میت واجب ہے۔۔۔۔۔۔۔۔آخر کیوں؟

کیوں کہ نئی ریسرچ نے ثابت کیا ہے کہ جسم سے روح کے نکل جانے کے بعد اس مردہ جسم پر اسٹافل کوکس (Staphil Coccus) اور اسٹرپٹوکوکس (Strepto Coccus) اور دوسرے کئی جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں جس سے یہ مردہ بدن بہت سے دوسرے طرح

کے زہریلے اور نقصان دہ جراثیم کو اپنانے لگتا ہے۔ ہر مربع سنٹی میٹر جلد پر چالیس ہزار جراثیم اپنی جگہ بناتے ہیں۔ جب انسان کو موت آتی ہے تو اندرونی گندگی اور زہریلے جراثیم اپنے زہر کو پسینے کی صورت میں بدن پر ظاہر کرتے ہیں اور یہ اوپر آئی گندگی یا پسینہ زندہ انسان کے لئے خطرناک ہوسکتا ہے۔ اس لئے زندہ انسان کو فوراً غسل کرنا چاہئے۔ میت کو جراثیم سے پاک کرنے کے لئے پہلے سدر کے پانی سے، پھر کافور کے پانی سے غسل دیتے ہیں کیوں کہ دونوں اینٹی بایوٹک ہیں۔ بعد میں صاف پانی سے غسل دیتے ہیں۔

۷۔ تیمم

تیمم مٹی سے کیوں؟ کیوں کہ مٹی میں سب سے عمدہ اور اعلیٰ اینٹی بایوٹک ہے پنسلن (Penicillin) کا انجکشن مٹی سے ہی حاصل کیا جاتا ہے۔

۸۔ کتے سے پرہیز:

ریسرچ نے ثابت کیا ہے کہ کتے سے میل جول رکھنے سے ایک وبائی مرض پیدا ہوتا ہے جسے فرانس میں ''گال'' کہتے ہیں۔ اس میں جسم میں کھجلی ہوتی ہے اور پھنسیوں سمیت جسم میں چھید ہو جاتے ہیں۔ کتے کے تھوک یا رال میں جراثیم کا گروہ ہے اور اگر وہ برتن کو چاٹ لیتا ہے تو یہ جراثیم برتن میں آجاتے ہیں۔ ان جراثیم کو ختم کرنے کے لئے برتن کو مٹی سے مانجنا اور پھر دھونا ضروری ہے جس کا حکم دیا گیا ہے۔

۹۔ سور کا گوشت کیوں منع ہے؟

سور کے گوشت میں ٹینیا سولی یم (Teania Solium) نامی جراثیم پائے جاتے ہیں جن پر ایک موٹا پردہ چڑھا ہوتا ہے۔ جو ابلتے پانی میں آگ کی حرارت سے بھی نہیں ہٹتا لیکن یہ جراثیم معدے میں جا کر آزاد ہو کر لاروہ (Larva) بن جاتے ہیں اور کدو کیڑے جیسے خطرناک مرض پیدا کرتے ہیں۔

سور کا گوشت کھانے والے ٹریکی نوسس (Trichinosis) نامی مرض کا شکار ہو سکتے ہیں۔ اس کے جراثیم خون کے لال ذرات (HBC) کو ختم کر دیتے ہیں جس سے بدن میں خون کی کمی پیدا ہو جاتی ہے، ہاضمہ خراب ہو جاتا ہے اور پاخانے آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ ان کا علاج مشکل ہے اور مریض موت کی طرف بڑھتا ہے۔

۱۰۔ ناک میں پانی ڈالنا:

ہم لوگ وضو کرتے وقت ناک میں پانی ڈالتے ہیں۔ اس کے پیچھے مقصد ناک کی صفائی کرنا ہے کیوں کہ ناک کے ذریعہ انسان سانس لیتا ہے۔ ساتھ ہی ناک میں پانی ڈالنے سے ناک کے اندر کے جراثیم ختم ہو جاتے ہیں۔

۱۱۔ سر کو ڈھانپ کر نہ سوئیں:

کیوں کہ منہ کو ڈھانپنے سے سانس کی صورت میں نکلنے والی کاربن ڈائی اکسائڈ جمع ہو جاتی ہے اور پھر وہی گیس بار بار بدن میں واپس جانے سے زہر پیدا کرتی ہے۔

۱۲۔ مسجد میں دایاں پیر پہلے اور پاخانے میں بایاں پیر پہلے:

ایک ڈاکٹر نے بتایا کہ انسان کے داہنے اور بائیں پاؤں میں ایک رگ کا دل سے واسطہ ہے۔ اگر اٹیک ہوا تو داہنا پیر رکھنے والا آگے گرے گا اور بایاں پیر رکھنے والا پیچھے گرے گا۔ اس لیے پاخانے میں داخل ہونے والا بایاں پیر رکھنے کی وجہ سے اٹیک ہونے پر آگے کی بجائے پیچھے گرے گا کیوں کہ اگر آگے گرتا تو گندگی میں جاتا۔ ایسے گندگی سے بچ جائے گا۔

۱۳۔ رات کو پیڑ کے نیچے نہ سونا:

ماہرین کا کہنا ہے کہ دن کی روشنی میں سورج کی کرنیں جب ہرے پتوں پر پڑتی ہیں تو روشنی کلوروفل کی موجودگی میں پانی اور کاربن ڈائی اکسائڈ مل کر پودوں کی

خوراک بناتے ہیں اور یہ پیڑ دن کو کاربن ڈائی اکسائڈ گیس کو استعمال کرتے ہیں اور آکسیجن گیس کو نکالتے ہیں جب کہ رات کو یہ عمل الٹ جاتا ہے یعنی پیڑ رات کو آکسیجن لیتے ہیں اور کاربن ڈائی اکسائڈ نکالتے ہیں جو انسان کو نقصان پہنچانے والی ہے اور پیڑ کے نیچے گہری سانس لینے سے موت بھی ہوسکتی ہے۔

اب آپ اپنے چھٹے امام جعفر صادقؑ کو سلام کیجیے جنھوں نے فرمایا تھا کہ رات کو پیڑ کے نیچے بیٹھنے اور سونے کے لیے نہ جاؤ۔

اسی طرح شریعت کے ہر حکم کی کوئی نہ کوئی وجہ ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہمیں علم نہیں۔ جیسے جیسے ریسرچ ہوتی جائے گی وجہ کا پتہ لگتا رہے گا۔ اللہ نے ریسرچ کو بڑھاوا دینے کے لئے قرآن میں بار بار غور و فکر کرنے پر زور دیا ہے۔

دنیاوی علوم بالخصوص سائنس میں مسلمانوں کی دین

راشٹریہ سہارا اردو کے ذریعے یہ خبر پہنچی کہ مغربی ممالک اور میڈیا کے لوگ اس بات کو ہوا دیتے ہیں کہ مسلمانوں میں نہ تو کوئی دنیاوی علوم کا موجد ہوا اور نہ ہی کوئی سائنسداں پیدا ہوا۔ یہ در اصل مغربی ممالک کی دھاندلی اور مسلمانوں کے تئیں تعصب ہے جس کے تحت ایسا پروپیگنڈا کیا جاتا ہے اور ہندوستانی پریس اور میڈیا چونکہ ان سے متاثر ہے اس لئے بغیر تحقیق کے ان کی بات کو مان لیتا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ بہت سے دنیاوی علوم کے موجد مسلمان تھے لیکن یورپ والوں نے گمراہ کرنے کے لئے ان کا نام اس طرح بدل ڈالا کہ کوئی سمجھ ہی نہ سکے کہ یہ لوگ مسلمان تھے۔

اپنی بات کے ثبوت میں ہم یہاں چند ہستیوں کے بارے میں لکھ رہے ہیں، جو مسلمان تھے اور انھوں نے اپنی ایجادات سے یورپ کی علمی تاریکی میں روشنی پھیلائی:

(۱) ابوالقاسم الزہراوی

زہراوی جدید سرجری کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ اس کی پیدائش ۹۳۶ء اور انتقال کا سال ۱۰۱۳ء ہے۔ اس کو یورپ والے Abul Casis کہتے ہیں۔ اس کی تین جلدوں کی میڈیکل انسائیکلو پیڈیا، ''کتاب التصریف'' کے نام سے شائع ہوئی جو مسلم اور یوروپین یونیورسٹیوں میں سولہویں صدی تک text book Standard کے طور پر پڑھائی جاتی رہی۔ اس کتاب نے سب سے پہلے پلاسٹر ،سائنس کے ذریعے لینے والی بیہوشی کا سامان Anaesthesia (انستھیسیا) اور

ایک بھی جانور کو دیکھیے اسے وقتی اور عارضی بیماریوں کو چھوڑ کر ایک بھی دائمی مرض نہیں ملے گا۔

۳۔ ایک بھی انسان زیادہ دیر تک دھوپ میں بیٹھنا برداشت نہیں کر سکتا بلکہ کچھ ہی دیر بعد اس کو چکر آنے لگتے ہیں اور وہ سن سٹروک (Sun Stroke) یعنی حدت کا شکار ہو جاتا ہے۔ جبکہ جانوروں کے لئے ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے بلکہ لگاتار دھوپ میں رہنے کے باوجود جانور نہ تو جلدی بیماری کے شکار ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی اور طرح کے مرض میں مبتلا ہوتے ہیں، جن کا تعلق سورج کی تیز شعاعوں یا دھوپ سے ہو۔

۴۔ ہر انسان یہی محسوس کرتا ہے، اور ہر وقت اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اس سیارہ کا نہیں۔ کبھی اس پر بلا وجہ ایسی اداسی طاری ہو جاتی ہے کہ جیسے کسی پردیس کے رہنے والے پر ہوتی ہے۔ چاہے وہ بیشک اپنے یہاں کے گھر میں اپنے قریبی رشتہ داروں کے پاس ہی کیوں نہ بیٹھا ہو۔

۵۔ زمین پر رہنے والی تمام مخلوقات کا ٹمپریچر (Temperature) آٹومیٹک طریقے سے ہر سیکنڈ کے بعد معمول پر (Regulate) ہوتا رہتا ہے یعنی اگر سخت اور تیز دھوپ ہے تو ان کے جسم کا درجۂ حرارت خودکار طریقے سے ریگولیٹ ہو جائے گا۔ جبکہ اسی وقت بادل آجاتے ہیں تو اس کے جسم کا ٹمپریچر سائے کے مطابق ہو جائے گا۔ وہیں انسان کے جسم میں ایسا کوئی سسٹم نہیں ہے۔ بلکہ انسان بدلتے موسم اور ماحول کی وجہ سے بیمار ہونے لگتا ہے۔ موسمی بخار کا لفظ صرف انسانوں میں ہی پایا جاتا ہے۔

۶۔ انسان اس سیارہ پر پائے جانے والے دوسرے جانداروں سے بہت مختلف ہے۔ اس کا ڈی این اے (DNA) اور جینس (Genes) اس سیارۂ زمین پر پائے جانے والے دوسرے تمام جانداروں سے بہت مختلف ہے۔

۷۔ زمین کے اصل باشندوں یعنی جانوروں کو اپنی غذا حاصل کرنا اور اسے کھانا

سرجری میں کام آنے والے دوسرے آلات سے متعارف کرایا۔

(۲) ابو علی الحسین ابن عبداللہ ابن سینا

یہ بوعلی سینا کے نام سے مشہور ہیں۔ یوروپین انھیں Avicenna کہتے ہیں۔ یہ سن ۹۸۰ء میں پیدا ہوئے اور انتقال ۱۰۳۷ء میں ہوا۔ انھیں physics میں Fundamental concept of Momentum کا بانی مانا جاتا ہے، اور Modern Medicine کا بھی باوا آدم مانا جاتا ہے۔ یہ ایران کے شہر ہمدان میں دفن ہیں۔ ان کی دوسری ایجادات مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) کیمسٹری اور انجینیر نگ

بوعلی سینا نے ہوا کے تھرما میٹر کو ایجاد کیا۔ ساتھ ہی Steam Distillation کے Chemical Process کی ایجاد بھی کی۔

(۲) Mechanics & Physics

انھوں نے رفتار کی حرکت کے تصور (Concept of Momentum) کو ٹھوس شکل دی۔ اس تصور نے نیوٹن کے دوسرے Law of Motion میں Concept of Momentum کے لئے زمین ہموار کی۔ ان کا حرکت کا نظریہ (Theory of Motion) نیوٹن کے پہلے قانون حرکت (First Law of Motion) اور دئے گئے جمود کے تصور (Concept of Inertia) سے بہت میل کھاتا ہے۔

(۳) Medicine Pathology & Physiology

بوعلی سینا نے ۱۴ رجلدوں کی میڈیکل انسائیکلو پیڈیا (Canon of Medicine) تصنیف کی جو سترھویں صدی تک مسلم اور یوروپین یونیورسٹیز میں standard text book کے طور پر رہی۔

(۳) ابوالریحان البیرونی

البیرونی کو علم کی پیمائش ارض (Geodesy) کا بانی جانا جاتا ہے اور شروع کے جیالوجسٹ (Geologist) میں سے ایک مانا جاتا ہے۔ البیرونی کی پیدائش ۱۰۰۰ء میں ہوئی اور انتقال ۱۰۴۸ء میں ہوا۔ انکی ایجادات مندرجہ ذیل ہیں:

(ا) جغرافیہ

البیرونی نے زمین کی اوپری سطح اور ان کے مختلف فاصلے ناپنے کی تکنیک ایجاد کی۔ انھوں نے زمین کا قطر (Radius) ۶.۶۳۳۹ کلومیٹر ناپا جو سولھویں صدی تک بالکل صحیح تھا۔

(ب) فلکیات (Astronomy)

البیرونی پہلے شخص تھے جنھوں نے فلکیاتی مظہر Astronomical (Phenomenon) کے متعلق تجربات کرنے شروع کئے۔ انھوں نے پتہ لگایا کہ دودھیا کہکشاں (Milky Way Galaxy) ان گنت ستاروں کا مجموعہ ہے۔

(ج) Engineering Mechanics & Physics

البیرونی نے سب سے پہلے اس کو جانا کہ تیز رفتار (Acceleration) کا عمل بے قاعدہ حرکت (Non Uniform Motion) سے جڑا ہے۔ انھوں نے لیباریٹری کے بہت سے آلات ایجاد کئے۔

(۴) جابر ابن حیّان

یوروپین انھیں جیبر (Geber) کے نام سے جانتے ہیں۔ انھیں کیمسٹری کا بانی (Father of Chemistry) کہا جاتا ہے۔ یہ ۷۱۵ء میں پیدا ہوئے اور ان کا انتقال ۸۰۰ء میں ہوا یہ امام جعفر صادقؑ کے خاص شاگرد تھے۔ ان کی ایجادات یہ ہیں:

(ا) یہ پہلے کیمسٹ تھے جنھوں نے Sulphuric Acid اور دوسرے Chemical Substance بنائے۔ ساتھ ہی لیباریٹری کے کئی آلات بنائے۔

(ب) انھوں نے نائٹرک ایسڈ (Nitric Acid) پر ایک ''کتاب الاستتمام'' (Kitab Al-istitmam) لکھی جس کا لاطینی (Latin) زبان میں ترجمہ Summa perfectionist کے نام سے ہوا۔

(ج) انھوں نے سب سے پہلے دھات کی ماہیت بدلنے (Transmutation of Metals) اور لیباریٹری میں زندگی کے نقلی وجود میں لانے (Artificial Creation of life) کے نظریہ کو پیش کیا۔

(د) انھوں نے دھات اور آکسیجن کے مادّے (Metalic oxide) جیسے (Manganese Dioxide) اور Magnesia وغیرہ کو چھوٹی مقدار میں ملا کر شیشے کو رنگین کرنے کا طریقہ پیش کیا۔ یہ شیشے کی صنعت میں ایک ترقی یافتہ اضافہ تھا جس کا پہلے لوگوں کو علم ہی نہ تھا۔

(۵) ابوجعفر محمد ابن موسیٰ الخوارزمی

خوارزمی نے حساب (Mathematics) کے میدان میں ''حساب الجبر والمقابلہ'' کو پیش کر کے دنیا کو ایک نئے علم سے روشناس کرایا جو ان کے ہی دئے نام الجبر میں الف کا اضافہ کر کے ''الجبرا'' کے نام سے مشہور ہوا اور پوری دنیا میں (Mathematics) کا ایک حصہ ہے۔ خوارزمی نے جغرافیہ پر بہت کام کیا جس کے ذریعہ ۲۴۰۲ علاقوں کے ارض وطول (Lattitude & Longitude) کو پیش کیا جو دنیا کا نقشہ بنانے میں رہنما ثابت ہوا۔

اگر اتنا سب کچھ ہونے کے بعد بھی کوئی کہے کہ مسلمانوں کا دنیاوی علوم میں کچھ بھی اشتراک نہیں تو اسے صرف دھاندلی اور مسلمانوں کے تئیں تعصب نہیں کہا جائے تو کیا کہا جائے گا۔

اسلامی اتحاد کی طرف بڑھتے قدم

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ رسولؐ اسلام کی وفات کے بعد چھوٹی چھوٹی باتوں کو لیکر مسلمانوں کے الگ الگ جتھے بننے لگے جو بعد میں فرقے بن گئے۔ اس سلسلہ میں رسول اسلام پیشین گوئی کر چکے تھے کہ "میری امت میں ۷۳ فرقے ہوں گے" اور ۷۳ فرقے بنے جن کے نام تاریخ کی کتابوں میں درج ہیں لیکن یہ تمام فرقے رسول اسلام کے قول کی روشنی میں امت مسلمہ کے جزو تھے۔ کیوں کہ یہ سب ایک اللہ ایک رسول اور ایک کتاب قرآن کو مان رہے تھے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ اسلامی شریعت کی الگ الگ تشریح کر کے سواد اعظم میں چار علماء نے اپنے طور پر اصول بنائے جو فقہ کہلائی۔ ان فقہوں کو رائج کرنے والے یہ چار حضرات امام کہلائے۔ یہ چار امام (۱) ابو حنیفہ (۲) مالک (۳) احمد بن حنبل (۴) شافعی کہلائے۔ سواد اعظم کے علاوہ ایک طبقہ شروع سے ہی آل رسول سے منسلک رہا اور انکے بتلائے راستے پر چلتا رہا۔ یہ شیعہ کہلائے۔ انھوں نے حضرت علیؑ کو اپنا پہلا امام، پھر امام حسنؑ، حسینؑ، زین العابدینؑ، محمد باقرؑ اور اس کے بعد جعفر صادقؑ کو امام مانتے چلے گئے۔ یہ سلسلہ ۱۲/اماموں تک چلتا رہا اور یہ لوگ اثنا عشری کہلائے۔ امام جعفر صادقؑ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بتائے اصول کو ایک مکمل ترتیب دی اور اسے فقہ جعفری کہا جانے لگا۔ اس طرح پانچ فقہ عالم اسلام میں رائج رہے۔ لیکن اسے بدقسمتی ہی کہا جائے گا کہ سواد اعظم نے اس فقہ کو اپنے سے الگ سمجھا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ دوریاں بڑھتی گئیں۔ تاریخ اسلام گواہ ہے کہ ان دوریوں کی وجہ سے بہت خون خرابہ

ہوا۔ امت مسلمہ میں اتحاد کی کوششیں جو ہوئیں بھی وہ ہوا میں رہ گئیں۔ یہاں تک کہ دہشت گردی نے جنم لیا اور دہشت گردوں نے خود کو سچا مسلمان سمجھ کر اور فقہ جعفری کے ماننے والوں کو کافر مان کر شیعوں کا قتل عام شروع کیا جو آج بھی جاری ہے۔

اخبارات میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد یہ خبریں ملتی ہیں کہ آج اس مسجد میں، آج اس امام باڑے میں اور مجلسوں میں شیعوں پر جان لیوا حملے ہوئے اور دھماکوں میں اتنے لوگ مارے گئے۔ دراصل یہ لوگ شیعوں کو کافر سمجھ کر انھیں ختم کرنا ثواب سمجھتے ہیں اور خود کو جنت کا حقدار سمجھتے ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ چاروں فقہوں کے علماء کی اس قتل عام پر خاموشی ان کے عقیدے کو تقویت دیتی ہے۔ اب ان کی خاموشی میں کیا مصلحت ہے یہ وہی بتا سکتے ہیں۔ پتا نہیں یہ دہشت گرد کس رسول کی سنت پر عمل کر رہے ہیں۔ تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ رسول اسلام نے فتح مکہ کے دن وہاں کے کافروں کو قتل کرنے کے بجائے امان دے دی۔ حد تو یہ ہے کہ اس حبشی کو بھی چھوڑ دیا جس نے ان کے چچا حمزہؓ کو جنگ احد میں شہید کیا تھا۔ ایک طرف رسول اسلام کا کافروں کے تئیں یہ عمل اور دوسری طرف خود کو سچا مسلمان کہنے والے دہشت گردوں کا شیعوں کو کافر کہہ کر یہ عمل۔ اب دنیا ہی فیصلہ کرے کہ کیا ان کا عمل اسلامی ہے۔ کیا خوب کسی نے کہا ہے کہ:

کسے خبر تھی کہ لے کر چراغ مصطفویؐ
جہاں میں آگ لگاتی پھرے گی بولہبی

جیسا کہ میں نے لکھا ہے کہ پہلے کے زمانے میں اتحاد کے لیے کی گئی کوششیں ہوا میں اڑ گئیں۔ موجودہ دور میں ہندوستان میں شیعہ سنی اتحاد کے لیے ایک سنجیدہ کوشش مشہور شیعہ عالم اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے نائب صدر جناب ڈاکٹر کلب صادق صاحب نے کی جب انھوں نے عیش باغ لکھنؤ کی عیدگاہ میں ایک سنی عالم کے پیچھے عید کی نماز پڑھی۔ لوگ حیرت میں تو پڑے لیکن اس وقت اس کا اثر

دوسروں پر نہ پڑا۔ لگا کہ تالی کے لیے صرف ایک ہتھیلی اٹھی ہے، لیکن ایسا نہیں ہے، اس جذبہ نے اپنا اثر دکھایا اور مجروح سلطان پوری کا یہ شعر حقیقت بن گیا:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

لوگوں نے ان کی نیک نیتی کو دیکھ کر اتحاد کی طرف قدم بڑھائے اور لکھنؤ میں ''شولڈر ٹو شولڈر'' یعنی کندھے سے کندھا نامی تنظیم بنی۔ انھوں نے یہ کام کیا کہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی نمازوں میں شیعہ امام کے پیچھے سنی نماز پڑھیں گے اور سنی امام کے پیچھے شیعہ نماز پڑھیں گے۔ دو سال سے یہ نمازیں ہو رہی ہیں۔ اس سے امید کی ایک کرن پیدا ہوئی ہے۔ امید کی جاسکتی ہے کہ دھیرے دھیرے سب لوگ قدم آگے بڑھائیں گے۔ اس سلسلہ میں دو عظیم شیعہ ہستیوں نے اپنے فتووں کے ذریعے شیعہ سنی اتحاد کی طرف قدم بڑھانے کی حوصلہ افزائی کی۔ ایران کے سپریم لیڈر آیت اللہ خامنہ ای اور دنیائے شیعیت کے سب سے بڑے اعلم اور مرجع نے تحریری فتوے دیے کہ سنی ہمارے بھائی ہیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اتحاد کی کوششیں صرف شیعوں کی طرف سے ہیں لیکن واٹس اپ سے ملے ایک ویڈیو کلپ سے پتہ چلا کہ دوسری طرف بھی یہ ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔ ویڈیو ''حقیقت ٹوڈے'' نامی چینل کا ہے، جس میں اناؤنسر نے اس فتوے کا ذکر کیا ہے جس نے دنیائے اسلام کو غور و فکر کرنے کے لیے مجبور کر دیا ہے اور ایک نئی تاریخ بنانے والا ہے۔ ضرورت ہے اسے سننے اور سمجھنے کی۔ دراصل ایک مصری چینل نے جامع الازہر (ازہر یونیورسٹی قاہرہ، مصر) کے مفتی اور عالم ڈاکٹر الطیب سے شیعہ سنی مسئلہ پر انٹرویو لیا ہے یہ سوال جواب ''حقیقت ٹوڈے'' نے انگریزی کلپنگ (Clipping) دکھائی ہے اور اس کے اناؤنسر نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس میں ڈاکٹر الطیب نے اپنے فتوے سے شیعہ اور سنی حضرات کے درمیان پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کو نہایت سکون اور صبر کے ساتھ جواب

دے کر انھیں دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ان سوالوں اور جواب (فتوے) کو دیکھیں:

س۔۱ آپ کے مطابق کیا شیعہ عقائد میں کوئی پریشانی نہیں ہے؟

ڈاکٹر الطیب: بالکل نہیں بلکہ پچاس سال پہلے جامعہ الازہر کے چانسلر شیخ محمود شلتوت نے فتویٰ جاری کیا تھا کہ شیعہ فقہ اسلامی فقہوں کا پانچواں فقہ ہے جیسے چار فقہ پہلے سے موجود ہیں۔

س۔۲ ہمارے بچے شیعہ اسلام سے کافی متاثر ہو رہے ہیں اور اسے اپنا رہے ہیں تو ہم کیا کریں؟ اپنے بچوں کو اس فقہ کو اپنانے دیں اور انھیں تبدیل ہونے دیں؟

ڈاکٹر الطیب: کیا ہم کچھ کہتے ہیں جب کوئی مالکی یا حنفی جماعت کو چھوڑ دیتا ہے؟ یہ بچے چاروں فقہوں کو چھوڑ پانچویں فقہ کو اپنا رہے ہیں جو کہ تنقید کے لائق نہیں ہے۔

س۔۳ شیعہ اب ہمارے رشتے داروں میں سے ہوتے جا رہے ہیں، ان کے بچے ہمارے بچوں سے نکاح کر رہے ہیں۔اس پر آپ کیا کہیں گے؟

ڈاکٹر الطیب: اس میں غلط کیا ہے؟ نکاح ہم مذہب والوں سے جائز ہے؟

س۔۴ ایسا کہا جاتا ہے کہ شیعہ حضرات کے پاس الگ قرآن مجید ہے؟

ڈاکٹر الطیب: یہ تمام دقیانوسی باتیں ہیں اور غلط فہمیاں ہیں۔نہ تو ان کا قرآن ہم سے الگ ہے اور نہ اس قرآن کی سورتیں ہمارے قرآنی سورتوں سے الگ ہیں۔

س۔۵ سعودی عرب کے تیئیس (۲۳) علماء نے فتویٰ جاری کیا ہے کہ شیعہ کافر ہیں آپ کا کیا کہنا ہے؟

ڈاکٹر الطیب: مسلمانوں کے لیے فتوے جاری کرنے کی صرف الازہر کے پاس اتھارٹی (اختیار) ہے اس لیے یہاں کے علاوہ جاری ہونے والے سارے فتوے بے معنی اور جعلی ہیں۔

س۔۶ تو آخر شیعہ اور سنی میں کہاں فرق باقی رہا؟ شیعہ اور سنی میں کیا فرق ہے اور اس کے کیا معنی ہیں؟

ڈاکٹر الطیب: یہ بیرونی سازش کرنے والوں کی پالیسیاں ہیں جو شیعہ اور سنی حضرات میں فساد پھیلانا چاہتے ہیں۔

س۔۷   میرے پاس نہایت سنجیدہ سوال ہے۔ وہ یہ کہ شیعہ حضرات ابوبکرؓ اور عمرؓ کو نہیں مانتے۔ تو پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ مسلمان ہیں۔

ڈاکٹر الطیب: ہاں یہ حضرات انھیں نہیں مانتے۔ لیکن کیا ابوبکر کو ماننا اسلامی قوانین میں شامل ہے۔ ابوبکر اور عمر کی کہانی تاریخی ہے ان کا اسلام کے بنیادی عقائد اور قوانین سے کوئی لینا دینا نہیں۔

س۔۸   شیعہ حضرات کا بنیادی مسئلہ ہے اور وہ یہ ہے کہ انکا امام وقت ہزار سالوں سے آج بھی زندہ ہے، آپ کیا کہیں گے؟

ڈاکٹر الطیب: ہوسکتا ہے وہ زندہ ہوں، کیوں کیا یہ ممکن نہیں؟ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہم سنی حضرات بھی ان پر عقیدہ رکھیں۔

س۔۹   شیعہ حضرات کا یہ بھی ماننا ہے کہ ان کے ایک امام (امام محمد تقی) کو امامت آٹھویں سال میں ملی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آٹھ سال کے بچے کو امامت ملے؟

ڈاکٹر الطیب: اگر ایک نومولود بچہ نبی بن سکتا ہے جسے ہم نبی عیسیٰ کے نام سے جانتے ہیں، تو ایک آٹھ سال کے بچے کا امام بننا کیا مشکل اور ناممکن ہے؟ اور یہ بات عجب بھی نہیں۔ حالاں کہ ہم اہل سنت اسے تسلیم نہیں کرتے لیکن شیعہ حضرات کا یہ عقیدہ اسلام سے باہر کا نہیں ہے اور نہ ہی اسلام کو اس سے کوئی خطرہ ہے اور یہ حضرات مسلمان ہیں۔

آپ ان جوابات کو پڑھتے جائیں گے اور یہ مانتے جائیں گے کہ یہ جوابات شیعہ سنی اتحاد کے لیے بڑھتے ہوئے انقلابی قدم ہیں۔ اس سے یہ یقین دل میں بڑھتا ہے کہ امید ابھی باقی ہے۔ امید کی شمع جلائیں رکھیں اور اتحاد کی یہ باتیں دنیا کے سامنے لاتے رہیں۔

وہ صبح کبھی تو آئیگی۔ انشاء اللہ

فرقۂ یزیدیہ

جو لوگ برابر اخبار یا ٹی وی پر خبریں دیکھتے ہیں وہ اس بات سے پوری طرح واقف ہیں کہ موجودہ دور میں ایک نئے فتنہ کو پنپنے کا موقع ملا جس نے اپنا عربی نام الدولۃ الاسلامیہ عراق و شام رکھا جو اپنے مخفف داعش کے نام سے مشہور ہوا۔ انگریزی میں اسے اسلامک اسٹیٹ آف عراق اینڈ شام (ISIS) کہا گیا۔ یہ ایک ظالم گروہ ہے جس نے اسلام کی نقاب اوڑھ کر اسلام کو خوب بدنام کیا۔ اس کا سربراہ اپنے کو ابوبکر بغدادی کہتا ہے ویسے خبروں کے مطابق وہ صیہونی ہے۔ اس گروہ نے عراق اور سیریا میں بہت سے علاقوں پر قبضہ کر کے مسلمانوں کا خوب قتل عام کیا۔ خدا کا شکر ہے کہ دھیرے دھیرے عراق اور سیریا سے اس کا قبضہ ختم ہو رہا ہے ورنہ اس گروہ نے اہل سنت کے ایک طبقہ کے جذبات کو بھنا تے ہوئے سیریا کے رقہ (پرانا صفین) اور حلب تک اور عراق کے موصل علاقہ پر اپنا قبضہ جما لیا تھا اور ابو بکر بغدادی نے تو اپنی خلافت کا بھی اعلان کر دیا تھا۔ یہ لوگ اپنے مخالفوں کو پرانے طریقہ سے ذبح کر کے ختم کرتے ہیں۔ جب اس گروہ کو کامیابیوں پر کامیابیاں ملنے لگیں تو ان کی خون کی پیاس اور بڑھ گئی اور ان لوگوں نے عراق کے کرد علاقوں پر اور ان علاقوں پر جہاں عراق کی مذہبی اقلیتیں یعنی عیسائی اور فرقۂ یزیدیہ کے لوگ رہتے تھے وہاں بھی حملہ شروع کر دیا اور اس فرقہ کے لوگوں کو سنجار پہاڑ پر جا کر پناہ لینی پڑی۔ جب عیسائیوں پر آنچ آئی تو امریکہ جاگا اور اقلیتوں کی حفاظت کے نام پر داعش پر حملے شروع کئے۔ مصر کے مفتیٔ اعظم شوقی عالم نے داعش کو ایسا دہشت گرد گروہ قرار دیا

جو اسلام کو نقصان پہنچا رہا ہے۔

یہ سب اپنی جگہ پر لیکن یہ پڑھ کر، یا ٹی وی پر دیکھ کر حیرانی نہیں ہو رہی ہوگی کہ اب تک آپ نے یزیدی ذہنیت کے لوگ تو دیکھے ہوں گے لیکن یہ فرقۂ یزیدیہ کہاں سے نکل آیا ہے؟۔ میں آپ کی اس حیرانی کو دور کرنے کے لئے فرقۂ یزیدیہ کی حقیقت آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ اس حقیقت کو بتانے سے پہلے ایک غلط فہمی کو دور کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ ایک رسالہ میں اس فرقہ کا نام ''یزیدی'' کے بجائے ''یزدی'' بتایا گیا جو غلط ہے۔ یزدی یزد کے رہنے والوں کو کہا جاتا ہے اور کئی مشہور علما اپنے ساتھ یزدی کا استعمال کرتے ہیں۔

جی ہاں! فرقۂ یزیدیہ آج سے نہیں کئی صدیوں سے موجود ہے۔ اس فرقہ پر بھر پور ریسرچ سید جعفر غضبان نے کی اور تہران سے 1341 شمسی میں ایک کتاب ''یزیدیہا و شیطان پرست ہا'' نام سے لکھی جس سے اس فرقہ کے بارے میں جانکاری ملی۔

فرقۂ یزیدیہ والے اپنا آغاز 290ء سے مانتے ہیں اس وقت یہ مانویہ (Manviya) دین کے ماننے والے تھے
جس کی بنیاد مانی نے رکھی تھی جو خود 276ء میں قتل کر دیا گیا تھا۔ بعد میں یہ فرقہ یزیدیہ کہلایا۔

فرقۂ یزیدیہ میں آشوری، مجوسی، عیسائی اور اسلامی دینی احکام کی علامتیں پائی جاتی ہیں۔ شہرستانی نے اپنی کتاب ''ملل ونحل'' میں لکھا ہے کہ اس فرقہ کے لوگ کبھی دین منویہ کے پیرو تھے جو مجوسیت کی شاخ تھی اس فرقۂ یزیدیہ کا یہ گمان تھا کہ خدا بہت جلد ایران سے ایک پیغمبر بھیجے گا جو حضرت مصطفیٰ کی شریعت کو ترک کر دے گا اور وہ کتاب جو آسمان میں لکھی گئی ہے، نازل کرے گا۔

رسالہ معارف اعظم گڑھ 1961ء کے مطابق یہ فرقہ امیر معاویہ کا چاہنے

مشکل نہیں ہے۔ وہ ان کے لئے پیدا غذا کو براہ راست کھاتے ہیں۔ جبکہ انسان کو اپنی غذا کے چند لقمے حاصل کرنے کے لیے ہزاروں جتن کرنے پڑتے ہیں۔ پہلے چیزوں کو پکا کر نرم کرنا پڑتا ہے پھر اس کے معدے اور جسم کے مطابق غذا استعمال کے قابل ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان زمین کا رہنے والا نہیں ہے۔ جب یہ اپنے اصل سیارہ پر تھا تو وہاں اسے بھی کھانا پکانے کا جھنجٹ اٹھانا نہیں پڑتا تھا بلکہ ہر چیز کو براہ راست غذا کے لیے استعمال کیا جاسکتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ کہ یہ اکیلا دو پاؤں پر چلنے والا جاندار ہے جو ان کے یہاں ایلین (Alien) ہونے کی نشانی ہے۔

۸۔ انسان کو زمین پر رہنے کے لیے بہت ہی نرم و گداز بستر کی ضرورت ہوتی ہے جب کہ زمین کے اصل باشندے یعنی جانوروں کو اس طرح کے نرم بستروں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ اس چیز کے علامت ہے کہ انسان کے اصل سیارہ پر سونے اور آرام کرنے کی جگہ انتہائی نرم و نازک تھی جو اس کے جسم کی نازکی کے مطابق تھی۔

۹۔ انسان زمین کے سارے دوسرے رہنے والوں سے بالکل الگ ہے لہذا یہ یہاں پر کسی بھی جانور بندر یا چمپینزی وغیرہ کی ارتقائی شکل نہیں ہے بلکہ کسی اور سیارہ سے اسے زمین پر کسی نے پھینک دیا ہے۔ انسان کو جس اصل سیارہ پر خلق کیا گیا تھا وہاں زمین جیسا ماحول نہیں تھا۔ اس کی نرم و نازک جلد جو زمین کے سورج کی دھوپ میں جھلس کر سیاہ ہو جاتی ہے، اسے پیدائشی سیارہ کے بالکل مطابق بنائی گئی تھی۔ لیکن یہ اس سیارہ کا اتنا حساس جاندار تھا کہ زمین پر آنے کے بعد بھی اپنی نرم و نازک مزاجی کو دھیان میں رکھ کر اس کے مطابق ماحول پیدا کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ جس طرح اسے اپنے سیارہ پر آرام دہ اور نرم و نازک بستر پر سونے کی عادت تھی۔ زمین پر آنے کے بعد وہ یہاں بھی کوشش کرتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ آرام دہ زندگی گزار سکے۔ جیسے خوبصورت قیمتی اور مضبوط محلات، مکانات اس کے ماں باپ کو میسر تھے وہ اب بھی ان ہی جیسے مکانات کو بنانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ باقی سب زمین کے

والا تھا اور پھر یزید کی شان کو بہت زیادہ بڑھانے سے اس نے با قاعدہ ایک فرقہ کی شکل اختیار کر لی جو آج تک چلا آرہا ہے۔ چونکہ یزید کو ان لوگوں نے اپنا آئیڈیل مانا اس لئے یزید نے جو غیر اسلامی عمل کئے، اس فرقہ نے انھیں یزیدی اعمال کو فرقۂ یزیدیہ کا دینی عمل قرار دیا۔

فرقۂ یزیدیہ کے لوگ شیطان پر لعنت کرنا جائز نہیں سمجھتے۔ کیوں کہ ان کا ایمان ہے کہ شیطان خدا کا شریک ہے۔ دونوں مل کر اس کائنات کو چلاتے ہیں۔ یزیدی فرقہ شیطان کی عبادت ایک مور کی مورتی بنا کر کرتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ کم سے کم سال میں ایک بار شیطان کے بت کی زیارت کریں ورنہ ان کی گنتی کافروں میں ہونے لگے گی۔ اسی لئے یزیدی فرقہ کا کوئی آدمی اگر کسی شخص کو شیطان پر لعنت کرتا ہوا پاتا ہے تو وہ اس کو قتل کر دیتا ہے اور خود کو بھی ختم کر لیتا ہے کیوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ اب وہ زندہ رہ کر کیا کرے گا اس نے شیطان کی تعریف کے بجائے لعنت سن لی جو اس کی نظر میں کفر ہے۔ اگر وہ خودکشی نہ کرے تو ڈرتا ہے کہ کہیں کافر نہ ہو جائے۔ ان کے نزدیک جیسے خدا کے شریک شیطان کا جسم ہے ویسے ہی خدا کا بھی جسم ہے۔

اس کائنات کی تخلیق کے بارے میں فرقۂ یزیدیہ کا اعتقاد بہت دل چسپ ہے۔ آپ بھی دیکھئے۔

''خدا نے ایک سفید موتی پیدا کیا پھر ایک پرندہ کو پیدا کر کے وہ موتی اسکی پیٹھ پر رکھ دیا جو چالیس ہزار سال تک رہا۔ پہلے پہل اتوار کے دن عزرائیل (مور فرشتہ یعنی شیطان) کو پیدا کیا۔ سوموار کے دن دردائیل (شیخ حسن) کو پیدا کیا۔ منگل کے دن اسرافیل (شیخ شمس الدین) کو پیدا کیا۔ بدھ کے دن میکائیل (شیخ ابوبکر) کو پیدا کیا۔ جمعرات کے دن جبرئیل (سجادین) کو پیدا کیا۔ جمعہ چھوڑ کر سنیچر کے دن نورائیل (فخر الدین) کو پیدا کیا۔ شیطان کو سب فرشتوں کا سردار بنایا۔ باقی چھ یزیدی فرقہ کے امام اور امیر تھے۔ سات سال بعد زمین، سورج، چاند، پانی، فخر

الدین، انسان، جانور پرندے اور جنگلی جانور بنے۔ ان سب کو اپنی قمیص کی جیب میں رکھ لیا اور خود سفید موتی سے باہر آیا۔ فرشتے بھی ساتھ تھے۔ موتی ان کی آواز سے چار ٹکڑے ہو گیا۔ موتی کے پیٹ سے پانی جاری ہو کر دریا بنا۔ موتی کے ایک ٹکڑے سے زمین بنی اور دوسرے ٹکڑے سے آسمان بنا۔ موتی کے چھوٹے چھوٹے ذرّوں سے تارے بنے۔''

ہے نا دلچسپ؟ اب ذرا اور دلچسپ عقیدہ دیکھئے:

''خدا بیت المقدس پر نازل ہوا۔ جبرئیل کو حکم دیا کہ زمین کے چاروں کونوں سے مٹی، پانی، آگ اور ہوا لاؤ۔ پھر اس نے ایک جسم بنایا۔ اس میں روح پھونکی۔ اس کا نام آدم رکھا۔ آدم کے سر سے سہرا بن جبیر پیدا ہوا۔ اسی سے یزیدی ملت چلی۔ ادھر زندہ آدم کو جبرئیل جنت میں لائے۔ آدم وہاں سو سال رہے۔ شیطان نے خدا سے مشورہ کیا کہ اگر آدم گیہوں نہ کھائیں گے تو ان کی اولاد کیسے پیدا ہوگی؟ خدا نے شیطان سے کہا کہ تو ہی کوئی ترکیب کر۔ اس لئے شیطان نے آدم کو گیہوں کھانے پر اکسایا۔ آدم گیہوں کھانے کے بعد پاخانہ پیشاب کے لئے بے چین ہو گئے۔ انھیں زمین پر اتار دیا گیا۔ ایک پرندہ نے چونچ مار کر پاخانہ نکلنے کا راستہ بنا دیا۔ جبرئیل کو حکم ہوا کہ زمین پر جا کر آدم کی بائیں بغل سے حوا کو پیدا کرے۔ آدم اور حوا آپس میں ملنا چاہتے تھے۔ لیکن دونوں میں ٹھن گئی۔ دونوں میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی شہوت کو الگ الگ برتنوں میں بند کر کے رکھ دیا۔ نو مہینے کے بعد آدم کے برتن سے لڑکا لڑکی اور حوا کے برتن سے کیڑے مکوڑے پیدا ہوئے۔ اسی لڑکا لڑکی سے یزیدی فرقہ کے بزرگ پیدا ہوئے۔ یزیدی فرقہ کے لوگ اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ وہ صرف آدم کی اولاد ہیں۔ (کتاب یزیدیہا و شیطان پرست ہا صفحہ 68 اور 69)

یزیدی فرقہ کا عقیدہ ہے کہ خدا ہر ہزار سال کے بعد دین کو تازہ کرتا ہے۔ اس دین کے تازہ کرنے والوں میں یزید ابن معاویہ کا بھی نام ہے۔ یزیدی

فرقہ کے لوگ یزید کے بعد شیخ عدی کو بہت بڑے مرتبہ والا مانتے ہیں۔شیخ عدی مروان ابن حکم کے خاندان سے تھے۔ان شیخ عدی کی مہربانی سے اس فرقہ کے لوگ یزید کو نہ صرف پیغمبر بلکہ اس کے خدا ہونے کے قائل ہوگئے۔

یزیدی فرقہ میں شیخ عدی کے سلسلے میں تین گروپ ہیں۔پہلا انھیں خدا مانتا ہے،دوسرا خدا کا شریک مانتا ہے یعنی خدا آسمان کا کاروبار چلاتا ہے اور زمینی معاملات شیخ عدی دیکھتے ہیں۔تیسرا گروپ انھیں خدا کا وزیر مانتا ہے۔

فرقۂ یزیدیہ کے پاس دو مقدس کتابیں ہیں۔ایک ''مصحف رَش'' جو یزیدی فرقہ کا دستور العمل ہے۔دوسری کتاب ''الجلوہ'' (Al Jalwa) ہے جسے شیخ حسن ابن عدی ثانی نے مصحف رَش کی تفسیر کے طور پر لکھا ہے (رسالہ معارف اعظم گڑھ صفحہ 228 ستمبر 1961) مصحف رَش میں ہے کہ ہر ہزار سال بعد خدا زمین پر آتا ہے اور یزیدی فرقہ میں رہ کر کرد زبان میں بات کرتا ہے اور تمام معاملات کو حل کر کے چلا جاتا ہے۔اسی کتاب میں ہے کہ:

''خدا نے دیکھا کہ محمدؐ سیدھے راستے سے ہٹے ہوئے ہیں (معاذ اللہ) اس لئے ان کے سر میں درد پیدا کر دیا۔محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے غلام سے جس کا نام معاویہ تھا ،کہا کہ ذرا میرا سر مونڈ دے۔معاویہ نے سر کو زخمی کر دیا۔خون بہنے لگا تو چاٹ لیا۔محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے کہا کہ تو نے خطا کی ہے اب ایسا ہوگا کہ تو اپنے ہی لوگوں کا خون بہائے گا۔معاویہ نے کہا میں شادی ہی نہ کروں گا۔کچھ دن کے بعد خدا نے ایک بچھو کو اس پر حاوی کیا جس نے اس کے نازک مقام پر ڈنک مار دیا۔حکیموں نے اس کا صرف ایک علاج بتایا کہ معاویہ کسی عورت سے مباشرت کرے۔مجبوراً ایک اَسّی (۸۰) سال کی عورت کو لایا گیا۔وہ خدا کی قدرت سے 25 سال کی ہوگئی اور اس سے ہمارا خدا یزید پیدا ہوا۔(یزید یہا و شیطان پرستہا صفحہ 71).

انھی شیخ عدی نے ہکاریہ پہاڑ (شمالی عراق) پر اپنا مستقر بنایا اور لالش کی گھاٹی سے موجودہ یزیدیہ مذہب شروع کیا اور وہیں 557ء میں ان کی موت ہوئی اور

وہیں دفن ہوئے، شیخ عدی کی قبر سے ملحق ایک اور قبر ہے۔اس فرقہ کے لوگ اسے یزید کی قبر مانتے ہیں۔

فرقۂ یزیدیہ کے لوگ عراق میں بہت بڑی تعداد میں آباد ہیں۔یہ لوگ عراق کے شہر موصل میں اور اس کے آس پاس رہتے ہیں۔بہت سے اس فرقہ کے لوگ موصل کے قریب سنجار کے علاقہ میں رہتے ہیں جو موصل سے 160 کیلومیٹر دور ہے۔اس کے علاوہ کوہ قاف اور حلب (سیریا) کے علاقہ میں بھی ان کی اچھی خاصی آبادی ہے۔

یزیدی فرقہ کے کچھ عقائد

ان کی نگاہ میں شیخ عدی کی قبر ہی کعبہ ہے۔یہ لوگ اس قبر کے طواف کو حج کہتے ہیں۔ہر عورت مرد پر اس حج کا بجا لانا واجب ہے۔یہاں زم زم کا کنواں بھی ہے۔عرفات کا پہاڑ بھی ہے۔حوض کوثر اور سنگ اسود بھی یہیں ہے۔ان کا عقیدہ ہے کہ شیخ عدی نے ایک ٹھوس پتھر پر عصا مار کر زم زم کہا تو آب زم زم (مکہ میں کعبہ کے پاس والا) کعبہ سے لالش کی گھاٹی کی طرف پھر گیا۔یہ چشمہ یہاں ایک میٹر چوڑا اور دو میٹر لمبا ہے۔

شیخ عدی کی قبر کی مٹی بھی ان کے نزدیک بہت متبرک ہے۔جب اس فرقہ کے کسی شخص کا آخری وقت آتا ہے تو قبر کی مٹی پانی میں گھول کر پلا دی جاتی ہے۔میت کے جسم پر بھی اس پانی کو چھڑ کتے ہیں تا کہ اسے جنت ملے۔عام طور پر ان میں کا ہر ایک اپنے ساتھ شیخ عدی کی قبر کی مٹی رکھتا ہے اور صبح تھوڑی سی مٹی کھا لیتا ہے۔اگر کوئی جان بوجھ کر نہ کھائے تو وہ کافر ہو جاتا ہے۔جس زم زم کے چشمہ کا پہلے ذکر ہوا اس کے پانی سے دھوئے بغیر کوئی شخص نیا لباس پہن لے تو اسے کافر سمجھا جاتا ہے۔ان پر واجب ہے کہ گھر سے جوتا پہنے بغیر نکلیں۔ان پر یہ بھی واجب ہے کہ وہ شیخ عدی کی قبر پر سجدہ کریں ورنہ وہ کافر ہو جائیں گے۔

فرقۂ یزیدیہ کے لوگ نماز کے نام پر سورج نکلتے وقت مشرق کی طرف اور سورج ڈوبتے وقت مغرب کی طرف سجدہ کرتے ہیں، زمین کو چومتے ہیں اور اپنے چہرہ پر مٹی ملتے ہیں۔رات کو سوتے وقت کھڑے ہو کر بیٹھ کر یا لیٹ کر ایک دعا بھی پڑھتے ہیں۔

روزہ وہ صرف تین دن رکھتے ہیں۔اس لئے دسمبر کے پہلے جمعہ سے پہلے منگل، بدھ اور جمعرات کو روزہ رکھتے ہیں اور جمعہ کو عید مناتے ہیں۔اس عید کا نام ''عید یزید'' ہے۔ان کا خیال ہے کہ یزید اسی دن پیدا ہوا تھا۔

مندرجہ بالا عقائد کے علاوہ کچھ عقائد یہ ہیں۔

۱۔ قرآن و شریعت غلط ہے۔

۲۔ جس کتاب میں ان کے عقیدے کے خلاف کچھ لکھا ہو، وہ اگر کسی کے ہاتھ میں ہو تو چھین کر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں اور جلا دیتے ہیں۔

۳۔ اگر مرد و عورت راضی ہیں تو وہ زنا نہیں ہے۔

۴۔ شیخ عدی کو رسول خدا پر ترجیح دیتے ہیں۔

۵۔ جن شیخوں کو وہ اپنا مانتے ہیں، ان کا اپنے گھروں میں داخلہ جائز سمجھتے ہیں وہ اپنی عورتوں کو ان کے لئے حلال سمجھتے ہیں۔

۶۔ شراب حلال ہے۔

۷۔ ان کا اعتقاد ہے کہ شیخ عدی قیامت کے دن انھیں جنت لے جائیں گے وغیرہ وغیرہ۔

یہ ہے وہ یزیدی فرقہ جو عراق میں داعش کی حرکتوں کی وجہ سے دنیا کی نظروں میں آیا ہے۔میرا خیال ہے کہ اب یہ ماننا حقیقت کے خلاف ہو جائے گا کہ یزید کا نام لیوا محمود احمد عباسی (خلافت معاویہ و یزید) اور ذاکر نائک کے علاوہ اور نہیں ہے۔ (کتاب فرقۂ یزیدیہ مولف علی فطرت صاحب سے استفادہ)

بیبیاں پاک داماں

دسمبر 2003 میں اپنے اعزہ سے ملنے میں پاکستان گیا تھا۔ وہاں سب سے پہلے میں لاہور اپنے سگے چھوٹے بھائی کے یہاں رکا۔ لاہور ایک تاریخی شہر ہے جسے مغلوں نے بہت سجایا سنوارا۔ کبھی لاہور اور دہلی ایک جیسے لگتے تھے۔ لاہور قیام کے دوران میں نے ہندوستان کے پہلے مسلم بادشاہ قطب الدین ایبک کا مقبرہ، بادشاہ اکبر کے زمانہ کی مشہور انارکلی کی قبر (یہ اب لاہور سیکریٹریٹ پنجاب کے اندر ہے اور پاس لے کر جانا ہوتا ہے) جہانگیر اور نور جہاں کے مقبرے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی مسلم بیگم کا مقبرہ وغیرہ دیکھے۔ اسی کے ساتھ میرا بھائی مجھے بیبیاں پاک داماں کے مزار پر بھی لے گیا۔ پنجابی زبان میں دامن کو داماں کہا جاتا ہے اسی لئے بیبیاں پاک دامن بیبیاں پاک داماں ہوگئیں۔

جب میں مزار کے پاس پہنچا تو یہاں بھی وہی حالت دکھائی دی جیسے دوسرے مزاروں پر ہوتی ہے۔ یہاں بھی مزار تک پہنچنے کے لئے جو گلی ہے اس کے دونوں طرف پھولوں کی اور پھولوں کی چادروں کی دکانیں دکھائی دیں۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ بہت سے عقیدت مند گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے قبر تک پہنچتے ہیں۔ یہاں کئی قبریں ہیں اور ان قبروں کو شیعہ سنی دونوں مانتے ہیں۔ ہاں برادران اہل سنت کی تعداد شیعہ حضرات کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے۔ بی بی پاکدامن کے بارے میں جو بتایا گیا وہاں مہیا شیعہ سنی کتابوں میں جو معلومات دی گئیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

وہاں حاصل کتابوں کے مطابق بی بی پاک دامن حضرت علیؑ کی بیٹی حضرت

عباسؑ ابن علیؑ کی سگی بہن اور حضرت علیؑ کے سگے بھائی جناب عقیل ابن ابی طالب کے بیٹے حضرت مسلم ابن عقیل (شہید کوفہ) کی زوجہ جناب رقیّہ کا روضہ ہے۔ کتابوں کے مطابق جناب رقیّہ کے ساتھ حضرت علیؑ کے بھائی جناب عقیل ابن ابی طالب کی پانچ بیٹیاں بھی یہاں دفن ہیں۔ دوسری قبریں ان کی ایک کنیز مائی تنوری (غالباً سہولت کے لیے پکارنے والا نام) اور ان کے حفاظتی پہرہ داروں کی ہیں۔ ان مزاروں تک پہنچنے سے پہلے ان کی قبروں کے پہلے مجاور عبداللہ خاکی کی قبر ہے ان کے بارے میں تفصیل بعد میں آئے گی۔

تاریخ لاہور میں درج ہے کہ ۶۸ھ تقریباً ۶۴۵ء کے زمانہ میں جہاں آج بیبیاں پاک دامناں کا مزار ہے وہاں اس وقت ایک ٹیلہ تھا جس کے آس پاس جنگل تھا جو دریائے راوی کے کنارے دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس جنگل کے پاس لاہور کی سب سے پرانی آبادی تھی جو ایک چھوٹی سی بستی کی شکل میں تھی۔ اس علاقے پر ایک ہندو راجہ کی حکومت تھی اس راجہ کا نام ورمانتری (Varmantari) یا برن (Baran) تھا اس کے بیٹے کا نام راج کمار کنور وکرما سہائے تھا. علاقہ میں بہت سے مندر تھے۔ ایک دن یکا یک مندروں میں رکھی ہوئی تمام مورتیاں اپنی جگہ سے گر پڑیں حالانکہ یہ پکے چبوتروں پر لگی ہوئی تھیں۔ اسی کے ساتھ کچھ مندروں میں جلائی جانے والی آگ جو ہمیشہ جلتی رہتی تھی خود بخود بجھ گئی۔ ان واقعات کے بعد علاقے میں کہرام مچ گیا۔ جب راجہ نے مخبروں سے پتہ لگوایا تو پتہ چلا کہ کچھ پردیسی لوگوں کے آتے ہی یہ واقعات ہوئے ہیں۔ یہ پردیسی جنگل کے بیچ ایک ٹیلے پر ٹھہرے ہیں۔ راجہ نے حکم دیا کہ ان پردیسیوں کو پکڑ کر دربار میں پیش کیا جائے۔ راجہ کے سپاہی انہیں پکڑنے گئے تو دیکھا کہ کچھ عورتیں جو چادروں سے خود کو چھپائے ہوئے ہیں اور ان کے ساتھ چار محافظ پہرے دار ہیں جو ٹیلے پر پڑاؤ ڈالے ہیں۔ راجہ کے سپاہیوں نے ان کو گھیرا لیکن انہیں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکے، کیونکہ محافظ دستہ اپنی جان دے

کر بھی ان بیبیوں کی حفاظت کرنے پر آمادہ تھا۔ پردیسیوں کی زبان مقامی زبان سے الگ تھی اور مقامی زبان پردیسی نہیں سمجھ سکتے تھے۔ یہ حالت دیکھ کر راجہ نے اپنے بیٹے کنور وکرما سہائے کو بھیجا کہ وہ ان پردیسیوں کو گرفتار کر کے دربار میں لائے۔

راج کمار نے وہاں پہنچ کر اپنی زبان میں انہیں راجہ کا حکم سنایا۔ اسے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ ایک بی بی نے جو ان سب بیبیوں کی سردار معلوم ہوتی تھی راجکمار کی ہی زبان میں بات کی اور بتایا کہ:

''ہم لوگ اللہ کے بندے اور آل رسول ہیں۔ کربلا میں انہیں رسول حضرت محمدؐ کے نواسے حسینؑ کو شہید کر دیا گیا اور جو جانکاری ہمیں ملی ہے اس کے مطابق رسول کی آل پاک کو قید کر لیا گیا ہے۔ ہم لوگ اپنے وطن مدینہ نہ جا سکے اور حفاظت کی خاطر بے وطن ہو کر ہجرت کر کے یہاں پہنچے ہیں۔ ہم کسی کو ستانے کے لئے نہیں بلکہ پناہ لینے کے لیے یہاں آئے ہیں۔ ہمیں یہاں پڑا رہنے دو اور اگر تمہیں یہ منظور نہ ہو تو ہم کہیں اور چلے جائیں گے''۔

بی بی صاحبہ کو راج کمار کی مقامی زبان میں بات کرتے سن کر راجکمار حیران ہوا اور انکی بات کا اس پر بہت اثر پڑا۔ اس نے ان بی بی سے سب کے بارے میں پوچھا تو پتہ چلا کہ بڑی بی بی کا نام رقیہؓ بنت علیؑ ہے اور ان کے ساتھ ان کے چچا عقیل کی پانچ بیٹیاں ہیں جو بڑی بی بی کی نندیں ہیں (حضرت مسلم ابن عقیل رقیہ کے شوہر کی بہنیں ہیں)۔

ان کے ساتھ ایک اور بی بی ہے جو ان کی کنیز حلیمہ ہے جو تندور میں ان سب کے لیے روٹی پکاتی ہے۔ ان کے ساتھ جو چار مرد محافظ ہیں ان کے نام ابوالفتح، ابوالفضل، ابوالمقام اور عبداللہ ہیں۔ اس طرح ۱۱ر لوگوں کا قافلہ تھا۔ راج کمار نے

راجہ کا حکم سنا کر اپنی مجبوری ظاہر کی اور کہا کہ وہ راجہ کے حکم سے انہیں لینے آیا ہے اور انہیں لیے بغیر واپس نہ جائے گا اور اگر قافلہ والے بخوشی نہ چلیں گے تو وہ انہیں گرفتار کر کے لے جائے گا۔

جب راجکمار نے یہ جملے ادا کیے تو بڑی بی بی صاحبہ نے اسے غصے کی نگاہ سے دیکھا جس کو برداشت نہ کر راجکمار بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ راج کمار کے گرتے ہی راجہ کے سپاہیوں نے جو گھیرا ڈالے ہوئے تھے حملہ کر کے سب کو گرفتار کرنا چاہا اس وقت بی بی صاحبہ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور اس سے پہلے کہ راجہ کے سپاہی ان تک پہنچتے اور انہیں گرفتار کرتے یکایک زمین پھٹ گئی اور بڑی بی بی صاحبہ کے ساتھ وہ تمام پاک دامن بیبیاں اور انکے محافظ دستہ کے سپاہی سب زمین میں سما گئے ۔ یہ دیکھ کر راجہ کے آدمی حیران ہو گئے ۔ راجکمار کو جب ہوش آیا اور ان سپاہیوں سے جب اسے سب ماجرا معلوم ہوا تو اس نے اپنے باپ کے پاس واپس جانے کے بجائے وہیں ان پردیسی بیبیوں کے زمین میں سما جانے کی جگہ کی مجاوری کی ذمہ داری سنبھال لی اور مسلمان ہو کر اپنا نام عبداللہ رکھ لیا اور نام کے ساتھ لفظ 'خاکی' جوڑا۔ ابھی بھی خاکی خاندان پاکستان خصوصاً لاہور میں موجود ہے۔ راج کمار کے ساتھ آنے والے سبھی سپاہی مسلمان ہو گئے۔ راجہ نے اپنے بیٹے کو بہت سمجھایا لیکن اس کی تو دنیا بدل چکی تھی وہ وہاں سے ہٹنے کو راضی نہ ہوا۔ مجبور ہو کر باپ نے اسے کچھ علاقہ دے کر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ راجکمار اس ویران جگہ پر بیٹھا رہتا اور بیبیوں کے زمین میں سما جانے کی جگہ پر جھاڑو دیتا اور اللہ کی عبادت کیا کرتا تھا۔ ہندوؤں کے زمانے میں ان بیبیوں کی شہرت ستی کی حیثیت سے ہوئی۔

اس واقعہ کے بعد ایک اور کراماتی واقعہ ہوا۔ وہ یہ کی 'بلی ہم' Bali Hum جاٹوں کا ایک قبیلہ اس علاقے میں آ کر ٹھہرا۔ ان کے سردار کا نام 'بالو' تھا اس کی ایک جوان لڑکی تھی جو خوبصورت تو بہت تھی لیکن لولی (ہاتھ خراب) تھی۔ کوئی اس

سے شادی کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ بالو بی بی پاک دامن کی شہرت سن کر یہاں آیا تھا اور راجکمار سے التجا کی کہ وہ بی بی سے اسکی بیٹی کے صحت یاب ہونے کی دعا کرے اور اسے اپنی زوجہ بنا لے۔ راجکمار کو بشارت ہوئی کہ لڑکی اگر مسلمان ہو جائے تو اس کی دونوں التجائیں پوری ہو سکتی ہیں۔ بالو نے یہ شرط منظور کی۔ لڑکی مسلمان ہوئی اور راجکمار سے اس کا نکاح ہوا۔

رات میں دلہن کو مزار کے پاس بٹھا دیا گیا۔ صبح لوگوں نے دیکھا کہ لڑکی کا لولا پن ختم ہو چکا تھا۔ یہ دیکھ کر باپ بالو اور اس کا پورا جاٹ قبیلہ مسلمان ہو گیا۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے یہی راجکمار بابا خاکی یا عبداللہ خاکی کہلایا اور اس کی اولاد صدیوں تک بی بی پاکدامن کی قبر کی مجاور بنی رہی۔ یہ تمام لوگ آج بھی اپنے نام کے ساتھ خاکی لگاتے ہیں۔ ہاں ایک بات اور بتانی ہے وہ یہ کہ بی بی رقیہ کے ساتھ آنے والی بیبیوں کے نام تاریخ کی کتابوں میں ام ہانی، ام لقمان، اسماء، رملہ اور زینب درج ہیں۔

مولانا نور احمد چشتی نے اپنی کتاب تحقیقات چشتی میں جو ۱۲۸۶ء میں چھپی، ان بیبیوں کے یہاں آنے سے پہلے کا حال بھی لکھا ہے وہ لکھتے ہیں کہ جب امام حسین مدینہ سے کوفہ کی طرف روانہ ہوئے تو یہ بیبیاں بھی ساتھ تھیں۔ ۹ محرم ۶۱ھ کو امام حسینؑ نے ان بیبیوں سے کربلا سے چلے جانے کو کہا۔ ان بیبیوں نے ایسے حالات میں امام حسینؑ کو چھوڑ کر چلے جانے سے انکار کیا تو امام حسینؑ نے بحیثیت امام چلے جانے کو کہا۔ جناب رقیّہ نے اپنے دو بیٹے امام کے پاس چھوڑے۔ راستہ میں انہیں دس محرم کی شہادتوں اور واقعات کا پتہ چلا لیکن حکم امام کی تعمیل میں واپس لوٹنے کے بجائے وہ بھٹکتے بھٹکتے لاہور کے علاقے میں پہنچیں اس کے بعد کا حال پہلے درج ہو چکا ہے۔

مندرجہ بالا کتاب میں یہ بھی درج ہے کہ عبداللہ خاکی نے دیکھا کہ جس جگہ بیبیاں زمین میں سمائی تھیں اس جگہ ان کے دوپٹوں کے کچھ حصے باہر رہ گئے تھے عبداللہ خاکی نے انہیں حصوں کو نشان مان کر ان کی قبریں بنائیں۔ بی بی حلیمہ کنیز

جاندار اور مخلوقات اس سے بے نیاز ہیں۔ اس زمین کی مخلوقات عقل سے عاری ہیں۔ جن کو نہ اچھا سوچنے کی توفیق ہے اور نہ ہی اچھا رہنے کی۔ یہ اور بات ہے کہ انسان زمین کے سخت ماحول میں رہ کر سخت مزاج ہو گیا ہے جبکہ اصل سیارہ میں اس کی فطرت میں محبت تھی اور وہ امن وسکون کی زندگی گزار سکتا تھا۔ انسان زمین پر ایک ایسا قیدی ہے جسے سزا کے طور پر تھرڈ کلاس سیارہ پر بھیج دیا گیا تا کہ اپنی سزا کی معیاد گزار کر اپنے اصل سیارہ کو واپس جا سکے۔

ڈاکٹر ایلس کا کہنا ہے کہ انسان کی عقل اور شعور اور ترقی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس ایلین کے والدین کے اپنے سیارہ سے زمین پر آئے ہوئے کچھ زیادہ وقت نہیں گزرا ہے ابھی کچھ ہزار سال گزرے ہیں۔ یہاں بھی اپنی زندگی کو پہلے والے سیارہ کی طرح آرام دہ بنانے کے لئے بھرپور کوشش کر رہا ہے۔ کبھی گاڑی ایجاد کرتا ہے تو کبھی موبائل فون۔ اگر انسان کو آئے ہوئے چند لاکھ سال بھی گزرے ہوتے تو یہ جو ایجادیں آج کے دور میں دکھائی دے رہی ہیں یہ ہزاروں سال پہلے وجود میں آچکی ہوتیں۔ کیونکہ انسان کو بنانے والے نے اس کے پاس اپنی زندگی بہتر بنانے کی تمام تر صلاحیتیں دی ہیں۔

ڈاکٹر ایلس سلور نے جو بھی نقطے اپنی کتاب میں اٹھائے ہیں انھیں ابھی تک کوئی جھوٹا ثابت نہیں کر سکا۔ یہ تمام تحقیق ایک سائنسدان کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ یہ کوئی کہانی نہیں ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جو نتائج ڈاکٹر سلور نے نکالے ہیں وہ کم وبیش تمام الہامی کتابوں میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔

قارئین! ڈاکٹر سلور کی تحقیق پڑھتے وقت کیا آپ کا دھیان قرآن کی آیتوں کی طرف نہیں گیا، جس میں اللہ نے حضرت آدم وحوا کی تخلیق کا ذکر کرتے ہوئے یہ بیان کیا ہے کہ اللہ نے آدم کو جنت میں رکھا اور ایک پابندی کے علاوہ جنت میں جس طرح چاہے رہنے کی آزادی دی۔ یہ جنت وہ تھی جس میں آدم وحوا کو غذا کے لیے کوئی

جواب مائی تنوری کہلاتی ہیں حضرت مسعود قریشی کی بیٹی تھیں جو خود بھی حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں سے تھے۔

ان مزاروں کی تعمیر سب سے پہلے بادشاہ محمود غزنوی نے اور پھر بعد میں بادشاہ اکبر نے اپنے زمانہ میں دوبارہ کرائی۔ بی بی پاک دامن کا یہ روضہ بھی آل محمدؐ کی عظمتوں کی شہرت کا ایک ذریعہ بنا۔ اس روضہ کی اور وہاں سمائی اس شخصیت کی عظمت کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ خود سید علی ہجویری جو داتا صاحب کہلاتے ہیں اور جن کا مزار لاہور کے شہری علاقے میں ہے وہ خود جب بی بی کے مزار کی زیارت کو آتے تھے تو چالیس قدم پہلے سے گھٹنوں کے بل چل کر آتے اور اسی طرح واپس جاتے تھے وہ ہر جمعرات کو حاضری دیتے تھے آج تک لوگ اس آستانہ میں حاضری اپنے لئے خوش نصیبی سمجھتے ہیں۔

(کتاب بیبیاں پاکدامن سے استفادہ کیا گیا)

شمس تبریزؒ

صوفی اصطلاح میں ولی اللہ حضرات مشرقی دنیا میں تقریباً ہر ملک میں پائے جاتے ہیں۔ خصوصاً ہندوستان پاکستان میں۔ ان میں سے کچھ تو بہت مشہور ومعروف ہیں۔ جیسے پاکستان میں شہباز قلندر سہون شریف، لاہور میں سید علی ہجویری داتا صاحب اور کراچی میں شاہ عبداللہ غازی وغیرہ۔ اسی طرح ہندوستان میں خواجہ معین الدین چشتی اجمیر، خواجہ نظام الدین اولیاء دہلی اور سید محمد گیسو دراز بندہ نواز گلبرگہ وغیرہ۔ انہیں اولیاء میں ایک بہت ہی مشہور نام شمس تبریز کا ہے ان کی بہت سی کرامات سواد اعظم کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔ جیسے سورج کو قریب بلا کر اس میں مچھلی بھوننا اور خود اپنی کھال اتار لینا وغیرہ وغیرہ۔

اس سے پہلے کہ شمس تبریزؒ کے بارے میں آگے کچھ لکھوں، میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں یہ مضمون ان کی سوانح حیات پر نہیں لکھ رہا ہوں۔ شمس تبریز کے بارے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ دو ہستیاں شمس تبریز کے نام سے مشہور ہیں۔ پاکستان میں جو ہستی شمس تبریز کے نام سے مشہور ہے ان کا مزار ملتان میں ہے۔ جب میں پاکستان گیا تو مجھ سے کسی نے کہا کہ ملتان میں شمس تبریز کا مزار ہے۔ میں فاتحہ پڑھنے اور تحقیق کے لئے ملتان گیا۔ وہاں ان کے مزار سے ملحق ایک کربلا اور امام باڑہ ہے۔ تحقیق سے پتہ چلا کہ دراصل یہ شمس تبریزی نہیں بلکہ شمس سبزواری ہیں۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ شمس سبزواری کو شمس تبریزی کے ساتھ کیوں ملایا جاتا ہے؟ مزید تحقیق کے لئے ملتان سے شائع کتاب ' حضرت شاہ یوسف گردیز اور حضرت شمس

سبزواری مصنف شاکر حسین شاکر' کا مطالعہ کیا۔ پتہ چلا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں بزرگوں کا دور حیات تقریباً ملتا جلتا ہے ورنہ دونوں کے شجرے مختلف ہیں۔ شمس سبزواری (وہاں تبریزی کے نام سے مشہور) کے بارے میں ایک بات ہر جگہ پڑھنے کو ملی کہ وہ اسماعیلی فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اسماعیلی کتاب 'نور مبینؒ' میں شمس سبزواری کو آغا خانی پیر کا درجہ دیا گیا ہے۔ میر حسان الحیدری لکھتے ہیں:

''شاہ شمس سبزواری اسماعیلی گروہ کے ایک نامور مبلغ گزرے ہیں جو ایران سے اسماعیلیہ شیعہ مذہب کی اشاعت کے لئے پہلے کشمیر اور بعد میں پورے پنجاب کی سیاحت کرتے ہوئے ملتان وارد ہوئے۔ مدتوں ملتان میں رہ کر اسماعیلی مذہب کو پھیلایا اور بالآخر ۱۳۵۶ء مطابق ۷۵۷ھ میں وفات پا گئے اور ملتان میں مدفون ہوئے. (کتاب شاہ شمس سبزواری مصنف شاکر حسین شاکر)

ایک دلچسپ بات اور ہے وہ یہ کہ ان کی وفات کے بعد ان کے مزار اور کربلا کے قبضہ کے سلسلے میں اثنا عشری شیعہ حضرات اور آغا خانیوں میں عدالت میں مقدمہ بھی چلتا رہا جو دونوں اطراف کے افراد کے انتقال کے بعد از خود ختم ہو گیا۔ لیکن اب مزار اور کربلا پر اثنا عشری شیعوں کا قبضہ ہے۔

اب ہم حقیقی شمس تبریزی پر آتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں آگے بڑھو ں، قارئین کو کچھ اسماعیلی فرقہ کے بارے میں بیان کرتا چلوں۔ خلافت کے بجائے منصوص من اللہ امامت کو ماننے والے مسلمانوں کے پہلے امام حضرت علیؑ تھے پھر دوسرے امام حسنؑ تیسرے امام حسینؑ چوتھے زین العابدین علی ابن الحسینؑ پھر پانچویں امام محمد باقرؑ اور چھٹے امام جعفر صادقؑ تھے۔ اب تک عوامی خلافت مدینہ سے کوفہ اس کے بعد بنی امیہ کے زمانے میں دمشق اور پھر بنی امیہ کے زوال کے بعد

عباسی خلافت کا بغداد میں دور شروع ہو چکا تھا۔ چھٹے امام کے زمانہ میں منصور عباسی خلیفہ تھا جس نے آپ کو خفیہ طور پر زہر دلوا کر شہید کروا دیا۔ امام جعفر صادقؑ کے ۸ بیٹے تھے جن کے نام یہ تھے:

(۱) سید اسماعیل عرج اکبر۔ (۲) امام موسیٰ کاظم۔ (۳) عبداللہ۔ (۴) اسحاق۔ (۵) محمد۔ (۶) عباس۔ (۷) یحییٰ اور (۸) علی۔

حالانکہ اسماعیل عرج اکبر سب سے بڑے بیٹے تھے اور لوگ یہی گمان کرتے تھے کہ امام جعفر صادقؑ کے بعد وہی امام ہونگے۔ لیکن مصلحت خداوندی یہ کہ اسماعیل عرج اکبر کا امام جعفر صادقؑ کی زندگی میں ہی انتقال ہو گیا اور چھٹے امام کے بعد امام موسیٰ کاظم ساتویں امام ہوئے۔ لیکن ایک گروہ نے اسماعیل کی وفات کو نہ مان کر غیبت مانا اور انہیں ساتواں امام ماننے لگے۔ ان اسماعیل ابن امام جعفر صادقؑ کو جو لوگ امام صادقؑ کا جائز وارث یا ان کے بعد امام تسلیم کرتے ہیں وہ اسماعیلی شیعہ کہلائے۔ تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ اسماعیل اپنے والد کی زندگی میں ہی وفات پا چکے تھے لیکن اسماعیلی کہتے ہیں کہ وہ امامت پر مقرر ہوئے تھے۔ حالانکہ یہ بات غلط ہے۔ کیونکہ امامت کا تو یہ اصول ہے کہ آخر وقت پر امام اپنی وصیت اور علوم امامت اپنے وصی کے سپرد کرتا ہے۔

بہر حال مرحوم سید اسماعیل عرج اکبر کے دو بیٹے تھے جن میں بڑے بیٹے کا نام سید محمد عریض تھا۔ آپ کی ولادت چونکہ مدینہ منورہ سے تقریباً آٹھ میل کے فاصلے پر واقع ضلع عریض میں ہوئی، اس لئے آپ عریضی کہلائے۔ یہ امام موسیٰ کاظم کی امامت کا دور تھا اور اس وقت بغداد میں ہارون رشید خلیفہ تھا۔ اسکو امام موسیٰ کاظم کی مقبولیت کا پتہ چلا تو اس نے اپنے وزیر یحییٰ برمکی سے مشورہ کیا کہ اولاد ابوطالب میں سے کسی کو آگے بڑھا کر امام موسیٰ کاظم کے اثر کو ختم کیا جائے۔ اس نے محمد عریضی ابن اسماعیل کا نام لیا تو اس نے محمد عریضی کو بغداد بلوا لیا۔ انہوں نے امام موسیٰ کاظم سے

مالی مدد لے کر بغداد کا سفر کیا۔ بغداد پہنچ کر محمد نے ہارون رشید کے سامنے منفی رول ادا کیا اور اسے امام موسیٰ کاظم کے خلاف بھڑکایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہارون رشید کے حکم پر امام موسیٰ کاظم مدینہ سے گرفتار کر کے بغداد لائے گئے۔ قید کی حالت میں آپ کو زہر دے کر شہید کیا گیا اور آپ کو وہاں دفن کیا گیا جو اب 'کاظمین' کہلاتا ہے۔

ہارون رشید سے دس ہزار دینار پانے کے کچھ زمانے کے بعد محمد عریضی مع اہل و عیال 'رے' کی طرف چلے گئے۔ ان کے نام سے ایک شہر محمد آباد بسا۔ ان کی اولاد زیادہ تھی جو خراسان، قندھار، مروند اور سندھ جا کر آباد ہوئی ان کے چھ بیٹے تھے جن کے نام یہ ہیں:

(۱) سید شہزادہ احمد: انہیں کی اولاد مصر و افریقہ میں آگے چل کر حکمراں ہوئی اور خود کو فاطمی امام کہلاتی تھی۔

(۲) سید اسماعیل ثانی لقب امام الدین (۳) سید جعفر (۴) سید عیسیٰ اکبر (۵) سید زید (۶) سید علی عارف۔

محمد عریضی کے دوسرے بیٹے سید اسماعیل ثانی لقب امام الدین نے اپنے والد اور بھائی کے طریقہ سے ہٹ کر فقہ جعفریہ کو اپنایا اور ان کی اولاد نے فقہ جعفریہ کی تبلیغ و تشہیر کی۔ ان کی نسل میں چوتھی پشت میں سید منتظر باللہ ہوئے۔ سلسلۂ نسب یوں ہے سید منتظر ابن سید عبدالمجید ابن سید غالب الدین ابن سید محمد منصور ابن سید اسماعیل ثانی۔ انہیں سید منتظر باللہ کی نسل میں شمس تبریز ہیں، جن پر یہ مضمون لکھا گیا ہے۔ انکا شجرہ نسب یوں ہے۔ سید شمس الحق ابن سید صلاح الدین محمد نور بخش ابن علی اسلام الدین ابن سید عبدالمؤمن ابن سید علی خالد الدین ابن سید محمد محب الدین ابن سید محمود ابن سید محمد ابن سید ہاشم علی ابن سید احمد ہادی ابن سید منتظر باللہ۔

تاریخ گلزار شمس میں ہے کہ شمس تبریز کے والد سید صلاح الدین کا رہنا سہنا ہمیشہ درویشانہ طرز کا تھا۔ آپ اپنے جد امجد اسماعیل ابن امام جعفر صادقؑ کو حقیقی امام

نہیں تسلیم کرتے تھے۔آپ کا طریقہ تصوف کے پردہ میں اثنا عشری تھا۔آپ ہمیشہ اثناء عشری مذہب کی تبلیغ و تشہیر کرتے رہے۔ اسی طرح شمس تبریز کا بھی مسلک اثنا عشری تھا۔شمس تبریز بھی اپنے والد کی طرح دین حق کی تبلیغ میں مصروف رہے۔ اپنے والد کے ساتھ کشمیر اور تبت تک کا سفر کیا۔ کتاب کے مطابق تبت میں آپکو شمس الدین کراللہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ جب آپ نے تبریز میں زیادہ عرصہ تک قیام کیا تو آپ شمس تبریزی کہے جانے لگے۔شام و مصر میں آپ شمس مغربی کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔شاہ قاسم انوار بھی آپ کا خطاب تھا اس کے علاوہ قونیہ میں آپکو شمس پرندہ کہا جاتا تھا۔

شمس تبریز کے زمانہ میں مسلمان تین واضح گروہوں میں بٹ چکے تھے۔ اکثریت حکومت وقت کے عقیدے کے ساتھ تھی۔ دوسرا گروہ اسماعیلیوں کا تھا جو امام جعفر صادقؑ کی زندگی میں ہی فوت ان کے بیٹے اسماعیل کی پشت در پشت امامت کے قائل تھے۔ اور تیسرا گروہ امامت کو منصوص من اللہ مانتا تھا اور بارہ اماموں کا قائل تھا یہ اثنا عشری کہلاتے تھے۔ شمس تبریز اسی تیسرے گروہ سے تعلق رکھتے تھے اور اپنے عقیدے کی تبلیغ کی خاطر آپنے بہت سے سفر کئے ایک مرتبہ اپنے والد سے اجازت لے کر حج کے ارادہ سے مکہ معظّمہ گئے وہاں سے مدینہ، بصرہ، بغداد، دمشق اور مصر گئے۔آپ ہر جگہ بغیر کسی خوف و خطر کے اپنے نظریہ کی تبلیغ کرتے رہے۔

ایک مرتبہ شمس تبریز نے مولانا جلال الدین رومی سے ملاقات کرنے کا ارادہ کیا۔ مولانا رومی وقت کے بہت بڑے عالم دین تھے۔آپ کا دیا ہوا فتوی بغداد سے لے کر سندھ تک معتبر تسلیم کیا جاتا تھا۔ جب شمس تبریز مولانا رومی کی درس گاہ میں پہنچے تو دیکھا مولانا صاحب کے سامنے کتابوں کے انبار لگے ہوئے ہیں اس پر آپ نے مولانا صاحب سے پوچھا کہ یہ کیسی کتابیں ہیں؟

مولانا نے جواب دیا یہ قیل و قال کے خزانے ہیں لیکن تمہیں ان سے کیا

سروکار؟

اس پر شمس تبریز نے سب کتابیں سمیٹ کر قریبی حوض میں پھینک دیں۔ اس پر مولانا رومی کو بڑی تشویش ہوئی اور پکار کر کہا یہ تو نے میری روح کی غذا ناحق ضائع کردی۔ ایسی بیش بہا کتابیں پھر کہاں سے دستیاب ہوں گی۔

شمس تبریز نے مولانا کی پریشانی دور کرنے کی خاطر تمام کتابیں حوض سے نکال کر مولانا کے سامنے رکھ دیں۔ مولانا صاحب حیران و ششدر رہ گئے، جب انہوں نے دیکھا کہ کتابوں پر پانی کا کسی قسم کا اثر نہیں ہے تو مولانا اس سے بہت متاثر ہوئے اور شمس تبریز کے مرید ہوگئے۔ اسی واقعہ کو کچھ کتابوں میں آگ لگ جانے کے عنوان سے لکھا ہے جو بعد میں صحیح وسالم رہیں۔ مولانا رومی نے شمس تبریز کے نظریہ پر بہت سی تصانیف چھوڑی ہیں جن میں وہ شہرہ آفاق مثنوی بھی شامل ہے جو دنیا کی تمام لائبریریوں کی زینت ہے۔ شمس تبریز کے متعلق ان کے جذبات مولانا کے اس شعر میں عیاں ہیں۔

شمس تبریزی نور مطلق است　　　آفتاب است ز انوار حق است
چوں حدیث روئے شمس الدیں رسید　　　شمس چہارم آسماں سرور کشید

یعنی شمس تبریزی نور مطلق روشنی ہی روشنی ہیں۔ آپ حق کے انوار کا ایک آفتاب ہیں۔ جب شمس الدین کے روئے انور کی بات ہونے لگی تو سورج آسمان چہارم پر سرور محسوس کرنے لگا۔

آپ کے مردوں کو زندہ کرنے اور جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے یعنی آفتاب کو نیچے لاکر مچھلی بھوننے والی جیسی بہت سی کرامات آج بھی زباں زد عام ہیں۔ آپ اپنے دور میں مذہب اثنا عشری کے مبلغ تھے آپ کی تبلیغ سے متاثر ہو کر ہزار ہا غیر مسلم حلقہ اسلام میں داخل ہوئے جن کو مومن کہا جاتا تھا لیکن اس وقت وہ عموماً میمن کہلائے جاتے تھے (کتاب الشہباز)

آپ بہت سے اسماعیلی خوجوں کو اثنا عشری طریقہ پر لائے۔

آپ کی وفات کے سلسلے میں بہت سی روایات ہیں کوئی کہتا ہے کہ مولانا رومی کے بیٹے نے ان کو قتل کر دیا۔ کوئی کہتا ہے کہ کسی نے ان کو قتل کر کے لاش کنویں میں ڈال دی۔ کسی کا بیان ہے کہ سپاہی انہیں لے گئے اور قتل کر دیا۔ کوئی کہتا ہے کہ آپ کو مارنے کی کوشش کی گئی تو آپ غائب ہو گئے اور مارے جانے کی جگہ پر صرف چند قطرے خون کے دکھائی دیے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ بہر حال ترکی کے ایک شہر قونیہ میں ایک مزار ہے جسے شمس تبریز کا مزار کہا جاتا ہے آپ کی وفات ۶۷۵ ہجری میں بتائی جاتی ہے۔

اس طرح کتابوں کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ شمس تبریز ملتان میں نہیں دفن ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ اثنا عشری شیعہ تھے۔

سخی شہباز قلندر

راہ چلتے اکثر آپنے رونا لیلیٰ کی گائی قوالی کے بول 'دما دم مست قلندر، سخی شہباز قلندر، علیؑ دا پہلا نمبر۔ علیؑ دم دم دے اندر' کے بول سنے ہونگے اور یہ احساس پیدا ہوا ہوگا کہ کوئی حضرت علیؑ کی معرفت رکھنے والی ہستی رہی ہوگی۔ یہ تعجب بھی ہوا ہوگا کہ پچھلی صدیوں کے پر آشوب دور میں کسی ہستی نے اتنی جرأت دکھائی۔

اگر یہ بھی نہیں تو پچھلے کچھ مہینوں پہلے اخبار کا مطالعہ کرنے والوں نے یہ خبر ضرور پڑھی ہوگی کہ سخی شہباز قلندر کی درگاہ پر دہشت گردانہ حملہ ہوا۔ بہت سے لوگوں کی جانیں گئیں۔ اب آپ کے دماغ میں سوال پیدا ہوگا کہ آخر یہ شخصیت کون تھی۔

جون ۲۰۰۶ء میں، میں پاکستان گیا تو مجھے بتایا گیا کہ پاکستان کے سندھ صوبہ کے سہون شریف شہر میں ایک مشہور ہستی شہباز قلندر کا مزار ہے۔ میرے سامنے ان کا عرس چل رہا تھا۔ انہیں جھولے لال بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ دو طرف رسیاں باندھ کر درمیانی حصہ کو جھولا بنا کر اسی میں ریاضت کیا کرتے تھے۔ کیا پتہ کہ سندھی ہندو حضرات جن جھولے لال کو مانتے ہیں اور جن کا ہر سال یوم پیدائش مناتے ہیں وہ یہی شخصیت ہو۔ واللہ اعلم۔ بہر حال مجھ میں اس ہستی کو جاننے کی خواہش پیدا ہوئی اور جو نتیجہ سامنے آیا وہ آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ مجھے اس تحقیق میں پاکستان سے شائع ایک کتاب 'الشہباز' سے بہت مدد ملی۔

جن حضرات نے کربلائے معلیٰ کی زیارت کی ہے اور حرم امام حسینؑ میں داخل ہوئے ہونگے تو انہوں نے دیکھا ہوگا کہ امام حسینؑ کے حرم کے بیچ میں مولا

حسینؑ کی ضریح ہے اس سے ملحق حضرت علی اکبرؑ کی قبر ہے۔ تھوڑا ساہٹ کر ایک طرف گنج شہیداں ہے، جس میں جناب حبیب ابن مظاہرؑ اور حضرت حرؑ کو چھوڑ کر شہدائے آل ابو طالبؑ سمیت تمام شہدائے کربلا دفن ہیں۔ کچھ دوری پر حرم سے باہر حضرت عباسؑ ابن علی علمدار لشکر حسینی کا روضہ ہے۔ حرم کے اندر ضریح کے شمال کی طرف ایک طرف جناب حبیب ابن مظاہرؑ کی ضریح ہے اس سے بالکل نزدیک قتل گاہ ہے جہاں امام حسینؑ کو بے رحمی سے شہید کیا گیا تھا۔ قتل گاہ کو حفاظت کے خیال سے گھیر دیا گیا ہے ۔قتل گاہ کے بالکل سامنے کچھ دوری پر مگر حرم امام حسینؑ کے اندر ایک اور بزرگ حضرت ابراہیم المجاب کی ضریح ہے۔ میں اور تو سب کے بارے میں جانتا تھا لیکن یہ شخصیت میرے لیے نئی تھی۔ یہ بھی یقین تھا کہ یہ حضرت شہدائے کربلا میں سے نہ تھے لیکن یقیناً ان کی عظمت کو دیکھتے ہوئے انہیں جوار امام حسینؑ میں دفن کیا گیا ہوگا۔ ہر آنے والا آپ کی قبر پر بھی حاضری دیتا ہے۔ پوچھنے پر عظمت کی وجہ معلوم ہوئی۔ یہ بزرگ یعنی جناب ابراہیم جب کربلا پہنچے اور امام حسینؑ کے روضہ پر حاضر ہوئے تو آپ نے قبر کی طرف مخاطب ہو کر امام حسینؑ کو سلام کیا فوراً آپ کو امام حسینؑ کی طرف سے سلام کا جواب ملا۔ آپ کا نام تو ابراہیم تھا لیکن امام کا جواب سلام آنے کے بعد آپ ابراہیم المجاب کہلائے۔ یعنی وہ ابراہیم جن کو سلام کا جواب ملا۔ یہ امام حسینؑ کی قبر کے مجاور ہو کر وہیں پر رہ گئے اور انتقال کے بعد وہیں دفن ہوئے۔ اُنہیں ابراہیم کے بیٹے شہباز قلندر رہیں جن کا مزار سہون شریف میں ہے۔

شہباز قلندر ایران کے شہر مروند شریف میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام شاہ حسین رکھا گیا اور عرفیت شہباز رکھی گئی، لیکن ان کے نانا نے جو اس وقت مروند کے بادشاہ تھے اور تقیہ میں تھے، آپ کو شاہ حسینؑ کے بجائے سید عثمانؓ کہنا شروع کیا اور دوسروں پر بھی زور دیا کہ وہ بھی یہی کہیں تا کہ دشمن شاہ حسینؑ کو شیعہ سمجھ کر قتل نہ کر دیں۔

کوشش نہیں کرنی پڑتی تھی۔ اور انھیں محل سمیت سہولتیں حاصل تھیں۔ شاید اسی جنت کو ڈاکٹر سلور انسان کا اصل سیارہ مان رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ حضرت آدم وحوا کو ترک اولیٰ کی وجہ سے جنت (ڈاکٹر سلور کے مطابق سیارے) سے نکال دیا گیا۔ ظاہر ہے کوئی طاقت ایسی تھی جس نے ان دونوں کو سیارۂ زمین پر بھیج دیا۔ ڈاکٹر سلور کا پھینکنا لفظ زیادہ مناسب لگ رہا ہے کیونکہ دونوں کو اس طرح زمین پر اتارا گیا کہ آدم کو سری لنکا میں کوہ آدم پر اتارا گیا اور حوا کو عرب میں۔ دونوں ایک دوسرے کی تلاش میں رہے اور بڑی کوششوں کے بعد دونوں ایک دوسرے کو ڈھونڈھ پائے۔ تیسرے یہ کہ ڈاکٹر سلور کی تھیوری کے مطابق انسان سزا کے طور پر سیارۂ زمین پر ہے لیکن یہ اس کا آخری پڑاؤ نہیں ہے بلکہ ایک دن وہ اپنے اصل سیارے پر واپس جائے گا۔ قرآن بھی تو یہی کہہ رہا ہے کہ اے انسانو! یہ دنیا کی زندگی تمہارے لئے آزمائش ہے۔ یہ تمہارا مستقل ٹھکانا نہیں ہے، جہاں سے تم کو تمہارے اعمال کے مطابق سزا اور جزا ملے گی۔ اچھے اعمال پر تم کو جنت ملے گی جہاں کی زندگی انتہائی خوبصورت اور پرسکون ہے اور وہی تمہارا اصل گھر ہے۔

مضمون کے آخر میں، میں علماء اسلام سے اپیل کروں گا کہ وہ ڈاکٹر سلور سے مل کر انہیں قرآن پڑھنے کی دعوت دیں اور بتائیں کہ جو انہوں نے آج تحقیق کی ہے وہ قرآن نے چودہ سو سال پہلے بیان کر دیا تھا۔ اس کے بعد انہیں اسلام کی دعوت دیں۔ میرے خیال سے فصل تیار ہے بس اسے گودام میں لانے کی دیر ہے۔ اللہ ڈاکٹر سلور کو اسلام قبول کرنے کی توفیق دے آمین۔

شہباز چھٹے امام جعفر صادقؑ کی پندرہویں پشت میں تھے۔ شجرہ اس طرح ہے شہباز ابن سید ابراہیم المجاب ابن سید شمس الدین ابن سید نور شاہ ابن سید محمود شاہ ابن سید احمد شاہ ابن سید ہادی ابن سید مہدی ابن سید منتخب ابن سید عبدالمجید ابن سید غالب الدین ابن سید محمد منصور ابن سید اسماعیل ثانی ابن سید محمد علی عریضی ابن سید اسماعیل ابن امام جعفر صادقؑ۔

شجرہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نسلاً اسماعیلی تھے۔ امام جعفر صادقؑ کے ایک بیٹے اسماعیل باپ کی زندگی میں ہی وفات پا چکے تھے ان کے بڑے بیٹے سید محمد عریضی نے امام موسیٰ کاظمؑ سے دغا کی اور ان کے خلاف جا کر عباسی خلیفہ ہارون رشید سے مل گئے اور اسے اتنا بھڑکایا کہ اس نے امام کو قید کر لیا نتیجہ یہ کہ ساتویں امام نے قید خانہ میں ہی شہادت پائی۔ یہ محمد عریضی بعد میں رے چلے گئے اور وہاں محمود آباد نام کا شہر بسایا۔ ان محمد عریضی کے چھ بیٹے تھے۔ ان کے بڑے بیٹے سید شہزاد احمد تھے جن کی اولاد نے مصر اور افریقہ میں اپنی حکومت قائم کی۔ یہ لوگ خود کو فاطمی امام کہلاتے تھے اب یہ لوگ آغا خانی کہلاتے ہیں اور آغا خان اب بھی ان کا امام ہوتا ہے۔ اسماعیلی حضرات میں بعد میں اختلاف پیدا ہوا اور ایک طبقہ الگ ہو گیا جو اب داؤدی بوہرا کہلاتا ہے۔ ان کے یہاں امام نہیں بلکہ داعی ہوتا ہے ان کے موجودہ داعی ممبئی میں ہیں یہ طبقہ بہت منظم ہے اور تجارت پیشہ ہے۔

جو محمد عریضی خلیفہ ہارون رشید سے مل گئے تھے۔ ان کے دوسرے بیٹے سید اسماعیل ثانی حالاں کہ نسلاً اسماعیلی تھے مگر آپنے باپ اور بڑے بھائی کے برخلاف مسلک اثنا عشری اپنایا۔ یہ امام جعفر صادقؑ امام موسی کاظمؑ اور امام علی رضاؑ کو منصوص من اللہ امام مانتے ہوئے دشمنوں سے بچنے کے لئے صوفی بن کر زندگی گزارتے ہوئے انہیں اماموں کے بتائے ہوئے دین پر چلتے رہے۔ ان میں سید اسماعیل ثانی کے پرپوتے سید عبدالمجید جو خود شیعہ اثنا عشری تھے ان کے دو بیٹے تھے، ان میں ایک سید

منتظر اور دوسرے سید منتخب بھی شیعہ تھے۔ سید منتظر کی نسل سے مشہور ولی شمس تبریز تھے جن کے لیے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے جسم سے کھال خود اتار لی تھی اور ایک بار پرندے کے گوشت کو بھوننے کے لئے سورج کو حکم دے کر نیچے کر لیا تھا۔ واللہ اعلم۔ مزے کی بات یہ ہے کہ شمس تبریز نامی ہستی کا مزار دو جگہ ہے شمس تبریز کا مزار ترکی میں ہے اور دوسرے شمس تبریز کا مزار ملتان (پاکستان) میں ہے۔ پتہ نہیں یہ ایک ہی شمس تبریز تھے یا دو۔ جہاں تک ملتان والے شمس تبریز کے مزار کا تعلق ہے اسماعیلی حضرات کا دعویٰ تھا کہ یہ اسماعیلی تھے اور شیعوں کا ماننا تھا کہ یہ شیعہ اثنا عشری تھے۔ اس سلسلہ میں دونوں فریق میں کافی دنوں مقدمہ بھی چلا۔ موجودہ پوزیشن یہ ہے کہ ملتان کے شمس تبریز کا مزار اور وہاں بنی کربلا اب شیعہ اثنا عشری حضرات کے زیر انتظام ہے۔ میں خود ملتان (پاکستان) گیا تھا اور مزار پر گیا تھا۔

بہر حال بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ متذکرہ بالا عبدالمجید کے دوسرے شیعہ اثنا عشری بیٹے سید منتخب کی نسل سے شہباز قلندر رہیں۔ آپ کے والد ابراہیم المجاب کو امام حسینؑ کی طرف سے شادی کرنے کا حکم ملا۔ شادی کے بعد شہباز قلندر پیدا ہوئے۔ شہباز کی والدہ کا انتقال جلدی ہو گیا اور اسی غم میں ابراہیم المجاب امام حسینؑ کی خدمت میں کربلا میں بس گئے اور ان کی موت کے بعد ان کی قبر حرم امام حسینؑ میں بنی۔

جوانی میں ہی شہباز نے قلندری شروع کر دی کیونکہ آپ کو گھومنے پھرنے کا بہت شوق تھا آپ اکثر مروند سے تھوڑی دور پر مشہد مقدس میں حضرت امام علی رضاؑ کے روضے پر ننگے پیر بھوکے پیاسے زیارت کے لئے جاتے رہتے تھے۔ آپ دین اسلام کی تبلیغ کے لیے جگہ جگہ جاتے ہوئے مکہ مدینہ پہنچے۔ وہاں آپ کو بشارت ہوئی کہ تم کربلا جاؤ جہاں تمہارے والد ابراہیم المجاب تمہاری جدائی سے بے چین ہیں۔

کربلا پہنچ کر وہ اپنے والد سے ملے جن کی کچھ دنوں کے بعد موت ہو گئی اور انہیں امام حسینؑ کے حرم میں دفن کیا گیا۔

کربلا سے شہباز قلندر دوبارہ مشہد مقدس آئے اور اس کے بعد ہندوستان کا رخ کیا۔

ہندوستان میں اس زمانے میں اسماعیلیوں کا بہت زور تھا۔ آپنے فقیرانہ لباس پہن کر پورے ہندوستان میں گھوم گھوم کر اپنی کرامات سے لاکھوں کی تعداد میں نام کے مسلمانوں کو صحیح اسلام پہنچوایا۔ نتیجہ یہ کہ بہت سے نئے مسلمان جو اسماعیلیوں کے ہاتھوں اسماعیلی ہوئے تھے انہیں اثنا عشری شیعہ بنایا جو اب اثنا عشری خوجہ کہلاتے ہیں۔

شہباز قلندر نے اپنے عقیدہ کو ظاہر کرنے کے لیے فارسی میں اشعار بھی کہے ہیں جس سے یہ غلط فہمی دور ہو جاتی ہے کہ وہ اسماعیلی تھے۔ اسماعیلی چونکہ ہمارے صرف چھ اماموں یعنی حضرت علیؑ سے لیکر امام جعفر صادقؑ تک مانتے ہیں اس لیے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ اسماعیلی نہ تھے بلکہ امام جعفر صادقؑ کے بعد امام موسیٰ کاظمؑ سے لے کر بارہویں امام کو مانتے تھے، میں ان کے لکھے گئے اشعار کو پیش کر رہا ہوں۔ مضمون کی طوالت کو دھیان میں رکھ کر صرف ترجمہ پیش خدمت ہے۔

(۱) موسیٰ کاظمؑ برحق امام ہیں ان کے دم سے اسلام کے رونق بڑھ گئی ہے ان کا انکار کرنے والا کافر ہے۔ سن اے خارجی، احمق، گدھے! میں حیدری ہوں۔

(۲) امام علی رضاؑ شاہ دیں ہیں تم بھی کہو۔ علیؑ خدائی کا نمونہ ہیں، تم بھی کہو۔ وہ علیؑ مرتضیٰؑ کی اولاد میں سے ہیں۔ تم بھی کہو۔ ان کا دشمن خدا کا دشمن ہے، تم بھی کہو۔ میں حیدری ہوں۔

(۳) تقیؑ میرے امام ہیں۔ جو متقی ہیں۔ ان کا فیض ہر خاص و عام پر جاری ہے۔

میں حیدری ہوں۔

(۴) نقیؑ شاہ دیں اور امام ہیں۔وہ علی نقی پاک معصوم ہیں۔میں حیدری ہوں۔

(۵) حسن عسکریؑ پر ایمان لانا برحق ہے ان کے تمام دشمن ذلیل اور ظالم ہیں۔

میں حیدری ہوں۔

(۶) امام مہدی قائم آل محمدؑ ہیں۔آپ علیؑ مرتضی کے بیٹوں میں سے ہیں۔جس طرح حضرت علیؑ مظہر خدا ہیں ویسے ہی حضرت مہدی ہیں۔حضرت مہدی نور ایمان ہیں۔میں حیدری ہوں۔

اس طرح یہ بات ثابت ہے کہ جناب سخی شہباز قلندر نہ تو اہل سنت تھے اور نہ ہی اسماعیلی تھے بلکہ شیعہ اثنا عشری تھے یہ اور بات ہے کہ ان کے مزار پر غیروں کا ہی ہجوم زیادہ لگا رہتا ہے۔

(کتاب الشہباز سے استفادہ کیا گیا)

گالی

گالی اس فعل کا نام ہے جس کو ایک آدمی دوسرے آدمی کے خلاف انجام دیتا ہے۔ وہ دوسرے آدمی کی ماں بہنوں کو منسوب کر کے گندے گندے الفاظ کا استعمال کرتا ہے۔ ایسے ہی الفاظ خود دوسرے آدمی کے خلاف بھی استعمال کرتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اگر دوسرے آدمی کی ماں بہنیں وہاں موجود ہوتیں تو وہ ان الفاظ کو عملی جامہ پہنا دیتا اور فعل حرام کا مرتکب ہوتا۔

مہذب وصحت مند سماج گالی کو ایک برا فعل سمجھتا ہے۔ ایک آدمی اپنی سوسائٹی میں خود کو شریف ظاہر کرتا رہتا ہے لیکن جیسے ہی وہ کسی کو ماں بہن کی گالی بکتا ہے تو اسی وقت اس کے چہرہ سے شرافت کا نقاب اُتر جاتا ہے اور وہ گندی ذہنیت والے آدمیوں میں شمار ہونے لگتا ہے اور اگر وہ گالی کا فعل مندر، مسجد، چرچ، گوردوارہ، امام باڑہ یا عام جگہ پر انجام دیتا ہے تو چاہے سننے والے اس کو نہ ٹوکیں لیکن ان کا دل پکار پکار کر کہتا ہے کہ یہ آدمی جسے ہم شریف سمجھتے تھے وہ ایک گندی ذہنیت کا آدمی نکلا۔ اور اسی لئے عام طور پر گالی گلوج نچلے طبقہ کا آدمی ہی دیتا ہوا نظر آئے گا۔

دنیا کا ہر مذہب چاہے وہ ہندو مذہب ہو، عیسائیت ہو، یہودیت ہو، سکھ ہو، جین ہو یا پھر اسلام ہو وہ سب گالی کو ایک برا فعل سمجھتے ہیں۔

آیئے دیکھیں گالی کے بارے میں اسلام کا کیا نظریہ ہے:

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

''مومن کو گالی دینا گویا اسے ہلاکت کے قریب پہنچانا ہوتا ہے'' (کافی جلد ۲ ص ۳۵۹)۔

شہید دست غیب شیرازی اس سے یہ مراد لیتے ہیں کہ مومن کو گالی دینا کفر کے قریب پہنچنا اور دین سے خارج ہوجانا ہے کیوں کہ کبیرہ گناہوں پر اصرار کرنے کا انجام کفر ہوتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ بھی فرماتے ہیں کہ:

''مومن کو گالی دینا فسق (گناہ) ہے۔ اس سے لڑنا کفر اور اس کا گوشت کھانا (غیبت کرنا) گناہ ہے اور اسکا مال اسکے خون کی طرح حرام رکھا گیا ہے۔''

(کافی جلد ۲ صفحہ ۳۶۰)

علامہ مجلسی اس حدیث کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ یہاں فسق کے معنی گناہ کبیرہ کے ہیں جو کفر کے قریب ہوتا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ گالی دینے کا گناہ غیبت سے بھی بڑا ہوتا ہے کیوں کہ غیبت میں وہ صرف گالی کے بارے میں سنتا ہے اور اسے پیٹھ پیچھے تکلیف ہوتی ہے لیکن سامنے گالی سننے پر اسے تکلیف فوراً پہنچتی ہے۔

امیر المومنین حضرت علیؑ گالی بکنے کو کتنا کریح فعل سمجھتے تھے اس کا ثبوت جنگ صفین میں سامنے آیا۔ جنگ صفین میں آپ نے سنا کہ آپ کے اصحاب میں سے کچھ شام والوں کو گالی دے رہے تھے حالانکہ یہ گالی شام والوں کی گالی کے بدلے میں تھی لیکن آپ نے اسے منع کرتے ہوئے فرمایا کہ میں اس کو پسند نہیں کرتا کہ تم گالی بکنے والے بنو۔ (ندائے عدالت انسانی صفحہ ۱۴۱ مصنفہ جارج جرداق)۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گالی بکنے کو کتنا قبیح فعل سمجھا ہے اس کا ثبوت آپ کی مندرجہ ذیل حدیث ہے:

''واقعی خدا نے ہر ایسے بے آبرو گالی دینے والے اور بے شرم پر بہشت حرام کردی ہے جسے اس بات میں کوئی جھجک نہیں ہے کہ وہ کیا کہتا ہے اور اس سے کیا کہا جائیگا کیوں کہ درحقیقت اگر اس کی تحقیق کی جائے تو یا تو یہ زنا سے ہے یا اس میں شیطان شریک ہے'' آپ سے اصحاب نے پوچھا ''اے رسول خدا! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

آدمیوں کے بیچ میں شیطان بھی شریک ہوتا ہے؟'' آپ نے فرمایا'' کیا تم نے خدا کا یہ قول نہیں پڑھا کہ ''اور اے شیطان ! مال اور اولاد میں ان لوگوں کا شریک ہو جانا'' (کافی ج ۲ صفحہ ۳۲۳)۔

ایک جگہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

''جو کوئی کسی مومن کو ایک لفظ سے بھی طعنہ دیگا، برا کہے گا خدا اس پر بہشت کی خوشبو حرام کریگا'' (مستدرک، کتاب حج باب ۱۳۹)۔

شہید دست غیب شیرازی فرماتے ہیں کہ یہاں دو باتیں کہنا ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ جب کسی مومن کو گالی دی گئی تو چونکہ اس کو دکھ پہنچایا گیا اسلئے آخرت کے عذاب اور سزا کے علاوہ اس مومن کو یہ حق پہونچتا ہے کہ وہ حاکم شرع سے گالی دینے والے کی شکایت کرے تا کہ وہ جس طرح مناسب سمجھے اسے سزا دے یا گالی دینے والا جس کو گالی دیتا ہے اگر اس سے معافی مانگ لیتا ہے اور اسے منا لیتا ہے یعنی وہ معاف کر دیتا ہے تو سزا ساقط ہو جاتی ہے ۔دوسرے یہ کہ اگر اس گناہ پر شرمندہ ہونے کے بعد اللہ سے بھی معافی مانگ لے تو اس سے عذاب آخرت بھی اٹھ جائیگا۔

یہ تو تھے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علیؑ کے اقوال۔ آیئے دیگر ائمہ کے اقوال پر بھی نظر ڈالی جائے۔

حضرت امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں:

''جو شخص مومن کے منہ پر اسے طعنہ دے گا وہ بدترین موت پائے گا اور اس بات کا مستحق ہوگا کہ پھر نیکی کی طرف نہ پلٹے''۔ (کافی جلد ۲ صفحہ ۳۶۰)۔

علامہ مجلسیؒ نے اس حدیث کی جو تشریح کی ہے وہ یہ ہے کہ بدترین موت کو اگر دنیا کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اس میں کئی طرح کی موتیں ہیں مثلاً ڈوبنا یا جلنا یا عمارت کے تلے دب جانا یا کسی جانور کی خوراک بن جانا وغیرہ۔ آخرت کے لحاظ سے بدترین موت کئی طرح کی ہے مثلاً یہ کہ کافر مرے یا توبہ کئے بغیر اس دنیا سے رخصت ہو جائے اور نیکی کی طرف نہ پلٹنے کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اسے توبہ، نیک عمل

اور ایمان کی توفیق نہ ہو۔

حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں :

''گالی گلوج اور بدزبانی ظلم ہے اور ظالم جہنم کا مستحق ہے'' (کافی)

حضرت امام موسیٰ کاظمؑ نے تو اس فعل کو اور سنگین بنا دیا ہے۔

آپ فرماتے ہیں:

''اگر ایسے دو آدمی ہیں جو ایک دوسرے کو گالی دیتے ہیں تو جو شروع میں گالی دیتا ہے وہ زیادہ ظالم ہے اور اپنا اور سامنے (جواب دینے) والے کا گناہ اسی کی گردن پر ہے جب تک مظلوم یعنی دوسرا فریق حد سے نہ گزر جائے''۔ (کافی)

اس حدیث کے سلسلے میں بھی علامہ مجلسیؒ کا کہنا یہ ہے کہ دونوں شخصوں کی گالیوں کا گناہ اسی شخص کے ذمہ ہے جس نے پہلے گالی دی ہے کیوں کہ حرام فعل پہلے اسی سے سرزد ہوا ہے اور دوسرے فریق نے جو گالی کا جواب دیکر گناہ کیا ہے اُس ارتکاب گناہ کا باعث بھی پہلا فریق بنا ہے۔ اگر وہ گالی نہ دیتا تو دوسرا فریق بھی خاموش رہتا۔ اس میں شرط یہ ہے کہ دوسرا فریق گالی کا جواب دینے میں پہلے فریق سے آگے نہ بڑھ جائے ورنہ پھر وہ گناہ گار مانا جائیگا۔

اس بارے میں مرزا محمد تقی شیرازی مرحوم کا کہنا ہے کہ روایتوں کے مطابق گالی حرام ہے چاہے جس کسی کو دی جائے چاہے وہ مسلمان اور مومن ہو یا کافر اور فاسق، چھوٹا ہو یا بڑا بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ چاہے بچہ اور بے شعور ہو بلکہ بعض روایتوں میں تو جانوروں کو بھی برا بھلا کہنے اور گالی دینے سے منع کیا گیا ہے۔

مندرجہ بالا حدیثوں اور باتوں سے ہر وہ شخص جو اپنے کو مومن سمجھتا ہے اُسے یہ جان لینا چاہئے کہ گالی دینا ایک فعل قبیح ہے۔ اس سے نہ صرف اس کی شرافت کا نقاب چاک ہو جاتا ہے بلکہ وہ دنیا و آخرت دونوں میں سزا کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اللہ سب کو عقل سلیم عطا کرے۔ آمین۔

وندے ماترم

مرکز میں جب سے نئی پارٹی برسر اقتدار آئی ہے تو وہ خود اور اسی پارٹی کی صوبائی حکومتیں روز نئے نئے شوشے چھوڑ رہی ہیں۔ کبھی سوریہ نمسکار، کبھی لو جہاد، کبھی گئو رکشا اور کبھی مذبح لائسنس وغیرہ وغیرہ۔ ان سب حرکتوں کا واحد مقصد مسلمانوں کو اکسانا ہے۔ تاکہ وہ ایسا جارحانہ ردعمل ظاہر کریں کہ حکومت ان کی تعداد کچھ کم کر سکے۔ حالاں کہ یہ ان کی بھول ہے کیوں کہ ملت اسلامیہ ان کی حرکتوں سے ختم نہیں ہو سکتی۔ بقول علامہ اقبال:

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دور زماں ہمارا

ان کے ان تمام شوشوں میں ایک شوشہ "وندے ماترم" کا بھی ہے۔ دراصل ماترم سے ان کا اشارہ مادر وطن کی طرف ہے یعنی ہندوستان کی طرف۔ گویا مسلمان حب وطن کو نہیں مانتے۔ حالاں کہ یہ سراسر شرارت ہے۔ کیوں کہ وطن کی محبت مسلمانوں کا جزو ایمان ہے۔ فارسی کا مشہور شعر ہے

حب وطن از ملک سلیماں خوشتر
خاک وطن از سنبل و ریحاں خوشتر

آیئے دیکھیں کہ آخر وندے ماترم ہے کیا جس کی اتنی حمایت اور مخالفت ہو رہی ہے۔ یہ دو سنسکرت الفاظ پر مشتمل ہے (۱) وندے (۲) ماترم۔ وندے سنسکرت لفظ وندنا (वन्दना) سے بنا ہے۔ وندنا اسم ہے تو وندے فعل

(Verb) وندے کا مطلب ہے ''میں تیری وندنا کرتا ہوں'' دوسرے لفظ ماترم کا مطلب 'ماں' ہے لیکن یہاں اشارہ مادر وطن ہندوستان کی طرف ہے۔ پورا مطلب یہ ہوا کہ اے مادر وطن میں تیری وندنا کرتا ہوں۔ بس ساری حمایت و مخالفت ''وندے'' پر ہے۔

اس سلسلہ میں میں اپنا نظریہ واضح کرنا چاہتا ہوں، ہوسکتا ہے کہ قارئین میرے اس نظریہ سے متفق نہ ہوں تو مجھے معاف کریں گے۔

میری گذارش ہے کہ عربی کی طرح سنسکرت ایک قدیمی اور مالا مال زبان ہے۔ جس طرح عربی میں اللہ کے لیے 'حمد' اور نبی کے لیے 'نعت' کا لفظ استعمال ہوتا ہے اسی طرح سنسکرت میں ایشور کے لیے استوتی (स्तुति) اور دوسری ہستیوں کے لیے 'وندنا'' آتا ہے۔ سنسکرت کا صحیح جاننے والا آپکو بتائے گا کہ وندنا کا مطلب عبادت نہیں ہوتا۔ یعنی وندے ماترم کا مطلب وطن کی عبادت نہیں ہے۔

لیکن اگر یہ بات اتنی ہی آسان ہوتی تو مسلمانوں کو یہ کہہ کر سمجھایا جاسکتا تھا کہ وطن جو ہمارے لیے بھی ماں کے برابر ہے اس کے لیے وندنا ان معنوں میں ہے کہ ''ماں میں تیرا احترام کرتا ہوں'' یا ''ماں تجھے سلام کرتا ہوں'' مگر ایسی بات نہیں ہے۔

جب ہم تاریخ کے صفحات کو پلٹتے ہیں تو بات اتنی آسان نہیں رہ جاتی ہے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جس 'وندے ماترم' کو محبت کا پیمانہ مانا جارہا ہے اس پر خود جنگ آزادی کے عظیم متوالوں کو بھی اعتراض تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس گیت کے لکھنے والے بنکم چندر چٹر جی انگریزوں کو بہت عزیز تھے اور وہ حضرت صرف بنگال کو مادر وطن مانتے تھے، وہ برٹش حکومت کے خلاف تھے ہی نہیں اور اسی لیے انگریزوں سے قربت کی بناء پر بنگال کے انگریز لفٹینینٹ گورنر نے ۱۸۵۸ء میں انھیں براہ راست ''رائے بہادر'' کا خطاب دے دیا تھا۔ وندے ماترم گیت اصل میں بنکم چندر

حضرت محمدؐ ہندو مذہبی کتب میں

بحیثیت مسلمان ہم سب کا ایمان بلا کسی شک وشبہہ کے اللہ اور اس کی نازل کی ہوئی کتاب قرآن پر ہے اور قرآن کا اعلان ہے کہ ''لکل قومٍ ہاد'' یعنی ہم نے ہر قوم میں ہادی بھیجے ہیں۔ تو کیا انبیاء صرف عرب، فلسطین، اور مصر ہی کی قوموں کے لیے آئے تھے؟ نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ یقیناً دنیا کے ہر کونے میں قومیں ہوں گی جن کی ہدایت کے لئے اللہ نے اپنے پیغمبر، رسول، اور نبی بھیجے ہوں گے اور ان کے لئے کتابیں بھی نازل کی ہوں گی۔ اسی لئے یہ مانا جاتا ہے کہ اللہ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار (124000) انبیاء بھیجے۔ اب یہ اور بات ہے کہ ان سب کے نام قرآن میں نہیں آئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ قرآن عربوں پر اترا تھا اس لئے قرآن نے صرف ان انبیاء کے نام لئے جنھیں عرب جانتے تھے۔ چونکہ یہودی اور عیسائی عرب میں بہت موجود تھے اس لئے بنی اسرائیل کے انبیاء کے نام یہ لوگ جانتے تھے۔ اسی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں بھی پیغمبر آئے ہوں گے۔ اور کتابیں بھی نازل ہوئی ہوں گی۔ لہٰذا ہندوستان میں دوسری قوموں میں کہی جانے والی الٰہی کتاب یا یہاں کی مشہور شخصیتیں جنھیں یہاں کے لوگ ''اوتار'' یا ''رشی'' کہتے ہیں، ہم بہر حال صرف اس لئے ان کی تردید نہ کریں کہ ان کا نام قرآن میں نہیں ہے۔ قرآن میں ایک قوم صابئین کا ذکر ضرور ہے جن کی تشریح باقی ہے کہ یہ کون قوم ہے؟ بہر حال قرآن میں کوئی نام نہ ہونے سے ہم صاف اقرار تو نہیں کر سکتے لیکن اصول کی رو سے ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ فلاں کتاب الٰہی نہیں ہے یا فلاں شخصیت پیغمبر نہیں ہوسکتی۔ رہ گیا ان

چٹر جی نے ہندوستان کے لیے لکھا ہی نہیں۔ اس گانے کا تھوڑا حصہ سنسکرت میں اور تھوڑا حصہ بنگلا میں لکھا گیا تھا۔ اس لیے جناب اربندو نے ۱۹۰۹ء میں اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا تو اس کا عنوان (National Anthem of Bengal) یعنی بنگال کا قومی ترانہ رکھا۔ بنکم چندر چٹر جی نے ایک ناول بھی ''آنند مٹھ'' کے نام سے لکھا تھا جس میں یہ گیت شامل تھا۔ اس وقت بھی مسلمانوں نے اس گیت کو گانے کی مخالفت اس لیے کی تھی بنکم نے مادر وطن کی تعریف کو درگا اور لکشمی دیویوں کی پوجا کے برابر رکھا تھا اور اسی لیے اس مخالفت میں بودھ، سکھ، عیسائی، سوشلٹ اور کمیونسٹ سبھی شامل تھے۔ خود قومی ترانہ 'جن گن من' لکھنے والے رویندر ناتھ ٹیگور نے سبھاش چند بوس کو ۱۹۳۷ء میں لکھے اپنے خط میں یہ کہہ کر وندے ماترم کی مخالفت کی تھی کہ یہ گیت دراصل درگا کی پوجا ہے۔ انھوں نے خط میں لکھا تھا کہ یہ بات اتنی صاف ہے کہ کسی بحث کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ کیوں کہ بنکم نے گیت کے آخر میں یہ دکھایا ہے کہ بنگال اور درگا ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں۔ لہذا کسی مسلمان سے یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنے وطن کو دس ہاتھوں والی دیوی مان کر اس کی پوجا کرے۔ انھوں ے لکھا کہ ناول 'آنند مٹھ' ایک ادبی کوشش ہے اور اگر اس لیے اس میں یہ گیت ہے تو کوئی بات نہیں لیکن پارلیمنٹ جہاں الگ الگ مذاہب کے لوگ اکٹھا ہوں گے وہاں یہ گیت مناسب نہیں ہوگا۔ (کتاب selected letters of Rabindra nath Tagore) کیمبرج سے چھپی اس کتاب کے ایڈیٹر 'کے دتا' اور 'اے رابنسن' تھے۔ اسی طرح پنڈت نہرو کو لکھے گئے خط میں بھی ٹیگور نے لکھا تھا کہ خود ہندوؤں میں 'برہموسماج' (Bramho Samaj) اس گیت کو نہیں گائے گا کیوں کہ یہ گیت مورتی پوجا کو بڑھاوا دیتا ہے۔

وندے ماترم گیت لکھا تو گیا تھا ۱۸۷۵ء میں لیکن ۱۸۸۲ء میں یہ بنکم کے ناول 'آنند مٹھ' کا حصہ بنا۔ تب وہ لوگوں کی نظر میں آیا۔ ناول 'آنند مٹھ' مسلمانوں کو

ذلیل کرنے کے لیے لکھا گیا تھا۔ بعد میں اس ناول پر 'آنند مٹھ' نام کی ایک فلم بھی بنی جس میں وندے ماترم گیت کو وہی دھن دی گئی جس میں آج یہ گایا جاتا ہے۔ اس ناول میں خود کو سناتن کہنے والے ہندو سنیاسیوں کے ذریعہ مسلمانوں کی تباہی دکھائی گئی ہے۔ اس ناول کا ایک ٹکڑا ملاحظہ کریں:

''گاؤں کے لوگ مسلمانوں کو ختم کرنے کے لیے رات میں جتھا بنا کر مسلمان علاقوں میں گئے، انھوں نے مسلمانوں کے مکانات تہس نہس کر دیے اور ان کا تمام سامان لوٹ لیا، بہت سے مسلمان مار ڈالے گئے، بہت سارے مسلمانوں نے اپنی داڑھی مونڈ ڈالی، جسم پر بھبوت مل لیا اور ہری کا نام جپنا شروع کر دیا۔ ان سے جب پوچھا گیا تو انھوں نے کہا وہ ہندو ہیں۔ باقی مسلمان ڈر کر شہر کی طرف بھاگ گئے۔ مسلمانوں نے کہا اللہ اللہ! کیا قرآن شریف اتنے دنوں بعد غلط ثابت ہو رہا ہے، ہم لوگ پانچ وقت کی نماز پڑھتے ہیں مگر ہم چندن ملے ہندوؤں کو ختم نہیں کر سکے''۔

کچھ غیر مسلم رہنماؤں نے 'وندے ماترم' گیت کو قومی ترانہ بنائے جانے کی مخالفت اس لیے کی کیوں کہ 'آنند مٹھ' ناول میں ہندوؤں کی فوج کے کمانڈر کے منہ سے کہلوایا گیا ہے کہ

''ہندوستان میں بغیر انگریزوں کے حاکم ہوئے سناتن دھرم باقی نہیں رہ سکتا۔ ہندو رعایا انگریزی حکومت میں خوش رہے گی اور بغیر کسی پریشانی کے اپنے دھرم پر چلے گی۔ اس لیے اے عقل مند لوگو! انگریزوں کے خلاف لڑائی لڑنے سے بچو اور میرے کہے پر چلو۔ تمہارا مشن کامیاب رہا ہے۔ تم نے ماتا

کی بھلائی میں کام کیا ہے۔ انگریزی حکومت بن گئی ہے تم ان
سے لڑائی اور دشمنی کا خیال چھوڑ دو۔ لوگوں کو اچھی فصل اگانے
کے لیے کھیتوں میں لگ جانا چاہیے۔ لوگوں میں خوش حالی آنی
چاہیے۔ اب کوئی دشمن باقی نہیں ہے، انگریز ہمارا ہمدرد بادشاہ
ہے یہ اچھی طرح سمجھ لو کسی میں ایسی طاقت نہیں ہے کہ وہ
انگریزوں سے جنگ جیت سکے''۔

وندے ماترم کی اس وقت حمایت اور مخالفت کو دھیان میں رکھ کر کانگریس نے ۱۹۳۷ء میں مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو، مولانا آزاد اور سبھاش چندر بوس پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی، اس کمیٹی نے یہ محسوس کیا کہ گیت کے پہلے دو ٹکڑوں میں اعتراض والی کوئی بات نہیں ہے اس لیے اگر کہیں یہ گیت گایا بھی جائے تو وہاں صرف پہلے والے دو ٹکڑے گائے جائیں لیکن جلسہ کرنے والوں کو یہ چھوٹ ہوگی کہ وہ اس کے بدلے میں کوئی اور گیت گا سکتے ہیں جس میں کوئی اعتراض والی بات نہ ہو۔

اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اس گیت کو قومی گیت کہلوانے اور اس کو زبردستی گائے جانے کے پیچھے اصل منشا کیا ہے؟ اور کیوں مسلمان اس گیت کی مخالفت کر رہے ہیں؟۔

خدا حافظ بنام اللہ حافظ

ہندوستان کی تاریخ گواہ ہے کہ عرب سندھ چھوڑ کر بحیثیت حملہ آور ہندوستان کے کسی اور خطہ میں نہیں آئے۔سندھ میں راجہ داہر کے زمانہ میں محمد بن قاسم نے حملہ کر کے سندھ کو فتح کیا تھا لیکن یہ حملہ صرف سندھ تک محدود تھا۔پورے ہندوستان پر عربوں کی ثقافت نے کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔اس کے علاوہ کیرل کے ساحلی علاقہ مالابار میں بھی عرب تاجر کی حیثیت سے آئے تھے اور وہیں کے ہو رہے تھے۔ہاں اسلام لانے کے بعد ہندوستان پر حملہ کرنے والوں میں محمد بن قاسم کے بعد جتنے بھی تھے یا تو وہ ایران سے تعلق رکھتے تھے یا پھر افغانستان کے مختلف علاقوں سے ان کا تعلق تھا مگر ان میں اکثریت کی زبان فارسی تھی اور تو اور منگول نسل سے مسلمان ہو کر مغل کہلائے جانے والے حکمرانوں کی ہندوستان میں درباری زبان فارسی تھی۔ بعد میں دھیرے دھیرے اس کی جگہ اردو نے لے لی ،لیکن اردو پر غلبہ فارسی ہی کا رہا جو آج بھی ہے۔ بہر حال ایرانیوں یا پھر فارسی بولنے والے مسلم حکمرانوں نے اپنی فارسی زبان کے لفظ خدا کے وہی معنی لیے جو عربوں نے یا پھر وہاں کے مسلمانوں نے عربی لفظ اللہ کے لئے۔اور پھر اسی لئے ایرانیوں کے زیر اثر ہندوستانی مسلمانوں نے بلا کسی تفریق کے مختلف موقعوں پر اللہ کی جگہ خدا کا استعمال کرنا شروع کیا اور یہ لفظ اس طرح مروج ہوا کہ لفظ خدا کا استعمال کرتے ہوئے کسی کے گمان میں بھی یہ نہ رہا کہ یہ لفظ اللہ کے معنی سے کچھ الگ ہے۔اسی سلسلہ کی ایک کڑی خدا حافظ بھی ہے کہ

جب بھی کوئی رخصت ہونے لگا تو اس کی حفاظت اور نگہبانی کے لئے لوگ ہر رخصت ہونے والے کے لئے خدا حافظ کہنے لگے۔ یہ سلسلہ صدیوں سے جاری ہے۔

یہی نہیں ۱۹۴۷ء سے پہلے ہندوستان ایک تھا اور مختلف قومیں ایک ساتھ مل جل کر رہتی تھیں۔ اودھ کے حکمراں نوابوں نے اپنے زمانہ میں یہ محسوس کر کے کہ غیر مسلم کو اسلامی سلام ''السلام علیکم'' کہنا مناسب نہیں ہے، ایک نیا سلام ''آداب'' (میں آپ کا ادب کرتا ہوں۔ نمستے جیسا) اور ''آداب عرض ہے'' (ہندی کے نمسکار جیسا) ایجاد کیا اور چونکہ یہ ایرانی مسلمان تھے اور خدا کا مطلب وہی سمجھتے تھے جو اللہ کا ہے اس لئے انھوں نے اس بات کو باقی رکھا کہ کسی مسلمان کے رخصت ہوتے وقت دونوں لوگ ''خدا حافظ'' کہیں۔ یہ دونوں باتیں پورے شمالی ہندوستان (دہلی سمیت) میں لاگو تھیں۔ پاکستان بننے کے بعد بہت سے شمالی ہندوستان کے مسلمان مہاجر کی شکل میں پاکستان چلے گئے اور جب تک ان کا دبدبہ رہا، انھوں نے اس ''اودھ کلچر'' کو اپنائے رکھا، نتیجہ یہ تھا کہ شروعاتی دور میں پاکستان ریڈیو اپنی شروعات ''آداب'' سے اور خاتمہ ''خدا حافظ'' پر کرتا تھا۔ وہاں دھیرے دھیرے مہاجروں کا دبدبہ ختم ہوا۔ ساتھ ہی سعودی عرب میں ملازمت کے دروازے کھلے تو سعودی کلچر بھی پاکستان میں اپنا اثر دکھانے لگا۔ نتیجہ یہ کہ لفظ ''خدا'' کو اچھوت بنا دیا گیا اور ''خدا حافظ'' کا چولا بدل کر اسے ''اللہ حافظ'' بنا دیا گیا جبکہ عربی زبان میں اس کا متبادل ''فی امان اللہ'' موجود تھا۔ اس کی پہل پاکستان ریڈیو نے کی جسے پاکستان ٹی وی نے خوب آگے بڑھایا۔

اس کام میں بھلا ہندوستان والے کیوں پیچھے رہتے، یہاں بھی دھیرے دھیرے سعودی کلچر نے اپنا اثر دکھانا شروع کیا اور یہاں بھی ''اللہ حافظ'' نے اپنی جگہ بنانا شروع کی۔ پہلے اردو میں ''خدا حافظ'' اور عربی میں ''فی امان اللہ'' کہا جاتا تھا لیکن اب عربی جملہ ہٹا کر صرف ''اللہ حافظ'' کہا جانے لگا۔ یہ انقلاب زمانہ نہ تھا بلکہ

مسلمانوں میں سے ایک مخصوص ذہنیت رکھنے والے افراد لفظ ''خدا'' سے ہی بدکنے لگے اور اللہ کی جگہ انھوں نے لفظ ''خدا'' کا استعمال ہی متروک قرار دے دیا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی سے اردو میں اپنائی گئی اس ترکیب کو دو کیمپوں کا سامنا کرنا پڑا۔ایک وہ جو اسے کہنے میں کوئی برائی نہیں سمجھتا کیوں کہ اس کا مفہوم اللہ سے نگہبانی کی امید رکھنا ہے،مگر دوسرا کیمپ اب باقاعدہ اللہ حافظ ہی کہتا ہے۔اور شدت پسندی میں یہ طبقہ خدا حافظ کہنے کو گناہ سمجھتا ہے۔

حالانکہ اگر ہوش مندی سے کام لیا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ اللہ حافظ کہنے کا کٹّر حمایتی اس بات سے اتفاق کرے گا کہ ایک مسلمان چاہے اللہ کہے یا خدا اس کا مطلب اسی ایک قادر مطلق سے ہوتا ہے۔تو پھر یہ گناہ کیسے ہو جائے گا۔اور پھر اگر خدا حافظ کہنا گناہ ہے یا پھر اس سے آدمی غیر مسلم ہو جاتا ہے تو پھر ماضی کے ان لاتعداد مسلمانوں کے بارے میں کیا کہیں گے جو باقاعدہ خدا حافظ کہتے تھے اور ان میں صرف عوام ہی نہیں بلکہ جیّد مسلم شخصیتیں بھی شامل ہیں۔تو کیا یہ غیر مسلم کہے جائیں گے؟

بلاشبہ اللہ اس قادر مطلق کا ایک مکمل نام ہے لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ لفظ اللہ اسلام نے بتایا اور یہ ایک اسلامی نام ہے؟ کیا تاریخ کا کوئی جانکار اس بات سے انکار کرے گا کہ یہ نام اسلام آنے سے پہلے بھی استعمال ہوتا تھا؟اس کا سب سے بڑا ثبوت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والد کا نام ہے۔اس میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں کہ ان کا نام عبداللہ تھا یعنی اللہ کا عبد یا بندہ۔یہ جناب عبداللہ اعلان اسلام سے بہت پہلے انتقال فرما چکے تھے،لہٰذا یہ طے ہوا کہ لفظ اللہ اسلام سے پہلے کا ہے۔اسلام نے اسے صرف اپنایا ہے۔اعلان اسلام کے قبل کفار و مشرکین مکہ باقاعدہ اس لفظ کا استعمال کرتے تھے اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام میں بھی اس نام کو اللہ کے حکم سے باقی رکھا۔میرے اس دعوے کا ثبوت صلح حدیبیہ میں بھی ملتا ہے،جیسا کہ تاریخ داں

جانتے ہیں کہ صلحنامہ تحریر ہوتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بسم اللہ الرحمن الرحیم سے شروع کرنے کو کہا تھا لیکن کفار قریش کے نمائندہ سہیل ابن عمر نے رحمن اور رحیم کے لفظ پر اعتراض کیا تھا اور اصرار کیا تھا کہ صرف بسم اللہ لکھا جائے اور اس پر دونوں فریق راضی بھی ہو گئے تھے۔ظاہر ہے کہ بسم اللہ میں لفظ اللہ شامل ہے یعنی لفظ اللہ کفار میں بھی رائج تھا۔اس کے علاوہ عیسائی عرب ابھی بھی خدا کے لئے انگریزی لفظ (God) کے بجائے اللہ ہی پکارتے ہیں یعنی عربوں کا بلا تفریق مذہب خدا کے لئے استعمال کیا جانے والا لفظ اللہ تھا اور اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہ تھا۔عیسائی نہ تو گوڈ کو اللہ کہنے پر مسلماں ہو جاتے ہیں اور نہ ہی مسلمان God کہنے پر عیسائی۔خود قرآن گواہی دے رہا ہے کہ مشرکین مکہ اسلام سے پہلے بھی لفظ اللہ کا استعمال کرتے تھے ۔ملاحظہ ہو۔

(۱) اور یہ لوگ اللہ کی سخت سخت قسمیں کھاتے ہیں (سورۂ انعام آیت ۱۱۰)

(۲) اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے سارے آسمان وزمین کو پیدا کیا اور کس نے سورج اور چاند کو مسخر کیا تو وہ ضرور ہی کہیں گے کہ اللہ نے (سورۂ عنکبوت آیت ۶۱)

(۳) اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمان سے پانی برسایا اور پھر اس کے ذریعہ سے زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کیا تو وہ ضرور یہی کہیں گے کہ اللہ نے (سورۂ عنکبوت آیت ۶۳)

قرآن کی اس گواہی اور تاریخی شہادت (رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والد کا نام عبد اللہ اور صلح حدیبیہ) کے بعد یہ مان لینے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہئے کہ قادر مطلق کا نام ''اللہ'' عرب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعلان نبوت سے پہلے کا ہے ۔لہٰذا اللہ لفظ کی بھی وہی پوزیشن ہے جو خدا کی ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ لفظ اللہ عربی

ہے اور لفظ خدا فارسی ہے اور یہ کہ مشرکین مکہ لفظ اللہ استعمال کرتے تھے اور زرتشت (جو ایک خدا کو ماننے والے تھے) کے ماننے والے فارسی لفظ خدا کا استعمال کرتے تھے جو اب تک مستعمل ہے۔

جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں کہ خود اللہ نے ایسے تمام ناموں سے پکارنے کی اجازت دی ہے جو اچھے نام (اسماء حسنیٰ) ہوں اور ان سے اللہ کی معبودیت کی طرف اشارہ ہو۔ سورۂ اعراف کی آیت ۱۸۰ میں اللہ کا اعلان ہے کہ سارے اچھے نام (اسماء حسنیٰ) اللہ ہی کے خاص ہیں تو اسے انھیں ناموں سے پکارو اور جو لوگ اس کے ناموں میں الحاد کرتے ہیں انھیں اس کے حال پر چھوڑ دو۔ اسی طرح سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۱۱۰ میں اللہ کہتا ہے کہ چاہے تم اللہ کہہ کر پکارو یا پھر رحمن پکارو، اس کے تو سب نام اسماء الحسنیٰ ہیں۔ رہ گیا یہ کہ اسماء الحسنیٰ کون ہیں، ان کی گنتی کے بارے میں قرآن نے کوئی جان کاری نہیں دی ہے۔ صرف حدیثوں سے اس کے ۹۹ ناموں کا پتہ چلتا ہے لیکن اس میں بھی اختلاف ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ تمام نام عربی زبان کے ہیں کیوں کہ قرآن عربوں کے لئے ان کی اپنی زبان عربی میں اتارا گیا تھا۔ آخر اس قادر مطلق کو ماننے والے غیر عرب مومن بھی اپنے اپنے زمانوں میں اس کو اپنی زبان میں پکارتے ہوں گے کیوں کہ اللہ صرف عربوں کا تو نہیں ہے بلکہ دنیا میں جہاں جہاں انسان ہیں ان سب کا بھی وہی مرکز ہے جس کو وہ اپنی زبان میں پکارتے رہے ہیں۔ لفظ خدا جس کے پیچھے کچھ مخصوص ذہنیت کے لوگ پڑے ہوئے ہیں، وہ ایک فارسی کا لفظ ہے اور اس کا بھی مطلب وہی ہے جو لفظ اللہ کا ہے۔ یہ لفظ ''خد'' یا ''خود'' سے نکلا ہے جس کا آسان معنیٰ ''خود سے موجود'' ہے۔ یہاں اگر ہم سورہ توحید میں ایک آیت کے ایک حصہ ''لم یلد ولم یولد'' کا حوالہ دیں تو اس کا بھی وہی مفہوم ''خود سے موجود'' ہی نکلتا ہے۔

لہٰذا صرف اس لئے خدا حافظ نہ کہنا کہ خدا فارسی لفظ ہے اور اللہ حافظ کہنا کیوں کہ اللہ عربی لفظ ہے، کسی طرح سے مناسب نہیں ہے کیوں کہ اسلام تو آفاقی مذہب ہے اور اس کا عرب اور عجم سے کیا مطلب ۔ اسلام تو اس فرق کو مٹانے آیا تھا ،اسے سراسر تعصب کہیں گے یا طالبانی ذہنیت اور یہ ذہنیت صدیوں سے استعمال میں آرہے لفظ ''خدا حافظ'' میں بھی کیڑے نکالنے لگی ہے۔

ہمیں اس ذہنیت کے آگے خود سپردگی نہیں کرنی ہے اور وہ لوگ جو خدا حافظ کہتے رہے ہیں انھیں، اس لفظ کا برابر استعمال کر کے شدت پسندی کو آئینہ دکھانا چاہئے۔

بچوں کے مستقبل کی تعمیر میں والدین کا کردار

اب جبکہ سال 2016ء کے سالانہ امتحانات ختم ہو چکے ہیں اور بچے نئے کلاس میں جا چکے ہیں۔ ایسے میں یہ میرے لئے مناسب موقع ہے کہ طلباء کو ڈسٹرب کئے بغیر ان کے والدین سے تھوڑی گفتگو کر لی جائے۔

زیادہ تر والدین اپنے بچوں کو پڑھانا چاہتے ہیں انکے دل میں یہ احساس اپنی جگہ بنائے رہتا ہے کہ وہ تو جو بننا بگڑنا تھا بن بگڑ لئے لیکن ان کی یہ تمنا رہتی ہے کہ انکا بچہ ان سے زیادہ پڑھ لکھ کر ان سے زیادہ ترقی کی منزلیں طے کرے۔ چونکہ ابھی تک پڑھائی ناپنے کا یہی پیمانہ بنا ہوا ہے کہ کل مضامین میں سو میں کتنے اچھے نمبر لائے اور مجموعی طور پر کتنا فیصد مارکس لائے تو والدین بھی یہی چاہتے ہیں کہ انکا بچہ اچھا فیصد مارکس لائے تا کہ انکو سماج میں سرخروئی حاصل ہو۔ اس سلسلہ میں ایک لطیفہ مشہور ہے کہ ایک بچہ ایک پرانے رپورٹ کارڈ سے کھیل رہا تھا۔ جب اسکے والد نے اس کے ہاتھ میں رپورٹ کارڈ دیکھا تو اس نے کتنے نمبر پائے، یہ جاننے کیلئے رپورٹ کارڈ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ انگلش میں 25، حساب میں 20 ہندی میں 33 اور سائنس میں 22 نمبر ملے ہیں تو وہ آگ بگولہ ہو کر بچے کو ڈانٹنے لگے کہ تم نے یہی پڑھائی کی ہے۔ جواب میں بچہ بڑی معصومیت سے بولا کہ "پاپا یہ میرا رپورٹ کارڈ نہیں ہے۔ میں نے تو اسے اسٹور روم میں پڑا پایا تو اسے صاف کر کے رکھنے جا رہا تھا۔ اب جو والد صاحب نے دھیان سے رپورٹ کارڈ میں نام دیکھا تو وہ ان کا ہی رپورٹ کارڈ تھا۔ یہ لطیفہ میری اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ والد

کتابوں میں خلاف عقل یا خلاف قرآن باتوں کا شامل ہونا تو جب توریت، زبور اور انجیل تحریف سے نہ بچ سکیں اور خلاف عقل و خلاف قرآن واقعات اس میں شامل ہو گئے تو یہاں کی کتابیں بھی تحریف سے نہ بچ سکی ہوں گی اور اگر تحریف نہ ہوئی ہوتی تو اللہ پچھلی کتابوں کو منسوخ کیوں کرتا اور قرآن کی حفاظت کی ذمے داری کیوں لیتا؟ اس لئے یہاں کی کتابوں کو یا شخصیتوں کو نظر انداز کرنے کے بجائے ہمارا پیمانہ یہ ہونا چاہئے کہ اسلام کے معیار پر کوئی کتاب ٹھہرتی ہے یا نہیں یا اس معیار پر کوئی شخصیت پوری اترتی ہے یا نہیں۔

اب ہم ذرا دوسرے پہلو پر غور کریں۔ قرآن کے مطابق اللہ نے تمام انبیاء سے میثاق (عہد) لیا تھا کہ وہ آخری نبی کی تصدیق کریں۔ اب ہر نبی دنیا میں آنے کے بعد اسی طرح تو تصدیق کر سکتا تھا کہ وہ اپنی قوم میں آخری رسول کے بارے میں پیشین گوئی کرے۔ یہ پیشین گوئی اس نبی کی قومی زبان میں آخری رسول کے نام اور اس کی علامتوں کے ذریعہ ہو سکتی تھی۔ اگر ہم ان پیشین گوئیوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں یہ بھی سوچنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ وہ شخصیت بھی اللہ کے نزدیک رہی ہوگی۔

اب چونکہ میرا موضوع ہے "حضرت محمدؐ ہندو مذہبی کتب میں" ہے اس لئے ہم پہلے ہندو مذہب کی بنیادی کتب کو بیان کرتے ہیں۔ یہ اس طرح ہیں۔

(۱) وید (۲) پُران۔ (۳) براہمن۔ (۴) اپنشد۔ (۵) آرنیک۔ (۶) اسرتی

ہندو حضرات ویدوں کو الٰہی کتاب مانتے ہیں۔ ان کے مطابق کسی کو بتائے گئے اور انھیں سن کر بہت سے رشیوں نے انھیں حفظ کر لیا جو سینہ بہ سینہ بعد تک پہنچا۔ بقیہ کتابیں ویدوں کی تفسیریں ہیں جو الگ الگ رشیوں کے ذریعہ کی گئی ہیں۔

اب ہم ویدوں میں پیشین گوئیوں پر نظر ڈالتے ہیں وید چار ہیں یہاں ان کا سلسلہ وار ذکر ہے:۔

رِگ وید: رِگ وید کے منتر ۸ سوتر ۶۔ ۱۰ میں تو بالکل احمِد (अहमिद) یا

چاہتے ہیں کہ ان کا بچہ اچھے سے اچھا نمبر لائے۔

بچوں کے سلسلے میں ہم والدین کی چار حصوں میں درجہ بندی کر سکتے ہیں

(۱) وہ والدین جو اتنے غریب ہیں کہ وہ بچوں کو پڑھانے کے بارے میں سوچتے بھی نہیں، کیونکہ وہ سوچتے ہیں کہ وہ جس دستکاری یا مزدوری کے ذریعہ روزی کما رہے ہیں اس میں ان کا بچہ بھی لگ جائے گا تو گھر میں آمدنی بڑھ جائے گی۔ وہ بچے کو اس لیے بڑھتے دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ اس قابل ہو جائے کہ گھر کی آمدنی میں اضافہ کر سکے۔ اس لیے نہیں کہ وہ تعلیم حاصل کر سکے۔ نتیجہ یہ کہ نسل در نسل جاہل رہ جاتی ہے میری اس بات کا مشاہدہ آپ اپنے آس پاس کے علاقہ میں کر سکتے ہیں۔ یہ ایک سماجی مسئلہ ہے۔ اسے تو عوامی حکومت ہی حل کر سکتی ہے۔

(۲) بہت سے والدین غریب تو ہیں لیکن ان میں یہ جذبہ پایا جاتا ہے کہ کچھ ایسا کیا جائے کہ ان کی غریبی دور ہو سکے اسی لیے وہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے پڑھیں تا کہ ایک وقت ایسا آئے کہ ان بچوں کی وجہ سے گھر کی غریبی دور ہو سکے۔ اس کے لیے وہ لوگ اپنی خوشیوں کی قربانی بھی دیتے ہیں، ان کے بچے جب پڑھتے ہیں تو ان بچوں میں یہ احساس کچوکے دیتا رہتا ہے کہ ہمیں کسی صورت میں پڑھائی جاری رکھنا ہے اور گھر کی غریبی کو دور کرنا ہے۔ لیکن اس میں ایک مشکل سامنے آتی ہے وہ یہ کہ غریبی کی وجہ سے وہ مہنگی پڑھائی نہیں پڑھ پاتے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ حالانکہ کچھ استشناء بھی سامنے آتے ہیں کہ وہ اپنی محنت سے آئی اے ایس وغیرہ بن جاتے ہیں۔

اگر سماجی مسائل حل کرنے میں دلچسپی رکھنے والے کوئی اصول وضع کر کے ایسے گروپ کی بھرپور مدد کریں تو جہالت بھی دور ہو گی اور اس طبقہ میں خوش حالی بھی پیدا ہو گی۔

(۳) تیسرا طبقہ مڈل کلاس کا ہے۔ یہاں والدین بچوں کو مہنگی پڑھائی بھی

پڑھوانے کی کوشش کرتے ہیں چاہے ان کو کتنی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔ایسے والدین ہائی اسکول کے بعد پہلے یہ اندازہ لگاتے ہیں کہ بازار میں کس تعلیم کی زیادہ مانگ ہے کیونکہ اس طبقہ کے لوگوں کی منزل نوکری ہوتی ہے۔وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہوتا ہے کہ وہ بچے کو کسی کاروبار میں لگا سکیں۔ وہ ایسی پڑھائی پر زیادہ زور دیتے ہیں کہ بچے کو اچھی نوکری مل سکے اس کے لیے وہ بچے کو انجینیر نگ یا ایم بی اے وغیرہ کی تعلیم دلانا چاہتے ہیں۔ان کو اس سے کوئی مطلب نہیں رہتا کہ ان کے بچے کو کس موضوع کو پڑھنے میں زیادہ دلچسپی ہے۔

(۴) یہ طبقہ امیر لوگوں کا ہے۔ان کے پاس سرمایہ کی کمی نہیں۔ وہ اپنے بچے کو وہ اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتے ہیں جس میں بچے کی وجہ سے انھیں بھی شہرت حاصل ہو سکے اور وہ فخر کر سکیں اس کے لیے وہ ڈونیشن کی رقم کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ یہ طبقہ بھی بچے کی پسند ناپسند کا کوئی خیال نہیں کرتا۔

ہمارا یہ مضمون طبقہ نمبر ۳ اور نمبر ۴ کے والدین سے تعلق رکھتا ہے۔ان دو طبقوں کے بچوں کو بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان دو طبقوں کے والدین اس بات پر تلے رہتے ہیں کہ ان کا بچہ ہر حالت میں ۹۰ رفیصد سے زیادہ مارکس لائے اور وہ تعلیم حاصل کرے جو انھیں ترقی اور اچھی آمدنی دے سکے۔

ان دو طبقوں کے والدین یہ بھول جاتے ہیں کہ ہر بچے کی دماغی سطح (Mental level) الگ الگ ہوتی ہے اور یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر بچہ زیادہ مارکس ہی پائے۔دوسری بات یہ کہ ہر بچے میں الگ الگ پڑھائی کا رجحان ہوتا ہے ،تیسرے یہ کہ یہ ضروری نہیں کہ زیادہ مارکس پانے والا ہی ترقی کا موقع پا سکے کیوں کہ اگر وہ رٹ کر زیادہ مارکس لایا ہے تو چونکہ اس نے اس مضمون پر سمجھنے کے لیے پڑھا نہیں ہے اس لیے بعد میں وہ بھول جاتا ہے کہ اس نے کیا پڑھا تھا۔ایسے میں اسے انٹرویو میں دھچکا پہنچ سکتا ہے۔دھیان رہے کہ کوئی بھی رپورٹ کارڈ کسی بھی بچے

کی صحیح قابلیت کونہیں بتا سکتا۔ ہم اپنی اس بات کو ثابت کرنے کے لیے ایک اشتہار کو پیش کر رہے ہیں یہ اشتہار آج کل ہر ٹی وی چینل پر کسی کمپنی کا آرہا ہے کہ ایک اسکول کی پرنسپل نے میٹنگ میں ہر بچے کے والد سے دسویں کلاس میں خود انھوں نے جو مارکس پائے تھے اس کا فیصد (Percentage) پوچھا۔ اتفاق سے کسی کو بھی یاد نہیں تھا۔ اب پرنسپل نے انھیں بتایا کہ انھیں دسویں کلاس میں 59% مارکس ملے تھے اور آج میں آپ کے بچوں کے اسکول کی پرنسپل ہوں اور اسی لیے دعویٰ سے کہہ سکتی ہوں کہ آج تک کوئی ایسا رپورٹ کارڈ ایجاد نہیں ہوا ہے جو بچوں کی حقیقی قابلیت کو بتا سکے۔ رپورٹ کارڈ صرف مارکس دکھاتے ہیں جو اور کچھ نہیں صرف نمبر (عدد) ہے انھوں نے کہا کہ اس لیے والدین کو اپنا دھیان مارکس سے ہٹا کر بچے کو سیکھنے پر لگانا چاہیے۔

ایک دوسری سچی مثال ایک اسکول (نام مخفی) کی ہے جس کی پرنسپل نے اپنے فیس بک پیج (Facebook page) پر امتحان میں شامل ہونے والے طلبہ کے والدین کو ایک دل چھو لینے والا خط لکھا جس میں اس بات پر زور دیا کہ کہ اس بات کی پرواہ کیے بغیر کہ وہ امتحان میں کیا کرتے ہیں، ان میں خود اعتمادی پیدا کریں۔

خط کا اردو ترجمہ یوں ہے۔

''تمام بچوں کے امتحانات جلدی شروع ہونے والے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ آپ اس بات کو لے کر بے چین ہوں گے کہ آپ کے بچے امتحان میں کیا کرتے ہیں اور دلی توقع رکھتے ہوں گے کہ آپ کا بچہ امتحان میں کامیابی حاصل کرے۔ لیکن برائے مہربانی یاد رکھیں کہ ان امتحان دینے والوں کے الگ الگ رجحانات ہیں۔ ان میں سے ایک آرٹسٹ ہے جسے میتھ (Mathematics) سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ انھیں میں ایک کاروباری ہے جسے تواریخ (History) یا انگلش لٹریچر سے کوئی

مطلب نہیں ہے انھیں میں ایک موسیقار ہے جسے کیمسٹری کے مارکس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔انھیں میں ایک کھلاڑی ہے جس کے لیے فزکس (Physics) سے زیادہ جسمانی تندرستی (Physical fitness) اہم ہے۔

اگر آپ کا بچہ اسکول میں ٹاپ (Top) کرتا ہے تو بہت اچھی بات ہے لیکن اگر ایسا نہیں ہوتا ہے تو خدا کے لیے اس سے اس کی خوداعتمادی مت چھینئے۔وہ زندگی میں کوئی اور بڑا کام کرنے والا ہے۔ایسے بچے سے کہیے کہ کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم کتنے مارکس لائے ہو۔ہم تو تم سے پیار کرتے ہیں اور صرف مارکس سے تم کو نہیں ناپتے۔

برائے مہربانی ایسا کیجیے اور اگر آپ ایسا کرتے ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ آپ کا بچہ ایک دن دنیا فتح کر لیگا۔ایک امتحان یا 90% مارکس اس کے خواب یا اس کی صلاحیتوں کو نہیں چھین پائیں گے۔"

کتنا نصیحت بھرا یہ خط ہے۔والدین اگر اس کے برعکس عمل کرتے ہیں تو بچوں میں مایوسی پیدا ہوتی ہے، کتنی ہی مثالیں ایسی ہیں کہ 95% پانے والے بچے نے خودکشی کر لی کیوں کہ وہ والدین کی 99% کی تمنا پر پورا نہیں اترا تھا۔ایسا نہ کریں کیوں کہ یہ بچے پر ظلم ہے۔

یہ تو تھی ذہنی سطح اور مارکس کی بات۔اب رہی بچوں کی پسند ناپسند یا رجحان (Aptitude) کی بات۔زیادہ آمدنی اور جھوٹی شان کو سب کچھ مان کر اپنی مرضی بچوں پر لاد دیتے ہیں جس سے بچوں کا بہت نقصان ہوتا ہے، ایک مشہور اسکول (نام مخفی) کی پرنسپل نے دو اثر انگیز مثالیں بچوں کے والدین کو بتائیں جو ہم آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

(۱) اس اسکول میں ایک لڑکی پڑھتی تھی جسے لکھنے کا بڑا شوق تھا۔وہ بہترین مضامین لکھا کرتی تھی جو اکثر اسکول کی میگزین میں بھی آتے تھے۔اس کی اس صلاحیت کو دیکھ کر اس کی ٹیچر اور پرنسپل نے اسے جرنلزم (Journalism) یا ماس

کمیونیکیشن (Mass communication) کی تعلیم حاصل کرنے کی صلاح دی۔لیکن اس کے امیر والدین چاہتے تھے وہ ڈاکٹر بنے۔ان کی زبردستی سے اس نے تین بارسی پی ایم ٹی (CPMT) کا امتحان دیالیکن ناکام رہی ،والد رئیس تھے انھوں نے ایم بی بی ایس (MBBS) کرنے کے لیے اسے نیپال بھیج دیا۔ڈونیشن (Donation) کے بل پر اس نے ایم بی بی ایس کرلیا جب واپس ہندوستان آئی تو پتا چلا کہ نیپال کے ایم بی بی ایس کا یہاں کوئی ویلیو (Value) نہیں ہے اور اسے پریکٹس کے لیے ہندوستان میں ایک ٹیسٹ کوالیفائی کرنا پڑے گا۔ وہ چار چار بار کوشش کے باوجود ٹیسٹ پاس نہیں کرسکی۔آج وہ مایوسی کا شکار ہے کیوں کہ نہ تو وہ اپنے رجحان والا کر پائی اور نہ اپنے والدین کی امیدوں پر کھری اتری۔

(۲) اسی اسکول میں ایک ذہین بچہ تھا۔والدین کے دباؤ میں اس نے آئی آئی ٹی (IIT) پاس کیا اور اس کا ٹاٹا میں کیمپس سلیکشن (Campus Selection) بھی ہوگیا لیکن اسے اس نوکری سے خوشی نہیں تھی ،ایک بار جب وہ اسکول میں ملنے آیا تو اس نے اپنی ٹیچر اور پرنسپل سے اپنی بے چینی کے بارے میں بتایا تو پرنسپل نے اسے اپٹی چیوڈ ٹیسٹ (Aptitude test) دینے کی صلاح دی اس ٹیسٹ میں اس کا سب سے زیادہ رجحان مینجمنٹ (Management) کے شعبہ میں پایا گیا۔اس کے بعد اس نے ایک امریکن یونیورسٹی سے ایم بی اے (MBA) کیا اور آج وہ امریکہ کی ہی ایک بڑی کمپنی میں ۱۶ لاکھ ماہوار پر Management سنبھال رہا ہے۔

آپ تمام والدین سے مندرجہ بالا باتوں پر تبادلۂ خیال کا ایک ہی مقصد ہے کہ آپ بچے کے رجحان کے مطابق اس کو تعلیم دلائیں،اس پر اپنی مرضی نہ تھوپیں اور نہ ہی Percentage کے چکر میں پڑیں۔ہوسکتا ہے کہ آپ کا بچہ کامیابی کی ایک نئی راہ نکالے۔

WADI-YE-TAHQIQ

(Research articles)

By :

Alhaj Syed Alim Husain Rizvi

الحاج سید عالم حسین رضوی

Printed by : Salman Computers Ph.: 0542-2455161

احمد صاف طور پر نام لکھا ہے۔اس منتر کا شروع ہے ''اَحمِد دی پِتُشپَری'' (अहमिद दि पितुष्परि) سے جس کا مطلب ہے کہ میں (احمد) نے ہی محافظ اور قدرت کے قانون چلانے والے خدا سے علم غیب حاصل کیا ہے۔میں سورج کی چمک کی طرح ظاہر ہوں (کتاب: دھارمک ایکتا کی جیوتی صفحہ ۲۱ رمصنف وید پرکاش اپادھیائے)رِگ وید کے ہی پہلے منڈل ،تیرھویں سوکت،تیسرے منتر اور اٹھارویں سوکت،نویں منتر اور ۱۰۶ اویں سوکت چوتھے منتر میں اسی طرح دوسرے منڈل کے تیسرے سوکت دوسرے منتر ۔پانچویں منڈل کے پانچویں سوکت دوسرے منتر ساتویں منڈل کے دوسرے سوکت،دوسرے منتر،دسویں منڈل کے چوسٹھویں سوکت تیسرے منتر اور ۱۸۲ رویں سوکت دوسرے منتر میں ایک آخری رشی ''نرا شنس (नराशंस) کا ذکر آیا ہے۔

سام وید: سام وید کی سنہتا (संहिता) کے ۱۳۴۹ رویں منتر میں اور واجسنئیٔ (वाजसनेई)سنہتا کے ۲۹ رویں ادھیائے کے ستائیسویں منتر میں بھی ''نراشنس'' کا ذکر ملتا ہے۔

یجر وید: شت پتھ براہمن کے پہلے کانڈ اور تیتری ارنیک (तैत्तिरिय अरण्यक) میں بھی ان کا بیان ہے

اتھر وید: اس کی سنہتا ۱ر ۱۲/۲۰/۷ راور ۲ر ۱۲/۲۰/۷ میں بھی نراشنس کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ''نراشنس'' صرف ایک وید تک محدود نہیں بلکہ چاروں ویدوں میں بیان کئے گئے ہیں ۔(کتاب نراشنس اور انتم رشی صفحہ ۸ ،مصنف وید پرکاش اپادھیائے

یہاں ہم سنسکرت کے منتر اور ان کا لفظی ترجمہ کر کے مضمون کو لمبا نہیں کرنا چاہتے بلکہ ان ویدوں میں دی گئی ''نراشنس'' کی علامتوں کو بیان کر کے یہ دیکھیں گے کہ یہ علامتیں حضرت محمدؐ پر منطبق ہوتی ہیں یا نہیں؟

سب سے پہلے نراشنس لفظ کا مطلب ہم بتاتے ہیں۔ یہ دو لفظ نر اور آشنس سے مل کر بنا ہے یعنی ایسا آدمی جس کی تعریف (حمد) کی جائے۔ کیا یہ لفظ محمدؐ کی طرف اشارہ نہیں کر رہا ہے۔ علامتوں کے تحت بتایا گیا ہے کہ نراشنس کی تعریف کی جائے گی۔ وہ خدا کا محبوب ہوگا اور میٹھی زبان والا ہوگا اس لئے یگیہ کرتے وقت اس کا ذکر کرو۔ وہ ریگستانی علاقہ میں پیدا ہوگا۔ اور اس کی سواری اونٹ ہوگی (کیا یہ صاف اشارہ رسول خدا کی طرف نہیں؟)

نراشنس ''کوی'' ہوگا۔ یہاں ہم بتاتے چلیں کہ ویدک زبان میں کوی علم غیب رکھنے والے کو کہتے ہیں۔ نراشنس سے عجب سا، نور، ساطع ہوگا، وہ اپنے، نور، سے سارے جہاں کو روشن کردے گا۔ نراشنس کو خدا کی طرف سے سو سونے کے سکے، دس مالائیں، تین سو گھوڑے اور دس ہزار گائیں دی جائیں گی (یہ علامتی زبان ہے) آنگی رس رشی نراشنس سے درخواست کرتے ہیں کہ آپ دنیا میں آیئے اور ساری دنیا کے لوگوں کو گناہ سے الگ کیجئے (ہندی کتاب نراشنس اور انتم رشی صفحہ ۱۴، مصنف وید پرکاش اپادھیائے)

اب ہم ان علامتوں کو دیکھ کر یہ فیصلہ کریں کہ یہ رسولؐ خدا پر صادق آتی ہیں کہ نہیں؟ ہم دیکھتے ہیں کہ رسولؐ خدا کی خود خدا نے تعریف کی۔ اسی لئے وہ محمدؐ کہلائے۔ وہ ریگستانی علاقہ میں پیدا ہوئے اور ان کی سواری اونٹ تھی۔ کوئی نماز (عبادت) رسول خدا کے تذکرہ کے بغیر صحیح نہ ہوگی۔ رسول خدا علم غیب کے حامل تھے۔ وہ مجسم نور تھے ان کے چہرہ سے، نور، ساطع ہوتا تھا جس نے ان کی پیروی کی وہ اندھیرے سے باہر آ گیا اور اسے روشنی مل گئی۔ رسول خدا کے زمانے میں قرآن کے سو حافظ، ایمان کے درجات پر دس مومن، جنگ بدر میں تین سو مجاہد ساتھی (گھر والوں کو چھوڑ کر) اور فتح مکہ کے وقت دس ہزار مسلمان تھے۔

یہ تمام علامتیں اشارہ کر رہی ہیں کہ ویدوں میں جس ''نراشنس'' کے ہونے کی پیشینگوئی کی گئی ہے وہ اور کوئی نہیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

اسی طرح یجر وید میں ۱۸/۳۱ میں یہ منتر آیا ہے ویداحمیتم پروشم مہانتمی دتیہ ورن تمسا پرستات (वेदाहमेतं पुरुषं महानतमिदतयवरणा तमसा प्रस्तात)

یہاں بھی ویداحمت دو لفظ وید اور احمیت سے بنا ہے۔ اس کا ترجمہ اچاریہ وشنو دیو پنڈت اور ڈاکٹر راجندر پرساد نے اس طرح کیا ہے "احمد وید گیانی (برہم گیانی یعنی خدائی علم رکھنے والے) ہیں۔ اعلیٰ ترین مرد ہیں جو سورج کی طرح روشن اور اندھیرے کو ختم کرنے والے ہیں"۔ (ہندی کتاب شانتی پیغام صفحہ ۲/۳ روشنی پبلشنگ ہاؤس رام پور)

اب ہم ویدوں کے بعد پُرانوں پہ آتے ہیں۔

پُران:۔ پُران اٹھارہ ہیں ان میں سب سے زیادہ بھاگوت پران، کلکی پران اور بھوشیہ پُران میں رسول اکرم کا ذکر ہے۔ بھاگوت پران میں تو صاف طور پر نام محمدؐ آیا ہے۔:

آگیان ہیتو کرت محمد اندھکار ناشم ودھائے ہیتدو دیتے وویکاہ (अज्ञान हेतु मोहम्मदान्धकार नाशं विधायहितदो दयते विवेकः) (بھاگوت پران ۲/۷۶)

اس کے علاوہ بھاگوت پران اور کلکی پران میں ایک آخری اوتار یعنی کلکی (कल्कि) اوتار کا ذکر ہے۔ بھاگوت پران میں ہے کہ کلکی اوتار شمبھل گاؤں کے مخصوص اور عظیم برہمن "وشنو یش" (विष्णुयश) کے یہاں پیدا ہوں گے اور ان کی ماں کا نام سمتی (सुमति) ہوگا۔ (اشلوک ۱۸/۲/۱۲ اور کلکی پران ۲/۱۱)۔ شمبھل کا مطلب ہے امن کی جگہ (کیا مکہ امن کی جگہ نہیں کہا جاتا) سب سے بڑے برہمن وشنو یش، یہ دو لفظ وشنو اور یش سے ملکر بنا ہے، وشنو یعنی اللہ اور یش عبد یا بندہ۔ ملا دیں تو ہوا عبداللہ۔ ماں سمتی یا سوم وتی یعنی امن وسلامتی والی، لفظ آمنہ کا بھی وہی مطلب ہے۔ وہ آٹھ خوبیوں والے ہوں گے (بھاگوت پران ۱۲۔۲۔۱۹ (۱) پرگیا (प्रज्ञा) یعنی علم غیب کے حامل (۲) کلینتا (कुलीनता) یعنی اعلیٰ نسب (۳) اندریہ

دمن (इन्द्रिय दमन) یعنی ضبط نفس وتقویٰ والا (۴) شروتم (श्रुत) یعنی اللہ کا پیغام سننے والا یا صاحب وحی (۵) پراکرمی (पराक्रमी) یعنی شجاع (۶) مت بھاشی (मितभाषी) یعنی کم گو (۷) کرتگیہ (कृतज्ञ) یعنی جذبۂ تشکر والا (۸) دانی (दानी) یعنی سخی، یہ سب خوبیاں رسولؐ اکرم میں تھیں۔ (ہندی کتاب کلکی اوتار اور محمد صاحب صفحہ ۳۹۔۴۰۔۴۱، مصنف وید پرکاش اپادھیائے)

جو خصوصیتیں اس اوتار کی بیان کی گئی ہیں وہ بھی سن لیجیے۔

(۱) وہ آخری زمانہ کا آخری اوتار ہوگا (۲) دنیا کو صحیح راستہ دکھائے گا (۳) وہ برائی کے داغ کو دھونے والا ہوگا (۴) دیوتاؤں کے ذریعہ گھوڑا ملے گا (۵) گھوڑے پر سواری کرے گا (۶) تلوار سے جنگ کرے گا (۷) وہ راجہ کے بھیس میں چھپے ہوئے ڈاکوؤں کو ختم کرے گا (۸) ان کے جسم سے خوش بو نکلے گی (۹) وہ اپنے چار بھائیوں کے ساتھ شیطان کو شکست دیں گے (تشریح طلب) (۱۰) اسے جنگ میں دیوتاؤں کے ذریعہ مدد ملے گی غالباً جنگ بدر (۱۱) ان کے والد پیدائش سے پہلے فوت ہو جائیں گے اور والدہ بھی جلد فوت ہو جائیں گی۔ (۱۲) وہ پہاڑوں کی طرف جائیں گے اور وہاں پرشورام شاید جبریل خدا کا پیغام دیں گے (۱۳) وہ اتر کی طرف جائیں گے پھر پلٹیں گے "مدینہ مکہ کے شمال میں ہے اور فتح مکہ کے دن رسول مکہ پلٹے تھے" (حوالہ کے لیے دیکھیں ہندی کتاب کلکی اوتار اور محمد صاحب، مصنف وید پرکاش اپادھیائے)

بلاکسی شک کے یہ سب خصوصیتیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

ایک خاص پُران بھوشیہ پُران (भविष्य पुराण) ہے جس میں حضرت آدمؑ سے لے کر آخری نبی تک کا ذکر ہے۔ بھوشیہ پُران کے پرو (पर्व) تین کھنڈ ۳ اشلوک ۲۵ میں بھی جو کلکی اوتار کا ذکر ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ ختنہ شدہ ہوگا۔ اس کے چوٹی نہ ہوگی اور وہ داڑھی مونچھ والا ہوگا۔ بھوشیہ پُران کے پرتی سرگ پرو (प्रातिसर्ग)

पर्व) میں ویاس (व्यास) جی بیان کرتے ہیں کہ:

''ہندوستان میں دھرم کی بے عزتی دیکھ کر راجہ بھوج (جن کی قبر ضلع دھار صوبہ مدھیہ پردیش میں ہے اور جسے میں خود دیکھ چکا ہوں) دریائے سندھ پار کر کے عرب جاتے ہیں۔ اسی بیچ اپنے لوگوں کے ساتھ مہامد (محمدؐ) نامی ملیچھوں (म्लेच्छों) کے رشی وہاں آتے ہیں (ویدک زبان میں ملیچھ کا مطلب باہری، اچھے اعمال والا، عالم اور مذہب کا جاننے والا ہوتا ہے) راجہ بھوج ریگستان میں مہادیو کی مورتی کو گنگا جل میں دھو کر اپنے طریقہ سے اس کی پوجا کرتے ہیں۔ راجہ بھوج کے پاس موجود پتھر کی مورتی کے لئے مہامد نے کہا کہ وہ تو میرا جوٹھا کھا سکتی ہے جسے تم پوجتے ہو۔ ایسا کہہ کر بھوج کو ویسا ہی دکھا دیا۔ یہ سن کر اور دیکھ کر راجہ بھوج کو بہت تعجب ہوا اور ان کا عقیدہ ملیچھ دھرم (اسلام) میں ہو گیا۔

رات میں کوئی دیودوت (فرشتہ) راجہ سے بولا کہ گو کہ آریہ دھرم اچھا ہے لیکن میں خدا کے حکم سے اسی دھرم کو پیشاچ دھرم (पैशाच धर्म) یعنی ایسا مذہب جس میں گوشت کھانے کی اجازت ہو) نام سے قائم کروں گا۔ ختنہ کیا ہوا۔ بغیر چوٹی کار، داڑھی رکھنے والا اور اونچی بات (اذان) کرنے والا، میرا خاص آدمی ہوگا۔ حلال جانوروں کا گوشت کھانے والا ہوگا۔ کشوں سے جیسے سنسکار ہوتا ہے ویسا اس کا مسل (وہ اوزار جس سے ختنہ کیا جاتا ہے) سے سنسکار ہوگا۔ اس کے بعد وہ (مسلمان) قوم دوسرے ملاوٹی مذہبوں پر تنقید کرے گی۔ ایسا پیشاچ دھرم ہوگا۔ یہ کہہ کر دیودوت چلا گیا اور راجہ بھوج گھر لوٹا'' (ہندی کتاب، دھارمک ایکتا کی جیوتی، مصنف وید پرکاش اپادھیائے) یوں تو ابھی کئی ''پران'' اور ''اپنشد'' باقی ہیں جن میں حضرت محمدؐ کا نام کہیں صاف صاف اور کہیں علامتوں کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے لیکن چونکہ مجھے کتاب نہیں لکھنی ہے اور اسے صرف مضمون تک محدود رکھنا ہے اس لئے اپنی بات اس یقین کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ حضرت محمدؐ کے ذکر سے کوئی بنیادی ہندو مذہبی کتاب خالی نہیں ہے۔

حضرت محمدؐ اور غیر مسلم دانشور

جب کوئی عام انسان رسول اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سوانح حیات پر نظر ڈالتا ہے تو وہ حیرت زدہ رہ جاتا ہے، کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو اس دنیا میں آنے سے پہلے یتیم ہو گئے تھے، چھ سال کے بعد والدہ بھی اس دنیا سے سدھار گئیں تھیں، جن کی پرورش پہلے دادا اور پھر چچا نے کی تھی، وہ مکہ کے رہنے والوں کے درمیان چالیس سال خاموشی کے ساتھ زندگی گزارتے رہے اور اپنی صداقت اور امانت داری کا لوہا منواتے رہے۔ یہاں تک کہ چالیس سال بعد جب اعلان رسالت کا وقت آیا تو اس وقت آپ مکہ کے ایک پہاڑ کوہ ابوقبیس کے ایک حصہ پر کھڑے ہوئے اور مکہ والوں سے پوچھا کہ اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے دشمن کی ایک بہت بڑی فوج ہے جو تم پر حملہ کرنے والی ہے تو تم کیا کہو گے؟ مکہ والوں نے جواب دیا کہ ہم نے ہمیشہ تمہیں صادق پایا ہے اس لیے ہم یقین کر لیں گے۔ اس پر آپ نے کہا کہ پھر میں کہہ رہا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں ہے تو تم میری اس بات کو مانو اور فلاح پاؤ۔ مجھے اللہ نے تم پر نبی بنا کر بھیجا ہے۔ بس پھر کیا تھا آپ کی تکلیفوں کا آغاز ہو گیا۔ کسی نے پتھر مارے، کسی نے سر پر اوجھڑی ڈال دی، کبھی کسی نے راستے میں کانٹے بچھا دیے، تو کسی نے کوڑا پھینکا۔ تیرہ سال آپ کو مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ چوں کہ آپ کو اپنے شفیق چچا جناب ابو طالب کی سرپرستی حاصل تھی اس لیے مکہ والوں کے حوصلے پست تھے مگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے تھے۔ آخر آپ کے خاندان کا سوشل بائکاٹ کیا گیا اور آپ کو اپنے خاندان سمیت مع جناب ابو طالب اور زوجہ جناب

خدیجہ شعب ابی طالب میں پناہ لینی پڑی۔ وہاں اس قدر سختیاں جھیلنی پڑیں کہ اسی سال جناب ابوطالب اور جناب خدیجہ کا انتقال ہو گیا۔ اب مکہ والوں کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں تھی اس لیے سب نے مل کر آپ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا اور مجبور ہو کر آپ کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔ اس طرح ۱۳؍سال آپ نے مکہ میں گزارے۔

مدینہ میں بھی مکہ والوں نے آپ کو چین نہ لینے دیا اور آپ کو کئی کئی جنگوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن اسے آپ کا اعجاز نہیں کہا جائے گا تو کیا کہا جائے کہ اتنی مخالفتوں کے باوجود نہ صرف یہ کہ اپنی ۲۳؍سالہ رسالتی زندگی کے دوران اسلامی حکومت قائم کی اور ایک ایسا اخلاقی انقلاب لائے کہ ماننے والوں نے برائیوں سے دوری اختیار کی اور آج اسلام دنیا کا دوسرا سب سے بڑا مذہب بن گیا۔ یہ ایک یتیم و یسیر انسان کا کمال تھا۔

یہ اسلام اور رسول اسلام کی مظلومی تھی کہ جس رسول نے فتح مکہ کے بعد ایک کافر کا بھی خون نہیں بہایا اور سب کو امان دی، اسی اسلام کے ماننے والوں نے ہر دور میں خاص کر آج کے دور میں اسلام کے نام پر القاعدہ، بوکوحرام اور داعش نامی غیر اسلامی دہشت گردوں نے بے گناہوں کا خون بہانا شروع کیا۔ جس خودکشی کو اسلام نے حرام قرار دیا تھا اسے ان نام نہاد مسلمانوں نے حلال بنا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے مذاہب کے لوگ اسلام سے نفرت کرنے لگے۔ جو اسلام سلامتی کا پیام لے کر آیا تھا اسے ان لوگوں کی حرکتوں سے دہشت گردی کا مذہب مان لیا گیا۔ دوسرے مذاہب کے لوگوں نے سوچا کہ جب اسلام ایسا ہے تو اس کا پھیلانے والا محمدؐ بھی ایسا ہی ہوگا۔ ان کا اور تو کچھ بس نہ چلا تو انھوں نے رسول اسلام کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ نفرت کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ انھوں نے رسول کے خراب کارٹون بنانے شروع کر دیے، کارٹونوں پر ساری دنیا کے مسلمانوں کو غصہ آیا اور آنا بھی چاہیے تھا، لیکن ذرا انصاف سے کام لیجیے، یہ ہم میں سے ہی نام نہاد مسلمانوں کی حرکتوں کا ردِّ عمل ہے۔

ہندوستان میں کسی نے ''رنگیلا رسول'' کتاب لکھ ڈالی ، ابھی حال ہی میں ایک ہندو بھائی سوامی لکشمی شنکر اچاریہ نے بغیر اسلام کا مطالعہ کیے ایک کتاب ہندی میں ''اسلام آتنک یا آدرش'' کے نام سے لکھ ڈالی۔

مگر یہ سکے کا ایک پہلو تھا۔ سکے کا دوسرا پہلو امید افزا ہے۔ جن لوگوں نے اسلام کا مطالعہ کیا اور رسول اسلام کے بارے میں جاننے کی کوشش کی تو ان کی غلط فہمی دور ہوئی اور وہ اسلام اور رسول اسلام کے حق میں لکھنے پر مجبور ہو گئے۔ جن سوامی لکشمی شنکر اچاریہ نے اسلام کے خلاف کتاب لکھی تھی ان کا تبصرہ پڑھیے:

''اسلام ایک آئیڈیل مذہب ہے، جس کی تعلیمات پوری انسانیت کے لیے ہیں۔ آتنک واد کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، یہ وہ مذہب ہے جو آتنک واد کی سب سے زیادہ مخالفت کرتا ہے۔ میں بھی لوگوں کے کہنے سننے میں آگیا تھا اور زندگی کی وہ غلطی کر بیٹھا جو میرے حقیقت سے قریب ہونے کی وجہ بنی۔ اس غلطی کا سدھار اور پبلک کے سامنے معافی مانگتے ہوئے ہی میں نے اس کا ازالہ کیا اور میں نے ایک دوسری کتاب ''اسلام ایک آئیڈیل مذہب'' لکھی ہے''۔

اس کے علاوہ پڑھیے کہ دوسرے غیر مسلموں کی نگاہ میں حضرت محمد ﷺ کس درجہ بلند تھے۔

والٹیئر (Woltaire):

حالاں کہ مارٹن لوتھر کنگ والٹیئر کا ہیرو تھا لیکن حضرت محمد ﷺ کے بارے میں کہتا ہے کہ:

''لوتھر تو محمد ﷺ کے جوتوں کے فیتے کھولنے کے لائق بھی نہیں تھا، محمد ﷺ ایک عظیم شخص تھے، انھوں نے اپنے حسن

سیرت اور پختگی کونمونہ بنا کر بہت لوگوں کوتربیت دی۔ایک عقل مند قانون ساز،ایک عادل حاکم اورایک تارک دنیا پیغمبر تھے۔ وہ ایک ایسا عظیم انقلاب لائے جسے اس دنیا نے پہلی بار دیکھا"۔

(Dei, Arabei et de Mahomat). France 1756)

جے ایچ ڈینی سن(J. H. Denison)

"تہذیب کا وہ عظیم الشان درخت جس کے پتے ساری دنیا میں پھیلے ہوئے تھے کمزور ہو گیا تھا اوراپنی بنیاد سے کھوکھلا ہو گیا تھا۔ کیا کوئی جذباتی ثقافت ایسی تھی جو انسانوں کو اتحاد کے لیے اور تہذیب بچانے کے لیے ایک بار پھر اکٹھا کر سکتی۔یہی وہ وقت تھا جب عربوں کے درمیان ایک انسان پیدا ہوا جس نے مشرق اور جنوب کی اس وقت کی کل جانی ہوئی دنیا کومتحد کیا"۔

(Book: Emotions as the basis of Civilisation)

ایس پی اسکاٹ(S P Scott)

"اگر مذہب کا مطلب اخلاقیات کی تعلیم دینا، برائی کوختم کرنا، انسانی خوشی میں اضافہ کرنااور انسانی عقل کواور فراست دینا ہے، اوراگر اچھے کاموں کی انجام دہی اس عظیم دن کام آنے والی ہے اور جب آخری فیصلے کے لیے انسان بلائے جائیں گےتو اسے مان لینا نہ تو نامناسب ہوگا اور نہ ہی گستاخی ہوگی کہ محمدؐ واقعی اللہ کے پیغمبر تھے"۔

(History of the moorish empire in Europe)

الفانسے ڈی لامارٹین(Alphonse De La Lamartine)فرانسیسی مورخ

’’فلسفی، مقرر، پیغمبر، قانون ساز، خیالات کو بدلنے والا، عقلی اصول کو لاگو کرنے والا، اللہ کی کوئی شبیہ کے بغیر عبادت کرانے والا، بیس دنیاوی اور ایک روحانی حکومت کو قائم کرنے والا، کوئی اور نہیں محمدؐ ہے۔ جس کسی بھی معیار سے انسانی عظمت کو ناپا جاسکتا ہے، ہم پوچھ سکتے ہیں کہ کیا محمد سے عظیم کوئی ہستی ہے؟۔

(History De La Turquie 1854 Paris vol.2 page 276-277)

ڈبلیو مونٹگومیری واٹ (W Montgomery Watt)

’’جتنا زیادہ کوئی محمدؐ اور ابتدائی اسلام کی تاریخ پر نظر ڈالتا ہے، اتنی ہی زیادہ ان کی کامیابی کی وسعت پر حیرت ہوتی ہے۔ حالات نے ایک موقع فراہم کیا جیسے کہ اور لوگوں کو ملا تھا لیکن یہ شخص اس موقع کے لیے پوری طرح مناسب تھا۔ اگر انھیں پیغمبری، مدبری اور نظم و نسخ چلانے کی خدا کی طرف سے دین نہ ہوتی، جس کے پیچھے ان کا خدا میں اعتماد اور یہ مکمل یقین کہ خدا نے انھیں بھیجا ہے، آدمیت کی تعریف میں ایک قابل توجہ باب شامل ہونے سے رہ جاتا۔ مجھے امید ہے کہ ان کی زندگی کا یہ مطالعہ آدمؑ کے عظیم بیٹوں میں سے ایک کی تعریف و توصیف میں مدد دے گا‘‘۔

(Mohammad at Madina 1977)

جولس میسرمین (Jules Masserman) یہودی، شکاگو یونیورسٹی میں پروفیسر:

’’رہنماؤں میں تین صلاحیتیں ہونی چاہیے۔ پہلی یہ کہ وہ اپنے ماننے والوں کی فلاح کا دھیان رکھے۔ دوسرے یہ کہ ایسا سماجی

نظام بنائے جس میں لوگ اپنے کو محفوظ سمجھ سکیں۔ تیسرے یہ کہ وہ اپنے ماننے والوں کو عقائد کا مجموعہ دے۔ میں نے تاریخ میں لوئی پاسچر، سالک، گاندھی، کنفیوشش، سکندر اعظم، قیصر، ہٹلر، بدھ، عیسیٰؑ اور ایسے ہی کئی لوگوں کی زندگی کا مطالعہ کیا ہے۔ میں اس حتمی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شروع سے لے کر آج تک شاید سب سے بڑے رہنما محمد ﷺ تھے جو تینوں صلاحیتوں کو بروئے کار لائے۔ موسیٰؑ نے ان سے کم درجے پر یہ کام کیا"۔

(Who were history's great leaders? Times magazine 1974)

میجر اے لیونارڈ(Major A. Leonard):

"یہ سب سے بالا حکمت ہے جو جنت نے زمین پر ظاہر کی ہے۔ اگر کسی آدمی نے اس زمین پر خدا کو پالیا ہے اور اگر کسی آدمی نے اپنی پوری زندگی خدا کے لیے خالص اور پاکیزہ ولولے سے صرف کر دی ہے تب بلا کسی شبہ کے اور پورے یقین کے ساتھ وہ ہستی عرب کے مقدس پیغمبر کی تھی"۔

(Islam, its moral & spiritual values, 1909 London)

انسائکلو پیڈیا برٹینیکا(Encyclopaedia Britannica):

"محمد ﷺ دنیا کی تمام مذہبی شخصیات میں سب سے زیادہ کامیاب تھے"۔

11th Edition))

تھامس کارلائل(Thomas Carlyle):

"اسلام کہتا ہے کہ ہمیں اللہ کی اطاعت اختیار کرنا چاہیے۔ ہمیں اپنی پوری طاقت اس کی اطاعت میں لگا دینی چاہیے۔ جو وہ ہمارے ساتھ کرتا ہے، جو کچھ ہمیں بھیجتا ہے حتی کہ موت یا اس

سے بھی زیادہ خراب حالت وہ اچھی ہوگی اور بہترین ہوگی۔ ہم
نے اپنے کو اللہ کے سپرد کردیا ہے۔ گوئٹے (Goethe) پوچھتا
ہے کہ اگر یہی اسلام ہے تو کیا ہم سب اسلام میں زندگی بسر نہیں
کررہے ہیں؟ میں کارلائل کہتا ہوں کہ ہاں، ہم سب جو ایک
اخلاقی زندگی رکھتے ہیں، ہم سب اسلام میں رہ رہے ہیں''۔

(Heroes and Hero worship)

جارج برنارڈ شا (George Bernard Shaw):

''میں نے محمد ﷺ کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ ایک عجوبہ تھے۔
میری رائے میں ان کو مسیح مخالف (Anti Christ) کہنے کے
بجائے انھیں انسانیت کا مسیحا پکارنا چاہیے''۔

(The Genuine Islam, Singapore, 1936)

یہ سچ ہے کہ ان غیر مسلم اسکالرز کے بیانات سے رسول اکرم ﷺ کی
شخصیت کو نہیں ناپا جاسکتا لیکن ایسے ماحول میں جب کہ نام نہاد مسلمانوں کی دہشت
گردی سے دنیا میں حضرت محمد ﷺ کے خلاف نفرت کی فضا پیدا کی جارہی ہے، اس
نفرت کی تاریکی میں یہ بیانات روشنی کی ایک کرن ضرور ہیں۔

کاش دہشت گرد یہ سمجھ لیتے کہ خود ان کی غیر اسلامی حرکتوں سے اسلام اور
رسول اسلام سے نفرت پنپ رہی ہے۔ وہ اور کچھ نہ کریں صرف حضرت محمد ﷺ کی
سیرت کو اپنے لیے نمونۂ عمل بنالیں تو وہ دنیا میں بھی کامیاب ہوجائیں اور ان کی
آخرت بھی سنور جائے۔ جہاں تک ہم مسلمانوں کا تعلق ہے، ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم
پوری قوت سے دنیا کو بتائیں کہ دہشت گردوں کا اسلام، اسلام نہیں ہے بلکہ اصلی
اسلام تو سلامتی کا پیغام لیکر آیا ہے اور حضرت محمد ﷺ تو انسانیت کے نجات دہندہ
بن کر آئے تھے۔ کاش ایسا ہوجاتا۔ آمین۔

اور چاند دو ٹکڑے ہو گیا

اگر آپ قرآن مجید کے سورۂ ''القمر'' کا مطالعہ کریں تو اس کی پہلی سے لے کر تیسری آیتوں میں چاند کے دو ٹکڑے ہونے (شق القمر) کا ذکر ہوا ہے۔ ترجمہ یوں ہے۔

''قیامت قریب آ گئی اور چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے اور یہ کوئی بھی نشانی دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ایک جادو ہے۔ ان لوگوں نے جھٹلایا اور اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کی اور ہر کام کا وقت طے ہے''

اس آیت شق القمر یعنی چاند کے دو ٹکڑے ہونے کے پیچھے ایک تاریخ ہے۔ وہ یہ کہ ہجرت سے پانچ سال پہلے قریش کے کچھ لوگوں نے اللہ کے رسول کو چیلنج کیا کہ اے محمد! آپ اگر سچ مچ نبی ہیں اور پیغمبر ہیں تو اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی معجزہ دکھائیں۔ آپ نے ان سے پوچھا تم کیا چاہتے ہو تو ان لوگوں نے معاملہ کو الجھانے کے لئے کہا کہ آپ چاند کے دو ٹکڑے کر دیں۔ آپ نے اللہ سے دعا کی اور چاند کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ چاند دو ٹکڑے ہو گیا اور بہت دیر تک دونوں ٹکڑے ایک دوسرے سے کافی دوری پر رہے اور پھر جا کر مل گئے۔ قریش کے لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ محمد نے ہمارے اوپر جادو کر دیا ہے۔ لیکن ان میں سے کچھ سمجھ دار لوگوں نے کہا کہ جادو صرف سامنے والوں پر ہوتا ہے اس لئے یہاں سے جو لوگ باہر گئے ہوئے ہیں ان سے پوچھا جائے۔ انھوں نے ان مسافروں کا انتظار کیا جو مکہ سے باہر تھے، جب مکہ کی سرحد پر وہ مسافر آتے دکھائی دئے تو مکہ والوں نے ان سے چاند کے ساتھ ہوئی کسی خاص بات کے بارے میں پوچھا۔ آنے والوں نے بھی کہا کہ انھوں

نے بھی اپنی آنکھوں سے چاند کے دو ٹکڑے ہوتے اور بعد میں ملتے دیکھا ہے۔

اس معجزے کی تصدیق صرف مکہ کے مسافروں نے ہی نہیں کی تھی بلکہ ہندوستان کے الگ الگ علاقوں میں بھی اس کی تصدیق ہوئی۔

سب سے پہلے جنوبی ہند چلیں۔ اس کے ایک مشہور صوبے کیرالہ میں اس زمانے میں چیرا برہمنوں کی حکومت تھی اور ان کا اس وقت کا راجہ چیرامن پیرومل تھا۔ اس نے ایک رات دیکھا کہ چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے ہیں۔ اسے الجھن ہونے لگی لیکن اس کے درباری اسے مطمئن نہ کر سکے۔ کچھ وقت کے بعد رسول ﷺ کے کچھ صحابی لنکا جاتے وقت چیرا حکومت کی راج دھانی کوڈنگلور (Kodungallur) پہنچے۔ جب چیرا پیرومل نے چاند کے دو ٹکڑے ہونے والا واقعہ بیان کیا تو انھوں نے رسول ﷺ کے ذریعہ شق القمر معجزے کی تصدیق کی۔ وہ مطمئن ہو گیا اور مسلمان ہونے کا اور مکہ جانے کا خفیہ فیصلہ کیا۔ اس نے اپنی سلطنت کا بٹوارہ کیا اور الگ الگ علاقوں میں بانٹ دیا۔ پھر وہ مکہ گیا۔ رسول ﷺ سے ملاقات کی اور اسلام قبول کر لیا۔ اس کا نام تاج الدین رکھا گیا۔ وہ عرب میں بہت سالوں تک رہا لیکن وطن لوٹتے وقت بیمار پڑ گیا اور سلطنت آف عمان کے شہر سلالہ کے پاس زوفار (جسے اب اُبار کہتے ہیں) میں اس کا انتقال ہو گیا۔ مرتے وقت اس کی وصیت کے مطابق مالک بن دینار اور مالک بن حسیب نے ۶۲۹ء میں اپنے عرب ساتھیوں کے ساتھ کوڈنگلور میں ایک مسجد بنائی جو ہندوستان کی زمین پر پہلی مسجد تھی جو چیرامن کے نام پر چیرامن جمعہ مسجد کہلائی۔ دیکھیں en.wikipedia.org/wiki/cheraman-jumamasjid۔

دوسری تصدیق مدھیہ پردیش کے شہر دھار کے راجہ بھوج نے کی تھی۔ اسی راجہ نے بھوج پال یا بھوپال شہر آباد کیا تھا۔ تاریخ فرشتہ کے مطابق یہ راجہ شق القمر یعنی چاند کے دو ٹکڑے ہونے کا معجزہ دیکھ کر مسلمان ہو گیا۔ اس کی پراکرت میں لکھی ہوئی تختی دھار کی مسجد کے دروازے کے پاس بائیں طرف دو لکڑیوں کی الماری میں

موجود ہے۔ بھوج کی قبر وہیں پر ہے۔

تیسری تصدیق راجہ رتن سین نے کی تھی۔ بعد میں انھوں نے حج بھی کیا تھا اور حاجی رتن سین کے نام سے مشہور ہوئے۔ سیریا کی راج دھانی دمشق میں حاجی رتن سین کے نام پر ایک جگہ کا نام بھی ہے۔ ان کی قبر مرادآباد کی تحصیل حسن پور کے ایک گاؤں کھابڑی کے شاہی قبرستان میں ہے۔

چوتھی تصدیق خود کھابڑی کے راجہ چوہان کنور سین نے کی تھی۔ اس نے خود اپنے محل سے چاند کے دو ٹکڑے ہوتے دیکھا تھا۔ اس کی قبر بھی شاہی قبرستان میں ہے۔ ان دونوں کی قبروں پر جانے کے لئے مرادآباد سے بس کے ذریعہ جا کر گھنورا منڈی سے شیر پور جانے والی بس سے ٹولی گاؤں کے موڑ پر زیارت گاہ شق القمر کے نام سے مشہور جگہ پر اترنا پڑتا ہے۔

یہ تو تھی پرانے زمانے کی تصدیق آیئے۔ ذرا آج کے دور میں دیکھیں مصر کے مشہور ماہر ارضیات (Geologist) ڈاکٹر زغلول النظر کا کہنا ہے کہ وہ مغربی برطانیہ کی کارڈف (Cardiff) یونیورسٹی میں لکچر دے رہے تھے۔ ان کے سننے والوں میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل تھے۔ انھوں نے اپنے لکچر کے دوران چاند کے دو ٹکڑے ہونے والا واقعہ یہ کہہ کر بتایا کہ یہ ایک معجزہ تھا اور اس کی سائنسی تشریح عمومی انداز میں نہیں کی جاسکتی ہے۔

یہ بات یہیں تک پہنچی تھی کہ ایک نوجوان کھڑا ہوا جس کا نام پیٹ کاک (Peetcock) تھا اس نے اپنے اوپر گزرا ایک واقعہ بتایا کہ ایک دن وہ ٹی وی پر ایک ٹاک شو دیکھ رہا تھا۔ اس ٹاک شو میں برطانیہ کے ایک انٹرویو لینے والے اور امریکہ کے خلائی سائنس کے تین ماہرین سائنس داں حصہ لے رہے تھے۔ شو کا میزبان سائنسدانوں پر خلائی سفر پر بے انتہا خرچ کرنے کا الزام لگا رہا تھا جب کہ دنیا میں بھوک، غریبی، بیماری اور پچھڑا پن عروج پر ہے۔ اس کا الزام تھا کہ چاند کی زمین پر قدم رکھنے کے لئے سو ارب ڈالر خرچ کیا جاتا ہے، صرف چاند کی سطح پر امریکی

جھنڈا لہرانے کے لئے۔

ان امریکیوں نے جواب دیا کہ نہیں، مقصد جھنڈا لہرانا نہیں تھا بلکہ اندرونی بناوٹ (Composition) کی ریسرچ کرنا تھا۔اور جو حقیقت ہم لوگوں نے دیکھی، پتہ نہیں لوگ یقین کریں گے یا نہیں۔ میزبان نے ان سے پوچھا کہ وہ حقیقت کیا ہے۔

امریکیوں نے کہا کہ ایک دن یہ چاند دو ٹکڑے ہوا تھا اور پھر دوبارہ مل گیا تھا ۔شو کے میزبان نے پوچھا انھوں نے یہ بات کیسے جانی؟ سائنسدانوں نے بتایا کہ انھوں نے جہاں تک نظر جا سکتی تھی، چٹانوں میں درار نما ایک پٹی پائی تھی جس نے چاند کو اوپری سطح سے لے کر نچلی آخری سطح تک اور پھر اوپری سطح تک کاٹ دیا ہے اور وہ پٹی الگ سی لگتی ہے۔انھوں نے جب اپنے ملک کے دوسرے سائنس دانوں اور جیولا جسٹ سے مشورہ کیا تو انھوں نے بتایا کہ چاند کی سطح کٹنے اور چٹانوں کی ماہیت بدلنے کا یہ انوکھا واقعہ یہ بتلاتا ہے کہ کبھی ایک دن یہ چاند دو ٹکڑے ہوا تھا اور دوبارہ جڑ گیا تھا۔

ٹی وی پر ہوئی یہ پوری بات چیت بتاتے ہوئے ''پیٹ کاک'' نے کہا کہ میں یہ کہتا ہوا کرسی سے کود پڑا کہ اللہ نے امریکیوں کے دل میں اسی لئے یہ بات ڈال دی تھی کہ وہ چودہ سو سال پہلے حضرت محمدؐ کے دکھائے ہوئے شق القمر کے معجزے کو سو ارب ڈالر سے زیادہ کی رقم خرچ کر کے صحیح ثابت کریں۔ میں نے سوچا کہ اس مذہب کو سچا ہونا چاہئے۔ایک بار میرے ایک مسلم دوست نے مجھے انگریزی ترجمہ والا قرآن تحفہ میں دیا تھا۔ میں نے گھر جا کر قرآن کھولا اور سورۂ قمر کی تلاوت کی اور پھر اس واقعہ نے میرے اسلام قبول کرنے کا دروازہ کھول دیا اور آج میں صرف پیٹ کاک نہیں بلکہ داؤد موسیٰ پیٹ کاک ہوں (یہ تصدیق انگریزی پندرہ روزہ ملی گزٹ۔Milli gazette کے ایک سے ۱۵ دسمبر ۲۰۰۳ء سے لی گئی ہے)

اس طرح آج کے سائنسی دور میں بھی چاند کے دو ٹکڑے ہونے کی تصدیق ہو چکی ہے

قرآن مجید اور عدد ۱۹

قرآن کا مطالعہ کرنے والے (قرآن عربی زبان میں ہے۔میری مراد عربی میں تلاوت کرنے والے سے نہیں بلکہ اپنی زبان میں قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرنے والے سے ہے)اس بات کی تائید کریں گے کہ اللہ نے اپنے اولوالعزم یا اہم پیغمبروں کو ان کے وقت کی مناسبت سے معجزے بھی عطا کئے تھے۔مثال کے طور پر حضرت نوحؑ کے ساتھ یہ معجزہ نہیں تو اور کیا تھا کہ ایک اکیلے انسان نے کتنے سالوں میں درخت کاٹے اور اکیلے ہی اتنی بڑی کشتی بناڈالی۔وہ بھی کوئی چھوٹی موٹی کشتی نہیں تھی بلکہ جہاز سے بھی بڑی کوئی شئے تھی جس میں طوفان کے وقت تمام جانداروں کے جوڑوں کو جگہ دی گئی۔پھر حضرت ابراہیمؑ کو دیکھئے کہ اتنے بڑے آگ کے میدان میں ڈال دئے گئے اور اللہ کے حکم سے آگ گلزار ہوگئی تھی۔حضرت یوسفؑ کو تعبیر خواب کا معجزہ دیا گیا۔حضرت موسیٰؑ کا عصا اژدہا بن جاتا تھا۔حضرت داوٗدؑ کے ہاتھ میں لوہا موم ہوجاتا تھا۔حضرت عیسیٰؑ مردوں کو زندہ کرتے تھے وغیرہ وغیرہ۔جب آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا زمانہ آیا تو چونکہ اس زمانے میں عرب میں فصاحت کا بول بالا تھا اس لئے قرآن کی شکل میں ایسا معجزہ دیا گیا جس کے چیلنج کو کوئی قبول نہ کرسکا کہ اس کے مقابل کوئی ایک سورہ یا اس سے کم لاسکتا۔

قرآن صرف اس لئے معجزہ نہیں ہے کہ اس کی آیتیں انسان کی ہدایت کے لئے ہیں بلکہ عجائبات کی ایک دنیا نظر آتی ہے۔قرآن حکیم کا ایک ایک حرف اتنے زبر دست تخمینہ (Calculation) سے اور اتنے حساب وکتاب کے ساتھ اپنی جگہ پر

مناسب ہے کہ انسان حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔ اتنی بڑی کتاب میں اتنے باریک تخمینہ کا کوئی حساب داں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ قرآن کا ہر لفظ جتنی مرتبہ استعمال ہوا ہے، اس کی تعداد اور اس کا پورا پس منظر اپنی جگہ خود علم و عرفان کا ایک وسیع جہاں ہے۔ مثلاً ''دنیا'' کا لفظ اگر قرآن میں 115 مرتبہ استعمال ہوا ہے تو اس کے مقابل ''آخرت'' کا لفظ بھی 115 مرتبہ آیا ہے۔ اسی طرح اگر لفظ ''شیاطین'' 88 مرتبہ تو ''ملائکہ'' بھی 88 بار، اگر ''موت'' 145 بار تو ''حیات'' بھی 145 بار، اگر ''نفع'' 50 بار تو ''فساد'' بھی 50 بار اور اگر ''کفر'' 25 مرتبہ تو اس کا متضاد ''ایمان'' بھی 25 بار قرآن میں آیا ہے۔ اس سے زیادہ دلچسپ تو ایک اور لفظ ہے۔ چونکہ سال میں مہینے 12 ہوتے ہیں اور مہینے کو عربی میں ''شہر'' کہتے ہیں تو مہینوں کی گنتی کی مناسبت سے ''شہر'' 12 بار قرآن میں آیا ہے۔ ''یوم'' کا لفظ بھی سال کے دنوں کے مطابق 360 مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ اتنی اہم کتاب میں اس عددی مناسبت کا خیال رکھنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔

بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ سورہ مدثر میں ایک ایسا جملہ قرآن میں آیا ہے جو سب کو حیران کر دیتا ہے۔ سورہ مدثر میں اللہ کا اعلان ہے کہ ''دوزخ'' پر ہم نے 19 محافظ فرشتوں کو مقرر کر رکھا ہے''۔ اب انسان حیران کہ اس 19 میں کیا بات ہے؟

اس عدد 19 میں کیا حکمت ہے، یہ تو اللہ ہی جانے لیکن اتنا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ 19 کے عدد کا تعلق اللہ کے کسی حفاظتی انتظام سے ہے۔ اس کے علاوہ قرآن مجید کے ہر سورہ کے پہلے ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' کی آیت کو رکھا ہے (سورہ توبہ کو چھوڑ کر)۔ گویا کہ اس کا تعلق بھی قرآن کی حفاظت سے ہے۔

قرآن کے اس 19 والے انوکھے اعلان نے ایک مصری ڈاکٹر راشد خلیفہ کو اس کے بارے میں ریسرچ پر مجبور کر دیا۔ ڈاکٹر راشد خلیفہ امریکہ کی ایک یونیورسٹی میں کیمسٹری (علم کیمیا) کے پروفیسر تھے۔ 1968ء میں انھوں نے مکمل قرآن مجید کمپیوٹر پر اپ لوڈ کرنے کے بعد قرآن کی آیات، ان کے الفاظ و حروف میں کوئی تعلق

تلاش کرنا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ اور لوگ بھی اس ریسرچ میں شامل ہوتے گئے، حتیٰ کہ 1972ء میں یہ ایک باقاعدہ اسکول بن گیا۔ ان لوگوں نے جوں ہی ریسرچ کے کام کو آگے بڑھایا، ان پر قدم قدم پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ قرآن حکیم کے الفاظ و حروف میں انھیں ایک ایسی حسابی ترتیب نظر آئی جس کے مکمل ادراک کے لئے اس وقت تک کے بنے ہوئے کمپیوٹر ناکافی تھے۔ انھوں نے سورہ مدثر کے 19 والے عدد کو جب جانچا تو بسم اللہ کے حروف بھی سامنے آئے جو 19 ہی ہیں۔ پھر یہ دیکھ کر وہ حیران ہو گئے کہ بسم اللہ میں ترتیب کے ساتھ 4/ الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور اس میں لفظ ''اسم'' پورے قرآن میں 19 مرتبہ استعمال ہوا ہے، لفظ رحمن 57 مرتبہ آیا ہے جو 19×3 کا حاصل ہے اور لفظ ''رحیم'' 114 مرتبہ جو 19x6 کا حاصل ہے اور لفظ ''اللہ'' قرآن میں 2699 مرتبہ استعمال ہوا ہے جو 19×142 سے 2698 آتا ہے لیکن یہاں 1 عدد باقی رہتا ہے جس کا صاف مطلب ہے کہ اللہ کی ذات کسی حساب کے طابع نہیں ہے اور وہ یکتا ہے۔ قرآن مجید کی سورتوں کی تعداد بھی 114 ہے جو 19×6 کا حاصل ہے۔ سورہ توبہ کے آغاز میں بسم اللہ نازل نہیں ہوئی لیکن سورہ نمل میں آیت نمبر 30 میں مکمل بسم اللہ نازل کر کے 19 کے فارمولے کی تصدیق کر دی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو حسابی قاعدہ فیل ہو جاتا۔

اب آیئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اترنے والی پہلی وحی کی طرف۔ یہ سورہ علق کی پہلی 5 آیات ہیں اور یہیں سے 19 کے اس حسابی فارمولے کا آغاز ہوتا ہے۔ ان 5 آیات کے کل الفاظ 19 ہیں اور ان 19 الفاظ کے کل حروف 76 ہیں جو 19×4 کا حاصل ہیں۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ جب سورہ علق کے کل حروف کی گنتی کی گئی تو حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کے کل حروف 304 ہیں جو 19×4×4 کا حاصل ہیں۔ اگر مزید جائزہ لیں تو قرآن میں سورہ علق سے پہلے 95 سورہ ہیں یعنی 19×5 اور اگر آخری سورہ والناس کی طرف سے گنتی کریں تو آخر

کی طرف سے سورہ علق کا نمبر 19 بنتا ہے۔ یہ بات ثابت کرتی ہے کہ سورتوں کے آگے پیچھے کی ترتیب بھی انسانی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حسابی نظام کا ہی ایک حصہ ہے ۔قرآن حکیم کا سب سے آخر میں نازل ہونے والا سورہ سورہ نصر ہے۔ یہ جان کر آپ پر پھر ایک مرتبہ خوش گوار حیرت طاری ہوگی کہ اللہ نے یہاں بھی 19 کا نظام برقرار رکھا ہے۔ پہلی وحی کی طرح آخری وحی سورۂ نصر ٹھیک 19 الفاظ پر مشتمل ہے۔ یوں کلام الٰہی کا پہلا اور آخری سورہ ایک ہی حسابی قاعدے سے نازل ہوا۔ سورہ فاتحہ کے بعد قرآن حکیم کا سورہ بقرہ ہے۔ اس سورہ کی کل آیات 286 ہیں ۔ڈاکٹر خلیفہ کے مطابق 2 ہٹا دیں تو مکّی سورتوں کی تعداد سامنے آتی ہے لیکن اگر 6 ہٹا دیں تو مدنی سورتوں کی تعداد نکلتی ہے۔

آج جب کہ عقل وخرد کو سائنسی ترقی پر بڑا ناز ہے، ایسے میں پھر قرآن اپنا چیلنج دہراتا ہے ۔حساب داں ،سائنسداں اور ہر خاص وعام (مومن و کافر) سبھی سوچنے پر مجبور ہیں کہ آج بھی کسی کتاب میں ایک انوکھے عدد 19 کا نظام برقرار رکھا ہے۔ ایسا حسابی نظام کسی کتاب میں ڈالنا انسانی بساط سے باہر کی چیز ہے۔ طاقت ور کمپیوٹر کی مدد سے بھی اس جیسے حسابی نظام کے مطابق ہر طرح کی غلطیوں سے پاک کسی کتاب کی تشکیل ناممکن ہوگی تو ذرا سوچئے کہ 14 سو سال پہلے کوئی اس طرح کے حساب کا تصور بھی کر سکتا تھا؟ لہٰذا اگر دل میں رتّی بھر انصاف ہے تو کوئی بھی اس بات کا انکار نہیں کر سکتا کہ قرآن حکیم کا حسابی نظام اللہ کی قدرت کا ایسا کھلا ہوا کرشمہ ہے جس کا جواب قیامت تک کوئی پیش نہ کر سکے گا۔

میرے اپنے خیال میں یہ ڈاکٹر راشد خلیفہ کی ایک مستحسن کوشش ہے جو اس بات کو ثابت کرنے میں ایک اضافہ ہے کہ قرآن کسی انسان کا کلام نہیں بلکہ الٰہی کلام ہے جو قیامت تک لوگوں کو اپنی طرف راغب کرتا رہے گا۔ آمین۔

سائنس

قرآنی آیاتِ اسرارِ کائنات کی تفسیر کا نام

قرآن مجید کا دعویٰ ہے کہ اس میں ہر خشک وتر موجود ہے اور ہمارا اس پر ایمان بھی ہے۔ یہاں تک کہ ہم حضرت ابن عباس کے اس دعویٰ کو پڑھ کر خوش ہو جاتے ہیں کہ ''اگر میرے اونٹ کی رسی بھی گم ہو جائے تو میں اس کو کتاب اللہ میں ڈھونڈھ نکالوں گا'' حالانکہ ہم اس قرآنی دعوے کی گہرائی میں جانے کی کوشش نہیں کرتے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ قرآن مجید کے ایک جملہ کو آیت کہتے ہیں اور اس طرح قرآن میں ۶۲۳۶ آیات ہیں۔ یہ تمام آیات کسی نہ کسی موضوع پر ہیں کچھ محکم (صاف صاف) اور کچھ متشابہ ہیں وغیرہ وغیرہ لیکن خود قرآن نے جہاں جہاں آیات لفظ کا استعمال کیا ہے اس کے مطلب ''نشانیاں'' لیا ہے۔ ایسی نشانیاں جو انسانوں کو غور وفکر کے لیے آمادہ کر رہی ہیں۔

اب اگر پورے قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس میں مندرجہ ذیل موضوعات شامل ہیں۔

۱۔ اس میں تمام آسمانی کتابوں مثلاً تورات، زبور اور انجیل وغیرہ کی تعلیمات کا نہ صرف خلاصہ اور جوہر آ گیا ہے بلکہ تاریخی اعتبار سے ان کی تکمیل ہے اور تحریف کے بعد ان میں آئی ہوئی غلطیوں کی اصلاح بھی ہے۔ اس لحاظ سے یہ قرآن کا علمِ تاریخ

ہے۔اس کے ذریعہ آئندہ آنے والی نسلوں کو عبرت حاصل کرنے کی نصیحت ہے۔

۲۔ یہ مسلمانوں کی زندگی کا جامع دستور العمل ہے۔اس میں تمام عقائد، مراسم عبادات ومعاملات زندگی کے تمام احکام وقوانین اصولاً مذکور ہیں اور زندگی کے ہر موڑ پر واضح ہدایات موجود ہیں۔ یہ قرآن کا علم احکام ہے۔

۳۔ یہ ہر زمانے کی جملہ ضروریات اور اس کے تقاضوں کے موضوع کو اپنے میں سمیٹے ہے اور کافی وشافی ہے۔اس کی دفعات کی حیثیت کلیات کی سی ہوتی ہے جنھیں بنیاد بنا کر بے شمار فقہی وقانونی مسائل میں استنباط کیا جاتا ہے۔

۴۔ آخرت کا موضوع یعنی موت اور اس کے بعد۔موت سے قیامت تک کے احوال وکوائف ،حشر ونشر ،اعمال انسانی کا محاسبہ،فرماں برداروں پر انعامات و احسانات اور نافرمانوں کے دردناک انجام کی تفصیل بیان کر کے انسان کو اپنا کردار اور چال چلن (کیرکٹر)درست کرنے اور اچھے اخلاق پیدا کرنے پر آمادہ کرنا۔

آخری مگر اہم موضوع

۵۔ علمِ اسرار کائنات ہے۔اللہ نے نظام کائنات اور مظاہر کائنات کا بیان کر کے اپنے احسانات ونوازشات کو بار بار یاد دلایا ہے اور انسان کو ان پر غور وفکر کی دعوت دی ہے۔اللہ نے اس علم پر کتنا زور دیا ہے کہ قرآن کی ۶۲۳۶ آیات میں سے پانچ سو آیات علم احکام سے متعلق ہیں جب کہ سات سو پچاس (۷۵۰)اسرار کائنات یا علوم کائنات سے تعلق رکھتی ہیں۔

اسی علمِ اسرار کائنات کو علوم سائنس کہا جاتا ہے۔سائنس مظاہر کائنات کی تحقیق وتفتیش اوران کے تفصیلی مطالعہ کو کہتے ہیں ۔ان علوم سائنس میں علم جمادات،علم معدنیات،علم نباتات،علم جغرافیہ،علم حیوانیات، فزکس، کیمسٹری، بایولاجی، اور علم خلاء وغیرہ شامل ہیں ۔قرآن مجید نے ان تمام علوم کو اپنے دائرہ میں سمیٹ رکھا ہے۔

سائنس کے بارے میں سب سے بڑی غلط فہمی یہ ماننا ہے کہ یہ مذہب سے ٹکراتا ہے اور خدا کے وجود سے انکار کرتا ہے، حالانکہ انسان اگر اسی بات کو سمجھ لے تو اس کی ساری غلط فہمی دور ہو جائے۔ وہ یہ کہ اس کائنات میں بس دو ہی چیزیں ہیں یعنی خالق کائنات اور مظاہر کائنات۔ خالق کائنات سائنس کے دائرہ میں نہیں آتا لہٰذا وہ خالق کائنات کے بارے میں تحقیق کیوں کرے۔ وہ تو مظاہر کائنات کی تحقیق کرتا ہے اللہ بھی تو یہ چاہتا ہے کہ انسان مظاہر کائنات کی تحقیق کرے اور اس کے بعد جب وہ قرآن مجید کا مطالعہ کرے تو وہ خود بہ خود خالق کائنات کی معرفت حاصل کرے گا۔ ایک ماہر سائنس کے الفاظ میں ''سائنس'' نام ہے نظام فطرت کے علم کا جو مشاہدہ، تجربہ اور عقل سے حاصل ہوتا ہے اور دیگر ماہرین اس کی تعریف اس طرح کرتے ہیں ''سائنس ان قوانین کے علم کا نام ہے جو فطرت کی قوتوں پر نافذ ہیں''۔

الغرض سائنس کی جو بھی تعریف کی جائے وہ سورۂ اعلیٰ کی حسب ذیل آیات میں بیان کردہ ربوبیت کے چار بنیادی نظاموں، نظام تخلیق، نظام تسویہ (درست کرنا) نظام تقدیر اور نظام ہدایت کے مطالعہ اور چھان بین کا نام ہے۔

''تسبیح کر اپنے رب برتر کے نام کی جس نے تمام مخلوقات کو پیدا کیا پھر (پھر ان کا تمام جسمانی نظام درست کیا اور وہ جس نے (ان میں سے ہر ایک کا) ضابطہ یا اندازہ مقرر کیا اور پھر اس کی (ضابطہ پر چلنے کی ہدایت کی'' (سورۂ اعلیٰ ۱ تا ۳)

ان آیات کریمہ کا اطلاق کائنات کی ہر چیز پر ہو سکتا ہے خواہ وہ جمادات سے متعلق ہو یا نباتات سے، حیوانات سے متعلق ہو (مع انسان کے) یا افلاک سے، تمام مظاہر ربوبیت میں یہ چار قوانین کام کر رہے ہیں انھیں بنیادی قوانین اور اصول و ضوابط کو سمجھنے کا نام سائنس ہے۔ آیئے ان چاروں نظام پر روشنی ڈالیں۔

۱۔ کائنات کی کوئی چیز کس طرح بنتی ہے اور کس طرح وجود میں آتی ہے یہی نظام تخلیق ہے۔

۲۔ مظاہر کائنات کی شکل وصورت اور ان کی ساخت کیسی ہے؟ اس کی طبعی اور کیمیائی مطالعہ کے بعد نظام تسویہ درست کرنے اور ٹھیک ٹھاک کرنے کے نظام کا پتہ چلتا ہے۔

۳۔ نظام تقدیر کا پتہ تمام مادی اشیاء میں توانائی (انرجی) کا اجزا جس میں خصوصیت کے ساتھ جاندار مظاہر یعنی نباتات وحیوانات (انسان سمیت) کے مخصوص احساس، طبیعت، ادراک، عقل وشعور اور ان کے حیرت انگیز اصول وضوابط کے مطالعہ سے چلتا ہے۔ نباتات اور حیوانات میں تمام مندرجہ بالا چیزیں مختلف مگر منظم ہیں یہ نظام تقدیر ہے۔

۴۔ نظام ہدایت ۔ یہاں خالق کائنات نے دولگ الگ نظام بنا رکھے ہیں انسان کو چھوڑ کر باقی تمام مظاہر کائنات خصوصاً جان داروں کے لیے مخصوص ضوابط بنا رکھے ہیں، ان میں کوئی ردو بدل نہیں جو بغیر خدائی ہدایت بذریعہ الہام کے ممکن نہیں۔ چیونٹی، شہد کی مکھی، مکڑی، کبوتر، بلی، کتا، شیر سمیت جتنے چرندو پرند ہیں، ان کی فطرتیں ہمیشہ یکساں رہتی ہیں۔ ان کے افعال وحرکات میں کوئی تبدیلی آج تک نہیں آئی۔ چونکہ انسان کو عقل دے کر کچھ حد تک خود مختار بنایا تو اس کے لیے الگ نظام ہدایت بنایا۔ ہدایت کے لیے رسولوں کو بھیجنا اسی نظام میں شامل ہے۔

آپ تمام سائنسی علوم طبیعات (فیزکس) کیمیا (کیمسٹری) حیاتیات (بایولاجی) ارضیات (جیولاجی) اور فلکیات (ایسٹرونامی یا اسپیس سائنس) وغیرہ کا جائزہ لے لیجئے۔ ہر علم وفن کا دائرہ انہیں چاروں نظاموں کے گرد گھومتا نظر آئے گا۔

سائنس کے بارے میں لوگوں کی ایک غلط فہمی دور کرنا لازمی ہے۔ سائنس میں مطالعہ کرنے کا کام انسان کرتا ہے، ظاہر ہے کہ جس کی عقل محدود ہوتی ہے اور اسی لئے سائنسی نظریات بدلتے رہتے ہیں لہٰذا سائنس میں کسی چیز کا ذکر نہ ہونا یا عدم واقفیت اس کے عدم وجود کی دلیل نہیں بن سکتی۔ سائنس کا اصل طریقۂ کار یہ ہے کہ

پہلے چند مفروضات قائم کئے جاتے ہیں پھر تحقیق و تفتیش کے ذریعہ ان مفروضات کی صحت یا عدم صحت کا پتہ چلایا جاتا ہے، یہ سلسلہ برابر چلتا رہتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو نئے نئے حقائق کبھی ظاہر نہیں ہو سکتے۔

اللہ نے ان باتوں کے مطالعہ کے لئے جس کا نام سائنس ہے بار بار اپنی کتاب میں ترغیب دی ہے کچھ نمونے ملاحظہ ہوں۔

۱۔ کیا ان منکرین خدا نے مشاہدہ نہیں کیا کہ ارض و سماوات آپس میں ملے ہوئے تھے جن کو ہم نے جدا کر دیا؟ اور پانی سے ہر جاندار چیز کی تخلیق کی ؟ (انبیاء ۳۰)

یہاں زمین کی تخلیق کی طرف اشارہ ہے اور سائنس داں اس بات پر متفق ہیں پروٹوپلازم جو تمام حیوانات و نباتات کا بنیادی مادہ ہے پانی کی شکل میں ہے کوئی بھی حیوانی اور نباتاتی جسم چھوٹے چھوٹے لاتعداد خوردبینی خوانوں پر مشتمل ہوتا ہے ۔جس میں یہ زندہ و متحرک مادہ (پروٹوپلازم) بھرا رہتا ہے اسی مادہ کی حرکت پر زندگی قائم رہتی ہے۔

۲۔ کیا وہ غور سے نہیں دیکھتے کہ اونٹوں کی تخلیق کس طرح کی گئی ہے؟ آسمان کس طرح اونچا اٹھایا گیا ہے؟ پہاڑ کس طرح نصب کئے گئے ہیں؟ اور زمین کس طرح پھیلائی گئی ہے؟ (سورۃ غاشیہ ۱۷ تا ۲۰)

دیکھئے یہاں یہ آیتیں علم حیوانیات (Zoology) علم ارضیات (Geology) علم فلکیات (Astronomy) علم طبیعات (Physics) علم کیمیا (Chemistry) اور علم حیاتیات (Biology) کی طرف دعوت دے رہی ہے۔

۳۔ ایک جگہ کتاب اللہ انسانوں کو جھنجھوڑتے ہوئے کہتی ہے ''اور زمین و آسمانوں میں کتنی ایسی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ لوگ منہ پھیر کر گزر جاتے ہیں

''(سورۂ یوسف، ۱۰۵) یعنی ان نشانیوں پر غور نہیں کرتے؟

۴۔ کیا یہ لوگ اللہ کی بارگاہ میں سجدہ ریز نہ ہوں گے، جو زمین اور آسمانوں کی پوشیدگیوں (اسرار سربستہ) کو ظاہر کر دیتا ہے'' (سورۂ نمل، ۲۵) دیکھئے اسرار کائنات پر غور کرنے کی دعوت ہے اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ ''اور آسمان و زمین کا کوئی ایسا راز (سربستہ) نہیں ہے جو (اس) کتاب مبین میں موجود نہ ہو (سورۂ نمل، ۷۵) یہی وہ اسرار سربستہ اور الٰہی انکشافات ہوتے ہیں جو سائنسی علوم کی ترقی کے بعد آیات اللہ کا روپ دھار کر انسان کی ہدایت و رہنمائی کرتے ہیں۔

۵۔ ایک مثال اور دیکھئے

''کیا انھوں نے روئے زمین کا مشاہدہ نہیں کیا کہ ہم نے کتنی طرح کے زوج کریم اگا دئے ہیں؟ یقیناً اس میں ایک نشانی ہے مگر بہت سے اس پر ایمان نہیں لائیں گے'' (سورۂ شعراء: ۷۔۸) چوکہ یہاں اگانے کا تذکرہ ہے لہٰذا اس کا تعلق نباتات سے ہے، اب زوج کریم کا مطلب اب تک عمدہ چیزیں یا اچھے نباتات لئے گئے ہیں لیکن علم نباتات (Botany) کی ترقی کے بعد اب اگر اس کے معنی معزز نر و مادہ (زوج) لئے جائیں تو اسے قرآنی معجزہ مان لینا پڑے گا، ویسے بھی زوج کا معنی جوڑا لیا جاتا ہے جیسے ''اور ہم نے ہر چیز میں ایک جوڑا (زوجین) بنایا ہے''۔ (سورۂ ذاریات: ۴۹) چنانچہ نباتات کا زوج کریم اس طرح ہوتا ہے کہ ہوا، شہد کی مکھی و دیگر حشرات الارض کے ذریعہ نر پھول کا زیرہ یا زرگل مادہ پھول تک پہنچتا ہے جس کے ذریعہ وہ بار آور ہوتا ہے۔ یہ تمام باتیں سائنسی تحقیق کے بعد اب سامنے آئی ہیں۔

اتنی بات کے بعد ہم ایک شبہ کا بھی ازالہ کر دیں لوگ یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ جب قرآن میں ہر چیز کا بیان موجود ہے اور کائنات کے کل اسرار سربستہ مذکور ہیں تو پھر کیا کسی سائنس داں نے ان آیات کو بنیاد بنا کر اپنی تحقیق و تفتیش کو آگے بڑھایا ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ نہیں کیوں کہ قرآن سائنس یا ٹکنالوجی کی کوئی کتاب نہں ہے

اس کا کام تو انسان کی فکر کو جلا دینا ہے۔

اسی لئے ایسی تمام باتوں کو اشاروں و کنایوں کی زبان میں بیان کیا ہے کہیں کہیں تشبیہ واستعارہ سے کام لیا گیا ہے جس کا مفہوم قبل از وقت سمجھ لینا ناممکن ہوتا ہے، جب کوئی سائنسی انکشاف یا کوئی واقعہ پیش آجاتا ہے تو یہ اشارے کنائے واضح ہوجاتے ہیں اور تشبیہات و استعارات حقیقت کا روپ دھار لیتے ہیں۔ان قرآنی اشاروں کنایوں کی ایک وجہ بھی ہے وہ یہ کہ جس زمانہ میں قرآن اتارا گیا اگر اس وقت سائنس کی تمام باتیں واضح کر کے بتائی جاتیں تو ایک تو یہ کہ ضخیم کتاب ہوتی، پھر اس زمانہ کے لوگ سمجھ ہی نہ پاتے اور پھر جو انکشافات کسی زمانہ میں رونما نہ ہوتے تو اس زمانہ میں قرآن بحث ومباحثہ اور مناظرہ ولڑائی کا اکھاڑا بن جاتا اور یہ بات ثابت کرنا مشکل ہوجاتا کہ ایسا ہی ہونے والا ہے، لہٰذا قرآن نے صرف رہنمائی وہدایت کا کام انجام دیا۔ایسا بھی نہیں ہے کہ اگر کسی نے گہرائی سے قرآنی مضامین کا جائزہ لے کر تحقیق کی ہے تو اسے کامیابی نہیں ملی، اس سلسلہ میں میرے پاس دو واقعات ڈاکٹروں کے ہیں جنھوں نے قرآن کی آیات پر غور وفکر کیا اور اس کے نتیجہ میں ایک ڈاکٹر نے آنکھ کی دوا بنادی اور دوسرے نے اسپتال میں بچوں کے بدل جانے پر قرآن کی رہنمائی میں یہ پتہ لگالیا کہ کون بچہ کس ماں کا ہے۔ان دوواقعات کی تفصیل جاننے کے لئے آپ میرا مضمون ''قرآن کی سنئے'' دیکھیں ،اور بھی ایسے واقعات ضرور ہوئے ہوں گے جہاں قرآن کی رہنمائی میں ریسرچ کرنے والوں کو کامیابیاں ملی ہوں گی مگر وہ میرے علم میں نہیں ہیں۔جیسے جیسے ریسرچ ہوتی جائیں گی قرآن کی رہنمائی میں کامیابیاں ملتی جائیں گی۔انشاءاللہ

اب ان دلیلوں کے بعد مجھے کہنے میں کوئی جھجک نہیں ہے کہ سائنس قرآنی آیات بالخصوص اسرار کائنات پر ریسرچ کر کسی نتیجہ پر پہنچنے کا نام ہے۔

ویداور قرآن مجید

جیسا کہ میں اپنے ایک مضمون ''حضرت نوح اور ہندو قوم'' میں لکھ چکا ہوں کہ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ وید الٰہی کلام ہیں جو کسی مہارشی پر اتارے گئے اور ان کے اشلوکوں کو مختلف رشیوں نے یاد کر کے انسانوں کی فلاح کے لیے الگ الگ ٹکڑوں میں انھیں بیان کیا ہے۔ بہر حال یہ ایک معمہ ضرور ہے کہ وہ مہارشی کون تھے جن پر اللہ نے یہ کلام وحی کئے۔

اس سلسلے میں ہندوستان کے پہلے وزیر دفاع جناب کرشنا مینن سے ہوئے ایک مکالمہ کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے ان کے قیام لندن کے دوران ان کے کسی دوست نے کافی گھما پھرا کر ایک ایسا سوال کیا کہ خود کرشنا مینن اس کا جواب نہ دے سکے ۔اس شخص نے ان کے ایک دوست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ آپ کا یہ دوست یہودی ہے اور اس کے پاس ایک الٰہی کتاب توریت ہے جو انھیں حضرت موسیٰ کے ذریعہ ملی، کرشنا مینن نے تائید کی، پھر اس نے دوسرے دوست کے بارے میں کہا کہ یہ ایک عیسائی ہے، اس کا بھی کہنا ہے کہ اس کے پاس بھی خدا کی ایک کتاب انجیل ہے۔ یہ اللہ نے حضرت عیسیٰ پر اتاری تھی، کرشنا مینن نے کہا یہ بھی معلوم ہے ۔پھر اس نے تیسرے دوست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک مسلمان ہے اور اس کا کہنا ہے کہ اس کے پاس بھی خدا کی ایک کتاب ہے قرآن اور اللہ نے یہ کتاب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر اتاری۔ کرشنا مینن نے کہنے والے کے مقصد کو نہ سمجھتے ہوئے تعجب سے کہا ارے یہ سب جانتا ہوں۔ اس پر اس شخص نے ان سے کہا کہ تمہارا

وید جس کو تم الٰہی کتاب ۔ آدی گرنتھ یعنی اولین صحف، سب سے عظیم علم اور کلام مانتے ہو اور سب سے قدیم بھی مانتے ہو ۔ اس کو خدا سے لینے اور انسانوں کو دینے کا سب سے پہلا انسانی ذریعہ آخر کون تھا؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب کرشنا مینن کے پاس نہ تھا، اور یہی وہ بات ہے جس کے سلسلہ میں میں نے ایک مضمون میں ان قرائن کی طرف اشارہ کیا تھا جن سے ایسے آثار ملتے ہیں کہ حضرت نوح ہی ان کے کھوئے ہوئے نبی ہو سکتے ہیں ۔ ہم چاہے ہندوؤں کے عقیدے کو مانیں یا نہ مانیں اور چاہے حضرت نوح کو ان کا کھویا ہوا نبی کہیں یا نہ کہیں ہندوؤں کے اس دعوے سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ وید سب سے قدیم ہیں اور یورپی مستشرقین کے مطابق کم سے کم آٹھ دس ہزار سال پرانے ہیں وید چار ہیں، ویدوں کے پنڈتوں کے مطابق ہر وید میں الگ موضوع پر احکام ہیں ان کے مطابق

۱۔ رگ وید (ऋग्वेद) میں علم وایمان کے احکام ہیں

۲۔ یجر وید (यजुर्वेद) میں عمل

۳۔ سام وید (साम वेद) عبادت کے طریقے

۴۔ اتھر وید (अथर्व वेद) میں روحانی باتوں کے احکام ہیں

یہاں ایک اور بات قابل ذکر ہے کہ ہر وید میں جو باب ہیں وہ کسی نہ کسی رشی سے منسوب ہیں جنھوں نے اس گم نام رشی سے الٰہی پیغام کو لے کر حفظ کر انسانوں کے سامنے تحریری شکل میں پیش کیا ہے، لیکن ان رشیوں نے اپنے بیان کئے ہوئے بابوں میں ایک ایک حصہ کو کسی نہ کسی دیوتا کو مخاطب کرتے ہوئے بات کہی ہے اور کچھ حصوں میں براہ راست پرماتما یعنی اللہ واحد کو مخاطب کیا ہے۔

خدا کو چھوڑ کر دیوتاؤں کو جو مخاطب کیا ہے اس کی وضاحت ویدک رشیوں نے یوں کی ہے کہ ہر صامت شے میں بھی ایک جاگتی روح یا آتما ہوتی ہے وہی اس کا دیوتا ہے جیسے مردہ جسم میں بھی آنکھ ہوتی ہے لیکن مردہ اس لئے نہیں دیکھ سکتا کہ روح

الگ ہوگئی ہے۔اس لیئے ویدوں میں اگنی پانی، نباتات، ہوا وغیرہ کی تعریف کی گئی ہے اور انھیں مخاطب کیا ہے کیوں کہ ان کے مطابق یہ تعریف ان کے دکھائی دینے والے جسم کی نہیں ہے بلکہ ان کے اندر جو طاقت والی روح ہے اس کی تعریف کی ہے۔ وہ ان طاقتوں کو پرماتما کی طاقتوں کا مظہر مانتے ہیں اور اس تعریف کے ذریعہ وہ در اصل پرماتما ہی کی تعریف کرتے ہیں۔ بہرحال یہ سب باتیں اپنی بات کو ثابت کرنے کا ایک ذریعہ ہیں ورنہ حقیقت یہی ہے کہ تمام منسوخ کتابوں کی طرح ویدوں میں بھی تحریف ہوئی ہے۔ایسا نہ ہوتا تو اللہ کو ایک آخری نبی ایک آخری شریعت کی کیا ضرورت تھی۔

لیکن جب بھی ویدوں میں پرماتما کو مخاطب کیا گیا ہے تو وہاں اب بھی وحدانیت اور اس کے دکھائی نہ دینے کا اظہار ہے جو مطابق قرآن ہے۔یجروید کے ۳۲ویں ادھیائے کے اشلوکوں میں واضح کیا گیا ہے کہ اس کی قدرت کے جلوے ہر جگہ نمایاں ہیں لیکن اسے براہ راست دیکھا نہیں جاسکتا اس کی کوئی تصویر (प्रतिमा) نہیں بن سکتی، وہ ہر جگہ موجود ہے اس سے پہلے کچھ پیدا نہیں ہوا، اسی نے جنت اور زمین بنائی اسی نے کہکشاں بنائی۔

یجروید کے ہی چالیسویں ادھیائے میں ہے کہ پرماتما خود سے ضوفگن ایک نور اور جسم نہ رکھنے والا ہے۔ بلا چھیدروں والا، بغیر ہڈی کا بغیر کسی جسم والا ہے۔وہ آتما سارے سنسار میں پھیلی ہوئی ہے۔ جو لوگ موہ مایا میں پڑکر دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرتے ہیں وہ جہالت کے اندھیرے میں داخل ہوتے ہیں۔دیکھئے اس سے زیادہ ایک اللہ کی عبادت کا تصور آپ اور کیا کرسکتے ہیں۔

ہم جب ویدوں اور قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایک بہت بڑا بنیادی فرق محسوس ہوتا ہے وہ یہ کہ رشیوں نے خدا یا پرماتما کے بارے میں کہا ہے۔ظاہر ہے کہ یہ الفاظ انھیں کے ہوں گے۔لہٰذا ان کے عقیدے کے مطابق خدائی کلام ان تک آیا

بھی تو عام انسانوں تک پہنچتے پہنچتے وہ متعلقہ رشیوں کی زبان میں ڈھل گیا۔ یوں کہوں کہ من وعن نہیں رہا۔ کلام جب خاطی انسان کی زبان میں آیا تو اس میں تحریف اور بدل جانے کے پورے امکانات تھے۔ اور وہی ہوا بھی ہوگا یہ صرف وید ہی پر منحصر نہیں ہے بلکہ انجیل میں بھی یہی بات ہے۔ وہاں بھی آپ پائیں گے کہ خداوند آیا ۔خداوند نے کہا، مسیح نے کہا۔ یہ جملے اس بات کو بتاتے ہیں کہ یہ کوئی انسان ہے جو کسی کے بارے میں کہہ رہا ہے۔ لیکن جب ہم قرآن پر نظر ڈالتے ہیں تو فوراً اس بات کا احساس پیدا ہوتا ہے کہ کوئی خالق ہے جو اپنے کلام کے ذریعہ بندوں کو مخاطب کر رہا ہے۔ قرآن کے کلام کی عظمت یہ ہے کہ اس میں اللہ نے اپنے نبی کے ذریعہ قل کہہ کر بندوں کو حکم دیا ہے یا پھر ایمان والوں کو براہ راست مخاطب کیا ہے۔ پورے قرآن میں آپ کو یہی نظر آئے گا کہ خالق اپنے بندوں کو حکم دے رہا ہے تو کبھی نصیحت کر رہا ہے۔ ہاں چونکہ اللہ کی عبادت کا طریقہ بندے کو بتانا تھا اس لئے صرف سورۂ الحمد میں بندہ اللہ کو مخاطب کر رہا ہے اس نایاب طریقہ نے قرآن کو سب سے ممتاز بنا دیا ہے۔ اس کی ایک وجہ اس کا آخری کتاب ہونا ہے۔

اس فرق کو ہٹا دیں تو ہمیں یہ ملے گا کہ قرآن مجید اور ویدوں میں توحید وغیرہ کا جو بیان ہے اس میں بہت کچھ مماثلت ہے۔ ہم اس سلسلے میں قرآنی آیات میں دیئے گئے احکامات اور ان سے مماثلت رکھتے ہوئے ویدوں کے اشلوک کے کچھ نمونے پیش کر رہے ہیں، دونوں کے صرف اردو ترجمہ پر ہی ہم نے اکتفا کی ہے۔

قرآن (۱) یہ ہمارے پاس سے ایک نعمت ہے کہ جو شکر کرتا ہے ہم اسے ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں (سورۂ قمر ۳۵)

وید (۱) اے پرمیشور آپ نیک آدمی کو اچھا صلہ دیتے ہیں ۔یہ آپ کی صفت ہے (رگ وید پہلا منڈل سوکت اشلوک)

قرآن: (۲) اللہ کے کلمات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی (سورۂ یونس: ۶۴)

وید (۲) خدا کے قانون اٹل ہیں (رگ وید ا، ۲۴، :۱۰)

قرآن (۳) بیشک خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ (سورۂ بقرہ: ۲)

وید: تمام خلقت پر صرف تم ہی قادر ہو (رگ وید: ۲۱۔ ۵۲: ۱۴)

قرآن (۴) اور ہم تو اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں (سورۂ ق: ۱۶)

وید: (۴) تم ہم سے قریب تر عبادت کے لائق محافظ اور بھلا کرنے والے ہو (رگ وید: ۵: ۲۴: ۱)

قرآن (۵) ساری تعریفیں اللہ کے لئے ہیں (سورۂ فاتحہ: ۱)

وید (۵) اس کی ذات تعریف کے لائق ہے (رگ وید: ۵: ۸۱: ۱)

قرآن (۶) جب تک تم اپنی پسندیدہ چیزوں میں سے کچھ راہ خدا میں خرچ نہ کرو گے ہرگز نیکی کے درجے پر فائز نہیں ہو سکتے (سورۂ آل عمران: ۹۱)

وید (۶) جو دوسروں کو نہ دیتا ہو خود ہی کھاتا ہے وہ گناہ کھاتا ہے (رگ وید: ۱۰: ۱۱۷: ۶)

قرآن (۷) کیا مشرق کیا مغرب ساری زمین خدا کی ہے جو کچھ زمین اور آسمان میں ہے سب اسی کا ہے اور سب اسی کے فرماں بردار ہیں وہی آسمان و زمین کا موجد ہے (سورۂ البقرہ: ۱۱۵: ۱۱۶: ۱۱۷

وید (۷) ایشور نے سورج، چاند، جنت، زمین و کائنات کو پیدا کیا اور سب اسی کے فرماں بردار ہیں (رگ وید ۱۰۔ ۱۹۰۔ ۳)

قرآن (۸) وہی رات کو دن کا لباس پہناتا ہے تو (گویا) رات دن کو پیچھے پیچھے تیزی سے ڈھونڈھتی رہتی ہے اور اسی نے سورج، چاند اور ستاروں کو پیدا کیا یہ سب اسی کے حکم کے تابعدار ہیں (اعراف ۵۴)

وید (۸) ایشور نے دن رات بنایا اور یہ اسی کے فرماں بردار ہیں (رگ وید

(۱۰۔۱۹۰۔۲)

اس کے علاوہ رگ وید میں اللہ کے ایک ہونے اور اسی کو کئی طرح سے بیان کرنے کی وضاحت ہے۔رگ وید کے پہلے منڈل سوکت ۱۶۴ کے ۴۶ ویں اشلوک میں ہے کہ "اسی برہم (ब्रह्म) کو اندر (इन्द्र)، متر (मित्र) یا ورون (वरूण) کہتے ہیں وہی آسمان میں سورج ہے وہی اگنی تم اور ماتر ایشوا ہے۔ عقل مند لوگ ایک برہم کو مختلف روپ میں بیان کرتے ہیں"۔

مندرجہ بالا اشلوک میری اس بات کو تقویت پہنچاتے ہیں کہ ویدوں میں بھی وحدانیت کا وہی تصور رہا ہوگا اور اسی سے مطابقت رکھتی ہوئی تعلیمات ہوں گی مگر ابتدائے زمانہ سے اس میں اتنی زیادہ خلط ملط کا دور چلا کہ اب وہ ایک تحریف شدہ کتاب ہو کر رہ گئی ہے۔ جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے اللہ نے خود اس کی حفاظت کی ذمہ داری لی اور اس کے لئے ایسے انتظامات ہوئے کہ اس میں تحریف ممکن نہ ہوسکی اور الحمدللہ ہمارے پاس تحریف سے پاک الٰہی کتاب ہے جو ابھی بھی بندوں کو اسی طرح ہدایت دے رہی ہے جیسی وہ نزول کے وقت تھی۔

قرآن کی سنئے

یہ میرا مضمون ان کے لئے قطعی نہیں ہے جن کے گھر میں قرآن اترا بلکہ یہ مضمون ان کے لئے ہے جن کے لئے قرآن اترا۔ جیسا کہ خود قرآن نے اعلان کیا ہے کہ چونکہ رسول اکرم عربوں کے درمیان مبعوث ہوئے اس لئے قرآن کو بھی عربی زبان میں نازل کیا گیا۔ تاکہ عرب قرآن کی باتوں کو سمجھ سکیں۔ چونکہ اللہ کا وعدہ تھا کہ اس نے قرآن کو نازل کیا اور وہی اس کی حفاظت کرے گا، اس لئے اس نے رسول کے ذریعہ ایسا انتظام کردیا کہ قرآن میں وہ تحریف نہ ہوسکے جو توریت، زبور اور انجیل میں ہوگئی تھی۔ انتظام یہ ہوا کہ جب رسول پر وحی نازل ہوتی تھی تو کچھ لوگ کتابت کا فرض انجام دیتے تھے اور کچھ لوگ آیتوں کو حفظ کرلیتے تھے یعنی قرآن کو محفوظ رکھنے کا دوہرا انتظام تھا۔ یہی نہیں چونکہ ساری دنیا کے لوگوں کی زبان عربی نہیں تھی اس لئے قرآن کا پیغام ان تک پہنچانے کے لئے بہت سے حق پرستوں نے قرآن کے عربی متن کے ساتھ اس کا وہاں کی زبان میں ترجمہ بھی کیا اور بحمد للہ آج کے دور میں دنیا کی تمام معروف زبانوں میں قرآن کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ وہ تو سب ٹھیک تھا لیکن موجودہ زمانے میں بھی اب جب کہ قرآن کو حفظ کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی، علماء نے باقاعدہ اسے حفظ کرنے میں بہت بڑے ثواب کی تعلیم دی اور صرف حافظ بننے کی حوصلہ افزائی کی۔ یہی نہیں، قرآن کی تلاوت کو اس انداز میں پیش کیا کہ لوگ قرآن کی آیتوں کا مطلب جانے بغیر خالی تلاوت کرتے رہیں۔ مقصد صرف ثواب کمانا تھا۔ عرب میں اور عربی داں حضرات تک تو غنیمت تھا کہ وہ پڑھتے وقت آیتوں کا

مطلب بھی سمجھ لیتے ہیں لیکن غیر عربی داں مطلب جانے بغیر صرف عربی میں پڑھتے رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ قرآن سے جو انھیں فائدہ حاصل ہونا تھا، نہیں ہوا۔ کاش وہ صرف عربی میں پڑھنے کے بجائے اس کے ترجمے پر دھیان دیتے تو انھیں پتہ چلتا کہ اللہ نے اپنے کلام میں ان کے فائدے کی کیا باتیں بتائیں۔ قرآن تو غور و فکر اور تدبر کی بات کرتا ہے مگر ہم اپنی نادانی میں اس کی سنتے ہی نہیں ہیں۔

ہاں! جو لوگ اس کی سنتے ہیں ان کو قرآن سے نئی نئی معلومات ملتی ہیں اور ان کے کارنامے دنیا کو حیرت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ یہاں میں دو واقعات بیان کرتا ہوں۔

ا۔ اردو میں ایک میگزین ''سائنس'' کے نام سے نکلتی ہے، اس میں ایک خبر نکلی تھی کہ ملک قطر سے نکلنے والے ''الرائے'' نامی اخبار کی ایک رپورٹ کے مطابق ایک یونانی ڈاکٹر عبدالباسط محمد نے انسانی پسینے کے مادے سے آنکھ کی ایک دوا بنائی ہے۔ یہ دوا بغیر کسی سائڈ افیکٹ یا آپریشن کے موتیا بند کا علاج کرنے میں 99% کامیاب ہے۔ ڈاکٹر عبدالباسط محمد نے بتایا کہ اس دوا کو بنانے میں قرآن مجید کی سورۂ یوسفؑ کی آیت نمبر ۸۴ / اور آیت ۹۳ / نے بڑا کام کیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ایک دن صبح کے وقت وہ سورۂ یوسفؑ کی تلاوت کر رہے تھے۔ پہلے ان کی نظر آیت نمبر ۸۴ / پر گئی جہاں اس بات کا ذکر ہے کہ حضرت یعقوبؑ اپنے بیٹے حضرت یوسفؑ کے غم میں اتنا روئے کہ ان کی آنکھیں سفید ہو گئیں اور وہ اندھے ہو گئے۔ پھر آیت نمبر ۹۳ / کے مطابق جب ان کے چہرے پر حضرت یوسفؑ کا کرتہ ڈالا گیا تو ان کی آنکھوں کی روشنی واپس لوٹ آئی۔ یہ پڑھ کر ڈاکٹر عبدالباسط یہیں رک گئے اور سوچ میں ڈوب گئے کہ آخر اس کرتے میں ایسا کیا تھا جو آنکھوں کی روشنی کو لوٹا لایا۔ بہت غور کرنے پر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ کرتے میں پسینے کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ بس انھوں نے پسینہ کے مادوں کی اسٹڈی کی اور تجربے شروع کیے۔ خرگوشوں پر کئی تجربے کرنے کے بعد جب نتیجے صحیح نکلے تو انھوں نے دو ہفتے تک دن میں دو بار اپنی دوا کے ذریعے ڈھائی سو

مریضوں کا علاج کیا۔اس میں انھیں 99% کامیابی ملی۔اس کے بعد انھوں نے یورپ اور امریکہ میں نئی دریافت کو پیٹنٹ دینے والے اداروں کے سامنے اپنی ریسرچ کے نتیجے پیش کئے اور آخر کار ان کی وہ دوا پیٹنٹ ہوگئی۔سوئزرلینڈ کی ایک کمپنی نے اس دوا کو کمرشیل پیمانے پر بنانے کے لئے ان سے معاہدہ کرنا چاہا تو ان کی آنکھوں کے سامنے سورۂ یوسفؑ گھوم گیا اور تب انھوں نے اس کمپنی سے یہ شرط رکھی کہ وہ یہ معاہدہ تبھی کریں گے جب وہ کمپنی دوا کے کَوَر پر صاف طور پر اس کا نام Medicine of Quran (قرآنی دوا) لکھے جسے کمپنی نے مان لیا۔یہ دوا موتیا بند کا علاج کرتی ہے۔اس دوا کو آئی ڈراپ کی شکل میں تیار کیا گیا ہے۔

۲۔ امریکہ کے ایک اسپتال میں دو عورتوں کے یہاں ایک ہی وقت میں ایک ایک بچہ پیدا ہوا۔ایک عورت کے یہاں لڑکا پیدا ہوا اور دوسری کے یہاں لڑکی۔جس رات میں وہ دونوں بچے پیدا ہوئے رات میں ڈیوٹی دینے والا ڈاکٹر اتفاق سے اس موقع پر وہاں موجود نہیں تھا۔نرسوں کی لاپرواہی سے دونوں بچوں کی کلائی پر وہ پٹی بھی نہیں بندھی جس پر بچے کی ماں کا نام ہوتا ہے۔نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں بچوں کو ایک جگہ رکھنے کی وجہ سے یہ پہچاننا ڈاکٹروں کے لئے مشکل ہوگیا کہ کس عورت کا کون سا بچہ ہے؟ زچگی کی نگرانی کرنے والے ڈاکٹروں کی ٹیم میں ایک مسلمان مصری ڈاکٹر بھی تھا۔اس کو سرجری میں مہارت حاصل تھی اور ساتھ میں کام کرنے والے امریکن ڈاکٹروں سے اس کے بہت اچھے تعلقات تھے۔سارے ڈاکٹر پریشان تھے کہ اس مسئلہ کو کیسے حل کیا جائے۔اس مسلمان مصری ڈاکٹر کے گہرے دوست ایک امریکن غیر مسلم ڈاکٹر نے اس سے کہا تم لوگوں کا تو دعویٰ ہے کہ قرآن میں ہر چیز موجود ہے اور اس نے ہر طرح کے مسئلوں کو اپنے اندر شامل کیا ہے اب تم ہی قرآن کا مطالعہ کر کے بتاؤ کہ اس میں سے کون بچہ کس عورت کا ہے؟

مصری ڈاکٹر نے کہا، ہاں قرآن بے شک ہر معاملہ میں راستہ دکھاتا ہے اور

میں اسے تمہیں ثابت کر کے دکھاؤں گا۔ مگر اس کے لئے تھوڑا موقع دو تا کہ میں مطالعہ کر کے خود پہلے اس معاملہ میں اطمینان کرلوں۔ اس سے بات کر کے اس مصری ڈاکٹر نے با قاعدہ اس مقصد کے لئے مصر کا سفر کیا اور ازہر یونیورسٹی (Al.Azhar) کے پروفیسروں سے اس مسئلہ کے بارے میں مشورہ کیا۔ ساتھ ہی امریکن ڈاکٹر کا قرآن کے لئے چیلنج بھی بتادیا۔

ازہر یونیورسٹی کے عالم نے قرآن کی وہ آیت پڑھ کر سنائی کہ ''ایک لڑکے کا حصہ دولڑکیوں کے برابر ہے'' مصری ڈاکٹر نے اس آیت پر غور کرنا شروع کیا اور گہرائی میں جانے پر اسے بچوں والی مشکل کا حل آخر میں مل ہی گیا۔ وہ لوٹ کر امریکہ آیا اور اپنے امریکن دوست ڈاکٹر سے بڑے اعتماد بھرے لہجے میں بتایا کہ قرآن نے ثابت کردیا ہے کہ ان دونوں میں سے کون سا بچہ کس ماں کا ہے۔ امریکن ڈاکٹر نے حیران ہو کر پوچھا کہ کس طرح ہوسکتا ہے؟ مصری ڈاکٹر نے کہا کہ مجھے ان دونوں عورتوں کا ٹسٹ لینا ہے اور تب تمہیں حل بتاؤں گا۔

اس کے بعد ٹسٹ اور ریسرچ کا کام کیا گیا جس کے نتیجے میں معلوم ہو گیا کہ کون سا بچہ کس عورت کا ہے اور مصری ڈاکٹر نے بڑے اعتماد کے ساتھ یہ نتیجہ اپنے امریکن دوست ڈاکٹر کو بتادیا۔ وہ ڈاکٹر حیران تھا کہ آخر تم نتیجے پر کیسے پہنچے؟ مصری ڈاکٹر نے اپنے دوست امریکن ڈاکٹر کو بتایا کہ قرآن کی ایک آیت نے میری رہنمائی کی کہ ایک لڑکے کا حصہ دولڑکیوں کے برابر ہے۔ میں نے غور کیا کہ اللہ نے پیدا ہونے والے لڑکے کے لئے بھی دودھ کی شکل میں دوہری غذا رکھی ہوگی۔ بس میں نے دونوں عورتوں کو ٹسٹ کیا۔ ٹسٹ و ریسرچ کے نتیجے میں جو بات سامنے آئی ہے وہ یہ کہ لڑکے کی ماں کی چھاتی میں لڑکی کی ماں کے مقابلہ میں دوگنا دودھ پایا گیا۔ ساتھ ہی لڑکے کی ماں کی چھاتی میں نمک اور وٹامن کی مقدار بھی لڑکی کی ماں کے مقابلہ میں دوگنی تھی۔ مصری ڈاکٹر نے امریکن ڈاکٹر کو بتایا کہ بس مجھے معلوم ہو گیا کہ لڑکا کس

عورت کا ہے اور لڑکی کس عورت کی ہے۔ امریکن ڈاکٹر حیران ہو گیا اور قرآن کے ذریعہ اس حل کے نکل آنے پر وہ قرآن کے چیلنج کو مان گیا اور مسلمان ہو گیا۔

دیکھا آپ نے کہ قرآن کی سننے پر کتنے بڑے بڑے مسئلے حل ہوئے اس لئے تمام مسلمانوں سے اپیل ہے کہ قرآن کے عربی متن کے ساتھ اس کا اپنی زبان میں ترجمہ بھی پڑھیں اور قرآن کی سنیں۔ آپ یقین کریں کہ حیرت انگیز نتائج آپ کے سامنے آئیں گے۔ بس قرآن کا مطالعہ کرتے وقت غور و فکر اور تدبر سے کام لیں۔

قرآنی ذوالقرنین

قرآن مجید کے مطالعہ سے ایک بات یہ ابھر کر آتی ہے کہ قرآن نے جن ناموں کو اپنے کلام میں جگہ دی ہے انھیں یا تو عرب کے کفار، یہودی، اور عیسائی جانتے تھے (مثلاً ابراہیمؑ، اسحاقؑ، اسمٰعیلؑ، صالحؑ وغیرہ کے اسماء) یا پھر ایسے ناموں کو اہمیت دی ہے جو قرآن کی نظروں میں بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ انھیں میں ایک نام ذوالقرنین کا بھی ہے۔

قرآن مجید کے پارہ ۱۶ر میں سورۂ کہف کی آیت ۸۳ تا ۹۸ میں لوگوں کے پوچھنے پر ذوالقرنین کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ چونکہ قرآن پر ہمیں مکمل یقین ہے اس لیے ہمیں قرآن مجید سے مندرجہ ذیل باتوں کا پتہ چلتا ہے۔

(۱) ذوالقرنین ایک نیک بادشاہ تھے جنھیں اللہ نے کافی قدرت عطا کی تھی۔ جس انداز سے ان کا تذکرہ ہوا ہے اس سے گمان ہوتا ہے کہ وہ پیغمبر تھے لیکن اس بارے میں اختلاف ہے۔ بہر حال ان کے مومن بادشاہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

(۲) انھوں نے تین سمت سفر کیا۔ پہلی سمت میں وہ ایسی جگہ پہنچے جہاں سے آفتاب ڈوبتا ہوا ایسا دکھائی دیا گویا وہ کالی کالی کیچڑ کے چشمہ میں ڈوب رہا ہے۔ اس سے ایسا اشارہ ملتا ہے کہ وہ کوئی دلدلی زمین تھی۔

(۳) دوسری سمت چلتے ہوئے وہ ایسی جگہ پہنچے جہاں آفتاب طلوع ہو رہا تھا اور ایسا دکھائی دے رہا تھا گویا وہ ایسی قوم کے علاقہ میں طلوع ہو رہا ہے جن کے لئے آفتاب کے سامنے کوئی آڑ نہیں بنائی گئی تھی۔ اس جگہ کا تعین خود تحقیق طلب ہے۔

(۴) تیسری سمت چلتے ہوئے وہ دو دیواروں یا رکاوٹوں کے عین درمیان پہنچے۔ ان دیواروں کے دوسری طرف ایک قوم تھی جو وہاں رہنے والوں کی زبان نہیں سمجھتی تھی بہر حال وہاں کے لوگوں نے یہ بتایا کہ دوسری طرف یاجوج ماجوج کی قوم ہے جو زمین پر فساد کرتی ہے۔

(۵) گرچہ تینوں سمتوں میں ذوالقرنین کو تین الگ الگ قوموں یا قبیلوں سے سابقہ پڑا لیکن قرآن نے ان کا تذکرہ نہیں کیا یعنی نام نہیں بتایا لیکن تیسری سمت والی قوم نے ان کو پریشان کرنے والی قوم کا تذکرہ کیا۔ قرآن نے جس کا نام یاجوج اور ماجوج لکھا ہے۔

(۶) آخری سمت میں ملنے والی قوم کی درخواست پر ذوالقرنین نے انھیں یاجوج ماجوج سے بچانے کے لیے ایک لوہا اور تانبا پلائی ہوئی دیوار بنائی۔ بس اس کے بعد قرآن خاموش ہے۔ قرآن سے اس بات کا کوئی پتہ نہیں چلتا کہ ذوالقرنین دراصل رہنے والے کہاں کے تھے اور ان کا نام ذوالقرنین کیوں تھا۔ اس نام کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ قرآن سے معلومات حاصل نہ ہونے کی وجہ سے قیاس کے گھوڑے دوڑائے جانے لگے۔ کچھ لوگوں نے انھیں سکندر اعظم سمجھ لیا اور کچھ نے انھیں دوسرا سکندر سمجھا۔ بہر حال سمجھا سکندر ہی کیوں کہ اردو کی کتابوں میں سدِ سکندری بہت مشہور ہے۔

آیئے مختلف لوگوں کے خیالات کا جائزہ لے کر ہم اس نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ذوالقرنین کون تھے؟

قرآن میں سوالات کے جواب میں ذوالقرنین کا تذکرہ کیا گیا ہے جس سے ایک بات تو صاف ظاہر ہے کہ ذوالقرنین اس وقت بھی اتنے مشہور تھے کہ قرآن میں ان کا تذکرہ آنے سے پہلے ہی لوگ انھیں جانتے تھے تبھی تو یہودیوں نے ان کے بارے میں رسول اللہ سے دریافت کیا تھا (تفسیر نمونہ صفحہ ۴۷۰)

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اس بارے میں اختلاف ہے کہ وہ پیغمبر تھے یا

نہیں۔رسول اللہ اور معصومین کی روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ، حالانکہ وہ نبی نہیں تھے لیکن وہ ایک نیک اور متقی شخص تھے، ان کا اللہ، حیات بعد ممات اور یوم محشر پر ایمان تھا اور وہ ایک وسیع الدماغ حاکم تھے۔(حیات القلوب صفحہ ۲۸۱)

ذوالقرنین کو ذوالقرنین کیوں کہا جاتا ہے؟ اس بارے میں کئی اندازے ہیں۔ذوالقرنین کے معنی اصل میں دو ایسے نشان ہیں جو کسی ایسی شے سے متعلق ہوں جو اس نشان کی وجہ سے مشہور ہو جائے۔جیسے چند جانوروں کے معاملے میں ان کی دو سینگیں۔دو قرن یعنی صدیوں کی طرح دو اوقات کا فاصلہ۔دو زمینوں کے بیچ الگ کرنے والے نشانات۔ماتھے پر دو واضح نشانات یا دو گیسو۔ایک آدمی کا قلم اور تلوار دونوں کا مکمل استعمال۔بہر حال تجزیہ نگاروں نے اس سلسلہ میں مختلف اندازے لگائے ہیں جن میں سے کچھ نمونے ملاحظہ ہوں:

(۱) اپنی قوم میں تبلیغ کے دوران ذوالقرنین پر ان کے سر کے داہنی طرف تلوار سے زخم پہنچایا گیا جس سے ان کی موت ہو گئی اور ۱۰۰ یا ۵۰۰ سال بعد اللہ نے پھر انھیں زندگی دی۔دوبارہ ان کے سر کے بائیں طرف تلوار سے زخم پہنچایا گیا اور پھر وہ سو یا پانچ سو سال مردہ رہے اور اللہ نے پھر انھیں زندہ کیا۔ان دو زخموں کی وجہ سے ان کے سر کے دونوں طرف دو نشان بن گئے جس کی وجہ سے انھیں ذوالقرنین کہا گیا۔(تفسیر نمونہ ۴۶۹۔۴۷۰)

(۲) وہ دو قرن تک زندہ رہے یعنی دو زمانوں تک۔اس لئے وہ ذوالقرنین کہلائے۔(حیات القلوب صفحہ ۲۸۳)

(۳) ان کے سر کے دونوں طرف دو سینگیں یا دو اٹھے ہوئے نشان تھے۔

(۴) وہ دو انتہا (مشرق اور مغرب) کے حاکم تھے

(۵) ان کے تاج میں دو شاخیں تھیں۔

(۶) وہ نور اور ظلمت دونوں جگہ داخل ہوئے تھے۔

(۷)　ان کے دو گیسو تھے۔

(۸)　انھوں نے خواب میں دیکھا تھا کہ وہ آسمان میں پہنچ گئے ہیں اور انھوں نے سورج کو دونوں طرف سے پکڑ رکھا ہے۔

(۹) کیوں کہ وہ بہت طاقتور اور بہادر تھے (قرن کی معنی طاقت کے بھی ہوتے ہیں) اور اللہ نے انھیں وسیع اختیارات دے رکھے تھے (حیات القلوب صفحہ ۲۵۳)

اصل نام: اس بارے میں بھی مختلف آراء ہیں۔ کچھ انھیں عیاش یا عبداللہ ابن ضحاک بتاتے ہیں ۔کچھ انھیں سکندر ذوالقرنین کہتے ہیں۔اور کچھ انھیں مقدونیہ والا سکندر اعظم بتاتے ہیں۔

اس سلسلہ میں حضرت علیؑ کا قول ملتا ہے کہ ذوالقرنین قوم کی اصلاح کرنے والے تھے۔ان کا ایک اللہ میں ایمان تھا اور وہ اللہ کے دین کی تبلیغ کرتے تھے۔وہ ذوالقرنین اس لئے تھے کہ اللہ نے انھیں دوبارا اٹھایا تھا۔بادل ان کی اطاعت میں تھے۔فتح کے لئے جو چیزیں ضروری ہیں اللہ نے انھیں سب مہیا کی تھیں۔ان کو ایسا نور عطا کیا گیا تھا جس سے وہ رات میں بھی صاف دیکھ سکتے تھے،اور اللہ نے ان کے لئے ساری سختیاں آسان کردی تھیں (انوار النجف صفحہ ۱۲۳)

ذوالقرنین اصل میں کون تھے اس بارے میں محققین کے تین اندازے سامنے آتے ہیں:

(۱)　عام خیال کے مطابق اور کچھ محققین کے نزدیک بھی ذوالقرنین اصل میں مقدونیہ کا بادشاہ سکندر اعظم ہے وہ ارسطو کا شاگرد تھا۔اس نے روم، مصر اور دوسرے مغربی ملکوں کو فتح کیا اور اسکندریہ شہر کی بنیاد رکھی۔تب اس نے سیریا اور بیت المقدس فتح کیا ،وہاں سے وہ آرمینیا گیا پھر عراق و ایران فتح کرتے ہوئے چین اور ہندوستان تک پہنچ گیا۔واپسی میں خراسان ہوتے ہوئے عراق آیا وہاں بیمار پڑا اور شہر زور میں اس کا انتقال ہو گیا۔یہ واقعہ تین صدی قبل مسیح کا ہے۔اس کی لاش

اسکندریہ دفن کیلئے لائی گئی۔

عبداللہ یوسف علی نے قرآن کے اپنے ترجمہ میں سکندر اعظم کو ہی ذوالقرنین مانا ہے۔ان کے مطابق وہ مشرق و مغرب کا حاکم تھا۔اس نے پہلی بار یونان کو متحد کیا۔اس وقت کے سکوں میں اس کے سر پر دو سینگیں دکھائی جاتی ہیں۔

علامہ حسین بخش نے اپنی تفسیر انوار النجف (صفحہ ۱۲۳ تا ۱۲۶) میں اس اندازے پر شک ظاہر کیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ سکندر اعظم ذوالقرنین نہیں تھا بلکہ یہ ذوالقرنین حضرت ابراہیمؑ پیغمبر کے ہم عصر ایک بادشاہ تھے کیوں کہ قرآن کے مطابق ذوالقرنین مومن تھے جب کہ سکندر اعظم ایک بت پرست تھا اور یونانی دیوتاؤں پر ایمان رکھتا تھا۔لیکن تاریخ میں حضرت ابراہیمؑ کے ان ہم عصر بادشاہ کا کچھ اتہ پتہ نہیں ملتا۔

کچھ محققین کا کہنا ہے کہ ذوالقرنین ایران کے ایک قدیم بادشاہ تھے کیوں کہ انجیل کے عہد نامہ قدیم کے کتاب دانیال والے حصہ میں ایک ایرانی بادشاہ کا تذکرہ ریم (بھیڑا RAM) کے طور پر کیا گیا ہے۔وہ بادشاہ ایک سینگ والے بھیڑئے کے ذریعے مارا گیا تھا۔اور اس پر دو نشان پڑ گئے تھے۔لیکن یہ اندازہ قابل یقین نہیں ہے کیوں کہ ہماری کسی بھی کتاب سے اس کا پتہ نہیں چلتا کہ ذوالقرنین کا ایسا انجام ہوا۔

(۲) دوسرے اندازے کے مطابق ذوالقرنین یمن کے بادشاہ تھے تفسیر نمونہ میں درج ہے کہ یمن کے ہمیاری قبیلہ کے شعراء نے بت پرستی کے دور کی اپنی شاعری میں اس بادشاہ کا تذکرہ کیا ہے۔ان کے مطابق ذوالقرنین کے ذریعہ بنائی گئی دیوار۔ دیوار معارب تھی۔

(۳) تیسرا اور جدید اندازہ مولانا ابوالکلام آزاد کا ہے۔انھوں نے ایک کتاب بنام ''ذوالقرنین اور کورش کبیر'' اس موضوع پر لکھی ہے۔تفسیر نمونہ کے مطابق بہت سے محققین نے مولانا آزاد کے اندازہ کی حمایت کی ہے۔مولانا آزاد کے مطابق

ذوالقرنین حخامنش کے بادشاہ کورش کبیر تھے۔

اب ذرا پورے مضمون پر نظر ڈالئے تو آپ کو پتہ چلے گا کہ محققین کے پہلے دو اندازے قرآن میں بتائے گئے خصائص پر پورے نہیں اترتے اور نہ کوئی اس بارے میں تاریخی ثبوت ہیں۔ نہ تو یمن کا بادشاہ اس زمرہ میں آتا ہے اور نہ سکندر اعظم اور یہ بات تو طے ہے کہ سکندر اعظم نے لوہے، تانبے کی کوئی دیوار نہیں بنائی تھی۔ جہاں تک یمن کی دیوار معارب کا مفروضہ ہے، یہ دیوار تو باڑھ کو روکنے اور پانی کو جمع کرنے کے لئے بنائی گئی تھی۔ سبا یمن میں ایک شہر تھا۔ ملک کو خوش حال رکھنے کے لئے معارب باندھ بنایا گیا تھا۔

اب صرف تیسرا اندازہ کورش کبیر کا بچتا ہے، مولانا آزاد نے جو اس بارے میں بیان کیا ہے وہ بات دل کو لگتی ہے۔ ۱۹ویں صدی میں ایران کے دریائے مرغب کے نزدیک کورش کے ایک مجسمہ کا پتہ لگایا گیا تھا جو ایک انسان کے مجسمہ کے برابر ہے۔ کورش کے دو بازو شاہین کے پروں کی طرح بنے ہیں۔ اس کے تاج میں بھیڑئے کے سینگوں کی طرح دو سینگیں بنی ہیں۔ جب مولانا آزاد نے توریت کے ذوالقرنین کی تفصیلوں کا موازنہ اس مجسمہ کے ساتھ کیا تو انھیں یہ اندازہ ہوا کہ کیوں ذوالقرنین دو سینگ والے مشہور ہیں اور کیوں کورش کے مجسمہ میں ایک شاہین کے دو بازو بنے ہیں۔

دوسری وجہ جو اس اندازہ کی حمایت کرتی ہے وہ یونانی تاریخ داں ہردوت کی کتاب تاریخ میں مذکورہ کورش کے اخلاقی خصائل ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ کورش نے یہ حکم جاری کیا تھا کہ اس کے فوجی سوائے جنگ میں اور باغیوں کی سرکوبی کے علاوہ اور کسی پر تلوار نہیں اٹھائیں گے۔ جو اپنا اسلحہ رکھ دیتا ہے اسے نہ مارا جائے۔ کورش بہت مہربان، وسیع الخیال اور رحم دل بادشاہ تھا۔ وہ عادل تھا اور دولت کا استعمال اپنی رعایا کی بھلائی کے لئے کرتا تھا۔ دوسرے یونانی تاریخ داں ڈی نیفون نے بھی کورش کی یہی صفات درج کی ہیں۔

کورش قرآن میں ذوالقرنین کے لئے بیان کردہ صفات سے اس لئے میل کھاتا ہے کیوں کہ کورش نے ہی تین الگ الگ سمتوں یعنی مغرب، مشرق اور شمال میں سفر کیا تھا اور اس کے تینوں سفر کی تفصیل تاریخ کی مندرجہ بالا کتابوں میں درج ہے۔

ہر دوت لکھتا ہے کہ کورش نے پہلے لیدیا پر حملہ کیا جو اس کی دارالسلطنت کے مغرب کی طرف تھا۔ تب اس نے مشرق کی طرف رہنے والے جنگلی لوگوں پر حملہ کیا۔ اس کے بعد وہ شمال میں قفقاز کی پہاڑیوں کی طرف گیا حتیٰ کہ وہ ایک درّہ کے پاس پہنچا۔ اس پہاڑ کے دامن میں رہنے والے لوگوں نے کورش سے کچھ ظالم قوموں کے ظلم و بربریت سے انھیں بچانے کی التجا کی اس لئے کورش نے ایک مضبوط دیوار بنائی۔

وہ درّہ کورش نے جہاں دیوار بنائی تھی وہ آج درّہ داریال کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ نقشہ میں طفلس اور ولاڈی کوکس کے درمیان ہے۔ قرآن کے ذوالقرنین کی بنائی ہوئی دیوار کی خصوصیتیں وہی ہیں جو کورش کی بنائی ہوئی دیوار میں پائی جاتی ہیں۔

لہٰذا قرآنی ذوالقرنین کے ذکر پر فطری طور پر دماغ میں کورش کبیر کا تصور ابھرتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اصحاب کہف

اگر آپ قرآن کا دھیان سے مطالعہ کریں گے تو آپ کو پتہ چلے گا کہ قرآن نے گزشتہ پیغمبروں اور ان کی قوم کے واقعات بیان کئے ہیں جیسے حضرت ابراہیمؑ ،حضرت یوسفؑ ، حضرت موسیٰؑ ، حضرت ہودؑ، حضرت صالح اور عیسیٰؑ وغیرہ وغیرہ اور ان کی قوموں کے واقعات۔ کہیں کہیں تو ان پیغمبروں کے نام سے قرآن میں سورتیں بھی ہیں۔ جیسے سورۂ یونسؑ ، ہودؑ، یوسفؑ ، ابراہیمؑ اور نوحؑ۔ اس کے علاوہ بھی قرآن نے کچھ ایسے لوگوں کے واقعات لکھے ہیں جو ایمان پر تھے اور انھوں نے بڑے کارنامے انجام دئے تھے۔ مفسرین نے جوان کی وجوہات بیان کی ہیں ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ لوگوں کو سابقہ قوموں کے بارے میں جانکاری مل جائے اور دوسری یہ کہ ان واقعات سے آئندہ لوگ نصیحت لیں۔

انھیں واقعات میں سے ایک واقعہ اصحاب کہف کا بھی ہے جن کا واقعہ نہ صرف قرآن نے بیان کیا ہے بلکہ اس سورۃ کا نام بھی ''کہف'' رکھ دیا ہے۔ آیئے ہم قرآن اور اس کی تائید میں جو تاریخ ہے اس کی روشنی میں اصحاب کہف کے واقعہ کا جائزہ لیتے ہیں۔ سورۂ کہف کی آیت نمبر ۹ رمیں قرآن کہہ رہا ہے کہ ''کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ کہف ورقیم والے ہماری نشانیوں میں سے کوئی تعجب خیز نشانی تھے'' اس میں دو لفظ ''کہف'' اور ''رقیم'' ہیں۔ کہف تو ہمیں معلوم ہے کہ چونکہ انھوں نے کہف (غار) میں پناہ لی تھی اس لئے یہ لفظ یہاں رکھا گیا ہے لیکن ''رقیم'' سے کیا مراد ہے؟ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب ''اصحاب کہف'' میں لکھا ہے کہ ''اپنے

زمانے میں عربوں نے اسے ایک شہر کا نام سمجھا تھا لیکن چونکہ اس نام کا کوئی شہر عام طور مشہور نہ تھا اس لئے اکثر مفسرین نے رقیم کا مطلب کتابت بیان کیا ہے یعنی ان کے غار پر کوئی ''کتبہ'' لگا دیا گیا تھا اس لئے یہ رقیم والے کہلائے لیکن انھوں نے اگر توریت کی طرف دھیان دیا ہوتا تو معلوم ہو جاتا کہ توریت میں رقیم کا ذکر ہے اور یہ حقیقت میں ایک شہر کا نام تھا جو آگے چل کر ''پیٹرا'' کے نام سے مشہور ہوا اور عرب اسے ''بطرا'' کہنے لگے۔ جزیرہ نما سینا اور خلیج عقبہ سے سیدھے شمال کی طرف بڑھیں تو دو پہاڑی سلسلے برابر برابر شروع ہو جاتے ہیں۔ انھیں میں سے ایک پہاڑی پر ''رقیم نامی شہر آباد تھا۔ دوسری صدی عیسوی میں جب رومن لوگوں نے سیریا اور فلسطین کو ملا لیا تو یہاں کے دوسرے شہروں کی طرح رقیم نے بھی ایک رومی نو آبادی کی حیثیت اختیار کر لی اور یہی زمانہ جب پیٹرا کے نام سے اس کے عظیم الشان مندروں اور تھیٹروں کی شہرت دور دور تک پہنچی۔ جب مسلمانوں نے یہ علاقہ ساتویں صدی عیسوی میں فتح کیا تو رقیم کا نام کم زبانوں پر تھا۔ یہ رومیوں کا پیٹرا اور عربوں کا بطرہ تھا۔ یہ علاقہ عرب کی سرحد سے ۶۰ر۷۰ میل کی دوری پر ہے۔ اس علاقہ میں بہت سے غار بھی ہیں دوسری طرف مولانا مودودی نے اپنی کتاب ''سفر نامۂ ارض القرآن'' میں لکھا ہے کہ ''اردن میں ہم نے وہ غار بھی دیکھا جس کے لئے مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ اصحاب کہف نے پناہ لی تھی۔ یہ غار عمان کے جنوب مشرق میں تقریباً ۱۲ر کیلو میٹر (۷ میل) کے فاصلہ پر واقع ہے، اور اس کے قریب کی بستی کا نام ''رقیب'' ہے اور اہل اردن کا دعویٰ ہے کہ یہ دراصل رقیم سے بگڑا ہوا ہے۔ انھوں نے پٹیرا کا بھی دورہ کیا تھا لیکن وہاں کی جگہ پر اصحاب کہف کے غار کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ اب چاہے وہ ''رقیم'' یعنی پٹیرا ہو یا ''رقیب'' یعنی رقیم ہو، ایک بات تو طے ہو جاتی ہے کہ یہ واقعہ جب گزرا ہے تو رقیم نامی شہر تھا جسے عرب بھی جانتے تھے اور اصحاب کہف کا غار کسی رقیم والی جگہ کے پاس ہونا چاہئے۔

معلومات کے مطابق اصحاب کہف کے زمانے میں ''دقیانوس'' نامی بادشاہ ''رقیم'' پر حکومت کرتا تھا۔ وہ بت پرست تھا اور نہ ماننے والوں پر بہت ظلم کرتا تھا۔ اس کا نام پرانی سوچ کی علامت بن گیا ہے اور اگر کوئی پرانی فرسودہ رسم ورواج کی بات کرتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ کیوں دقیانوسی بات کر رہے ہو۔ شیعہ عالم مولانا فرمان علی صاحب نے اس شہر کا نام ''افسوس'' لکھا ہے جب کہ مولانا ذیشان حیدر صاحب نے ''طرسوس'' لکھا ہے لیکن اس کے سلسلہ میں کوئی دلیل نہیں دی گئی ہے اس لئے تسلیم کرنے میں جھجھک ہے۔

اب ان اصحاب کہف کی تعداد کتنی تھی اس پر بھی اتفاق نہیں ہے اور اللہ نے بھی اسے ظاہر نہیں کیا ہے بلکہ اسے معمہ بنا دیا ہے۔ قرآن کے مطابق یہ چند جوان تھے جو اللہ پر ایمان لائے تھے۔ (آیت ۱۳ر) عنقریب یہ لوگ کہیں گے کہ وہ تین تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا۔ اور کچھ کہیں گے کہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا۔ یہ سب اندازے ہیں اور کچھ تو یہ بھی کہیں گے کہ وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ان کی تعداد کو بہتر جانتا ہے اور چند لوگوں کے علاوہ کوئی نہیں جانتا ہے''۔ (آیت ۲۲ر) اس آیت سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اللہ نہیں چاہتا کہ ہم صحیح تعداد کے بارے میں اٹکل لگائیں۔

مولانا ذیشان حیدر صاحب نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ ان کے مطابق چونکہ قرآن نے باقی تین اور پانچ والے قول کا اندازہ بتایا ہے اور سات والے پر کوئی اشارہ نہیں ہے اس لئے بظاہر یہی صحیح ہے۔ مولانا فرمان علی صاحب نے درمیانی راستہ اختیار کیا ہے۔ انھوں نے وہ تعداد لکھی ہے جس کا قرآن میں اندازے کے تحت کوئی ذکر نہیں ہے۔ ان کے مطابق یہ چھ لوگ تھے۔ انھوں نے ان کے نام بھی لکھے ہیں۔ یہ سارے نام دقیانوس کے نام سے ملتے جلتے ہیں۔ نام یہ ہیں۔

(۱) کمسلمینا (۲) سارن یوس (۳) تملیخا (۴) مرتونس (۵) نینونس (۶) دریونس۔ پتہ نہیں یہ نام کہاں سے لئے گئے ہیں اور کس زبان کے ہیں۔ میرا اپنا خیال تو یہ ہے کہ جب خود اللہ نے نہیں چاہا تو ہم ان کی تعداد یا نام کے بارے میں اندازہ کیوں لگائیں۔

اس واقعہ کے بارے میں جو مولانا فرمان علی صاحب نے تفسیر بیان کی ہے وہ یہ ہے کہ دقیانوس لوگوں کو بتوں کی عبادت کے لئے مجبور کرتا تھا۔ جو انکار کرتا تھا وہ مارا جاتا تھا۔ شہر کے دروازے پر بھی قانون تھا کہ جو شہر سے باہر نکلے وہ بتوں کے سامنے سجدہ کرے۔ وہاں کچھ لوگ اللہ کے فضل سے توحید پرست ہو گئے۔ جب بادشاہ نے ستایا تو ایک دن شکار کے بہانے چپکے سے باہر نکلے۔ راستے میں ایک چرواہا ملا وہ تو ان کا ساتھی نہ بنا لیکن اس کا کتا "قطمیر" ان لوگوں کے ساتھ ہو گیا۔ ابھی وہ شہر سے تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ دقیانوس کو خبر ہو گئی اور اس کے سپاہیوں نے پیچھا کیا ۔ جب ان لوگوں کو پتہ چلا تو وہ لوگ خوف زدہ ہو کر ایک غار میں چھپ گئے۔ اس غار کا اشارہ قرآن نے خود کیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ "اور تم دیکھو گے کہ جب سورج نکلتا ہے تو ان کے غار سے داہنی طرف کترا کر نکل جاتا ہے اور جب ڈوبتا ہے تو بائیں طرف جھک کر نکل جاتا ہے"۔ (آیت ۱۷) یہاں قرآن نے غار کے صحیح مقام کی طرف اشاروں کے ذریعہ رہنمائی کی ہے یعنی اس غار کی جگہ ایسی ہے کہ صبح سورج کی روشنی اس پر نہیں پڑتی ہے یہی حال غروب کے وقت کا ہے۔ قرآن نے ہمیں جگہ کے بارے میں تحقیق کی دعوت دی ہے۔ ان اشاروں کی روشنی میں غار ڈھونڈھا جاتا تو مل جاتا۔ غار کے بارے میں یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ تین ایسے غار ہیں جن کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ اصحاب کہف کا غار ہے۔ پہلا آرمینیا میں ہے جہاں غار سیاحوں کو اصحاب کہف کی ہڈیاں دکھائی جاتی ہیں۔ یہ غار قرآن میں بیان کردہ غار نہیں ہو سکتا کیوں کہ قرآن کے مطابق وہ سو رہے ہیں تو سونے والوں کی ہڈیاں کیسے

الگ ہو جائیں گی۔ دوسرا غار سیریا کے دارالسلطنت دمشق کے نواحی علاقہ میں ہے۔ اسے میں نے خود بھی دیکھا ہے۔ میں جب جب زیارت پر گیا ہوں تو اس غار تک بھی پہنچا ہوں۔ لیکن ایک تو اس غار کا دروازہ بند ہے دوسرے یہ کہ قرآن کی بتائی ہوئی علامتیں یہاں پوری نہیں اترتیں۔ تیسرا غار وہ ہے جو مولانا مودودی نے رقیب کے پاس دیکھا ہے جو اردن کے شہر عمان کے جنوب مشرق میں تقریباً بارہ کیلومیٹر کی دوری پر ہے۔ اس غار کے اندر اتنا اندھیرا ہے کہ انھوں نے جب اس کے اندر جھانکا تو کوئی چیز نظر نہ آئی۔ اس کے اوپر اور اس کے پاس کی جگہوں پر قدیم زمانہ کی سنگین عمارتوں کے آثار موجود تھے۔ اس کا دروازہ بھی جنوب مشرقی سمت میں اس طرح ہے کہ سورج طلوع ہو تو داہنی طرف کترا کر نکل جاتا ہے اور غروب کے وقت بائیں طرف سے۔ ان کے مطابق گویا قرآن نے اصحاب کہف کے غار کی جو صفات بیان کی ہیں وہ اس غار پر صادق آتی ہیں۔ لیکن مقامی روایات کے سوا کوئی چیز وہاں موجود نہیں ہے اور نہ ہی اردن کے محکمۂ آثار قدیمہ نے اس کا کوئی پروپگنڈا کیا ہے۔ اس لئے وہ نہیں کہہ سکتے کہ واقعی یہ اصحاب کہف کا غار ہے کہ نہیں۔ غرض کہ ابھی تک غار ایک معمہ ہے اور اب تک پتہ نہیں چلا ہے کہ دراصل وہ غار ہے کہاں۔

اب ہم پھر قرآن کی طرف پلٹتے ہیں۔ قرآن کا بیان ہے کہ "وہ غار میں ایک وسیع جگہ آرام کر رہے ہیں۔ (آیت ۱۷) اور اسی طرح ہم نے انھیں دوبارہ زندہ کیا تا کہ آپس میں ایک دوسرے سے سوال کریں۔ تو ایک نے کہا تم کتنی دیر ٹھہرے ہو تو سب نے کہا ایک دن یا اس کا ایک حصہ ان لوگوں نے کہا کہ تمہارا پروردگار اس مدت کو بہتر جانتا ہے۔ اب تم اپنے سکے دے کر کسی کو شہر کی طرف بھیجو۔ وہ دیکھے کہ کون سا کھانا بہتر ہے اور پھر تمہارے لئے کھانے کا سامان لائے۔ وہ آہستہ جائے اور کسی کو تمہارے بارے میں خبر نہ ہونے پائے۔ یہ اگر تمہارے بارے میں جان گئے تو تمہیں پتھر مار مار کر ہلاک کر دیں گے یا تمہیں بھی اپنے مذہب کی طرف پلٹا دیں

گے۔اس طرح کبھی تم نجات نہ پاسکو گے۔اوراس طرح ہم نے قوم کوان کے حالات کہ جان کاری دیدی تاکہ انھیں معلوم ہو جائے کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔'' (آیت ۱۹، ۲۰، ۲۲)

اس کی تفسیر یوں ہے کہ جب وہ غار میں گئے تو اللہ نے ان پر نیند طاری کر دی۔سب کے سب سو گئے اور کتا غار کے باہر آگے کے دو پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا۔

دقیانوس کے سپاہی ان کا پتہ نہ لگا سکے اور واپس چلے گئے، یہ لوگ ۳۰۹ سال تک سوتے رہے۔اس درمیان دقیانوس سمیت کئی بادشاہ گذر گئے اور اب عیسائیوں کے ہاتھ یہاں کی بادشاہت آگئی۔جب ۳۰۹ سال بعد ان کی آنکھ کھلی تو انھوں نے آپس میں وہی مشورہ کیا جیسا کہ قرآن میں اوپر بیان ہوا ہے۔ایک ساتھی دقیانوسی سکے لے کر نکلا تو شہر کو بدلا پایا۔کسی کو نہ پہچانا۔جب اس نے روٹی کے لئے سکہ دیا تو لوگ سمجھے کہ اس نے کوئی پرانا خزانہ چرایا ہے۔اسے بادشاہ کے یہاں لے جایا گیا تو اسے پوری حقیقت معلوم ہوئی۔بادشاہ اپنے لوگوں کے ساتھ اس غار تک پہنچا ادھر غار سے باہر جانے والا ساتھی غار میں پہنچ کر اپنے ساتھیوں سے ملا اور سارا ماجرہ سنایا۔سب نے یہ سن کر سجدے میں اللہ سے یہ دعا کی کہ ہم کو پھر نیند آجائے اور پھر وہ دوبارہ سو گئے۔بادشاہ ان کو سوتا پا کر واپس چلا گیا۔ان کے اب سونے کی حالت قرآن نے یوں بیان کی ہے۔''اور تمہارا خیال ہے کہ وہ جاگ رہے ہیں حالانکہ وہ نیند کی حالت میں ہیں اور ہم انھیں داہنے بائیں کروٹ بھی بدلوا رہے ہیں۔اور ان کا کتا ڈیوڑھی پر دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے ڈٹا ہوا ہے اور اگر تم ان کی کیفیت کو دیکھ لیتے تو الٹے پاؤں بھاگ نکلتے اور تمہارے دل میں دہشت سما جاتی''۔(آیت ۱۸/)

مولانا آزاد نے ان کی اس کیفیت کو نیند سے دوبارہ جاگنے سے پہلے والی بتایا ہے ان کے مطابق وہ اب مر چکے ہیں۔اس سلسلہ میں انھوں نے حضرت ابن عباس کا قول امام قرطبی کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ اصحاب کہف کی موت پر ایک مدت گزر چکی ہے اور ان کے جسم فنا ہو گئے ہیں جس طرح ہر جسم فنا ہو جاتا ہے۔انھوں

نے آیت ۱۸ رکی تاویل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جو عبادت کے سلسلہ میں جس حالت میں تھا یعنی قیام ، رکوع وسجدہ ان کو اسی حالت میں موت آگئی اور وہ اسی حالت میں ہیں ان کے مطابق قرآن میں جو کیفیت بیان کی گئی ہے وہ یہی ہے کہ لوگ اگر ان مردوں کو قیام ، رکوع اور سجدہ کی حالت مین دیکھیں اور ان کی آنکھیں بھی کھلی دیکھیں تو ان میں دہشت سما جاتی اور الٹے پاؤں بھاگ لیتے۔ قرآن کے اس دعویٰ پر کہ ہم انھیں داہنے بائیں کروٹ بھی بدلوا رہے ہیں۔ وہ بڑی دور کی کوڑی لائے ہیں کہ ہوا کی وجہ سے ان کے ڈھانچے داہنے سے بائیں اور بائیں سے داہنی طرف اس طرح گھومتے رہے ہیں جیسے ایک زندہ آدمی ایک طرف سے پلٹ کر دوسری طرف دیکھے۔ یہ بات حلق کے نیچے نہیں اترتی۔

ہم تو قرآن کے بیان پر ایمان لا کر یہی مانتے ہیں کہ وہ آرام سے سو رہے ہیں جو خدا کی قدرت سے ناممکن نہیں ہے۔ اور چونکہ وہ سونے کی حالت میں ہیں اس لئے وہ کروٹ بھی بدل رہے ہیں۔ کروٹ بدلنا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ لیٹے ہوئے ہیں نہ کہ قیام ، رکوع اور سجدہ کی حالت میں ہین ، جیسا مولانا آزاد نے لکھا ہے۔ اللہ ہی ان کو نیند سے جگائے گا۔ مگر کب یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

سدرۃ المنتہیٰ

قرآن مجید میں ۵۳ ویں سورے ''النجم'' میں اللہ نے جہاں رسول اکرم کے معراج کے بارے میں بیان کیا ہے وہیں آگے چل کر سدرۃ المنتہیٰ کا بھی ذکر ہے۔

ملاحظہ ہو ترجمہ

''قسم ہے ستارہ کی جب وہ ٹوٹا۔ تمہارا ساتھی نہ گمراہ ہوا ہے اور نہ بہکا ۔ اور وہ اپنی خواہش سے کلام نہیں کرتا ہے۔ اس کا کلام وہی وحی ہے جو مسلسل نازل ہوتی رہتی ہے۔ اسے نہایت طاقت والے نے تعلیم دی ہے۔ وہ صاحب حسن و جمال جو سیدھا کھڑا ہوا۔ جب کہ وہ بلند ترین افق پر تھا۔ پھر وہ قریب ہوا اور آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ دو کمان یا اس سے کم کا فاصلہ رہ گیا۔ اللہ نے بندہ کی طرف جس راز کی بات کرنی چاہی وحی کر دی۔ دل نے اس بات کو جھٹلایا نہیں جس کو آنکھوں نے دیکھا۔ کیا تم اس سے اس بات کے بارے میں جھگڑا کر رہے ہو جو وہ دیکھ رہا ہے۔ اور اس نے تو ایک بار اور بھی اسے دیکھا ہے۔ سدرۃ المنتہیٰ کے نزدیک ۔ جس کے پاس جنت الماویٰ بھی ہے۔ جب سدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ کہ چھا رہا تھا۔ اس وقت اس کی آنکھ نہ چوندھیائی اور نہ حد سے آگے بڑھی۔ اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔''

(آیت ۱ تا ۱۸)

یہاں میں نے مولانا ذیشان حیدر جوادی مرحوم کے قرآن کے ترجمہ کا سہارا لیا ہے۔ سدرۃ المنتہیٰ دو الفاظ سدرہ اور منتہیٰ سے مل کر بنا ہے۔ مولانا فرمان علی اور مولانا ذیشان مرحوم کی تفسیر میں اس کا مطلب ''ساتویں آسمان پر بیری کا درخت'' لکھا ہے۔لغات القرآن میں سدرۃ المنتہیٰ کو انسانی فہم کی آخری سرحد پر ایک درخت کہا گیا ہے جہاں رسول اللہ کو اللہ کی طرف سے خاص نعمتیں عطا کی گئیں۔

سدرۃ المنتہیٰ میں بتائے گئے بیری کے درخت کی انتہا بتانے کی کسی مفسر نے ہمت نہیں کی۔اسی لیے تفسیر کرنے والے تمام حضرات نے قرآن میں نازل لفظ سدرۃ المنتہیٰ کا ترجمہ سدرۃ المنتہیٰ ہی کیا ہے اور اسے اللہ کا راز جانا ہے۔

چونکہ منتہیٰ انسانی فہم سے بالاتر بات ہے اس لیے ہم اس کے پہلے والے لفظ سدرہ یا سدر کا جائزہ لیتے ہیں۔اردو اور انگریزی میں تفسیر لکھنے والوں نے زیادہ تر سدرہ کا ترجمہ بیری کا درخت کیا ہے۔اس سلسلہ میں مولانا مودودی کی تفسیر میں ہے کہ ''سدرۃ المنتہیٰ وہ جگہ ہے جہاں جبرئیل کی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دوسری ملاقات ہوئی تھی۔'' ان کی اس تفسیر سے ہمارے لیے یہ سمجھ پانا بہت مشکل ہے کہ اس سرحد پر وہ بیری کا درخت کیسا ہے۔اور اس کی حقیقت کیا ہے۔بہر حال یہ کوئی ایسی ہی چیز ہے جس کے لیے انسانی زبان میں سدرہ سے زیادہ مناسب لفظ اور کوئی نہیں تھا۔پھر وہ بھی بیری کا درخت۔اب ہم اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ سدرہ سے مراد کیا یہی بیری کا درخت ہے جو ہمارے ہندوستان میں پایا جاتا ہے۔یہاں یہ بتاتے چلیں کہ سدرۃ المنتہیٰ میں سدرہ یا سدر کے ذکر کے علاوہ دو اور جگہ قرآن میں سدرہ یا سدر کا ذکر آیا ہے۔(سورۂ واقعہ ۵۶ واں سورہ)

آیت ۲۸ میں اصحاب یمین کے لیے کہا گیا کہ ان کا کیا کہنا وہ بغیر کانٹے کی بیری (سدر) کے درخت کے درمیان ہوں گے۔اسی طرح سورۂ سبا (۳۴ واں سورہ) میں بھی سدر کا ذکر یوں ہے۔

''اور قوم سبا کے لیے ان کے وطن ہی میں ہماری نشانی تھی کہ داہنے بائیں دونوں طرف باغات تھے (تاکہ) تم لوگ اپنے رب کا دیا رزق کھاؤ اور اس کا شکر ادا کرو کہ تمہارے لیے پاکیزہ شہر اور بخشنے والا رب ہے۔ مگر ان لوگوں نے انحراف کیا تو ہم نے ان پر بڑے زوروں کا سیلاب بھیج دیا اور ان کے دونوں باغات کو ایسے دو باغات میں تبدیل کر دیا جن کے پھل بے مزہ تھے اور ان میں جھاؤ کے درخت اور تھوڑی سی بیریاں (سدر قلیل) تھیں'' (آیت ۱۵۔۱۶)

اب یہ بیر یا بیری کون تھی اس پر لکھنؤ میں مقیم ماہر نباتات ڈاکٹر اقتدار حسین فاروقی صاحب نے باقاعدہ تحقیق کی ہے۔ان کی تحقیق کا خلاصہ یہاں پیش کر رہے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ۔

سدرۃ المنتہٰی کا تو تجزیہ نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ یہ الٰہی راز ہے، لیکن بیری کے درخت کا تجزیہ (Analysis) کیا جا سکتا ہے۔انھوں نے مولانا عبدالماجد دریا بادی کا حوالہ دیا ہے جن کے مطابق '' کچھ تفسیر کرنے والوں کی رائے میں سدرہ سے مراد یہ بیری کا درخت نہیں ہے بلکہ کوئی ایک اور عمدہ درخت ہے'' یہاں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ قرآن میں چار بار سدرہ کا ذکر آیا ہے۔ایک بار سورہ سبا میں، ایک بار سورہ واقعہ میں اور دو بار سورہ نجم میں۔لیکن ان چاروں جگہ ایک بھی اشارہ سدر کے پھل کی طرف نہیں ہے۔اس کے علاوہ کسی بھی آیت میں سدر کا ذکر دوسرے پھل دار پودوں کے ساتھ نہیں ہوا ہے۔یعنی کھجور، انگور، زیتون، انار اور انجیر کا ذکر تو ایک دوسرے کے ساتھ کیا گیا ہے لیکن ان میں سے کسی کا ذکر سدر کے ساتھ نہیں ملتا۔کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سدر کے درخت کی اہمیت اور اس کی شان وشوکت کا تو ذکر ہوا ہے لیکن اس کے پھل کی خوبی کی بات نہیں کی گئی ہے۔ہاں سدر کو سورۂ سبا میں ان تین

اقسام کے مضبوط درختوں (خمط، اثل وسدر) میں سے ایک بتایا گیا ہے جو سیلاب کی زد میں آکر بھی اپنی جڑوں پر کھڑے رہے (دیکھیں سورۂ سبا آیت ۱۷) یہاں قرآن کے الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ سدر کا پیڑ اتنا مضبوط تھا کہ سیلاب کو بھی سہہ گیا۔ (کیا ہندوستان کا بیری کا درخت اتنا مضبوط ہوتا ہے؟)

عرب علاقہ میں بیری کی تین ذاتیں عام طور پر پائی جاتی ہیں۔ ایک تو وہ بیری ہے جو ہندوستان میں پائی جاتی ہے۔ اس کا نباتاتی نام (Ziziphus Mauritiana Hamilt) ہے۔ دوسرا وہ بیری جو عرب کے ریگستانی علاقہ میں نسبتاً خوب صورت درخت ہوتا ہے اور اس کا نباتاتی نام Ziziphus Lotus Lam) ہے اسے Lote Tree بھی کہا گیا ہے۔ تیسری قسم وہ ہے جس کا نباتاتی نام Z.Spina - Christi Willd ہے۔ اس کے بارے میں روایت ہے کہ اس کے کانٹوں کا تاج حضرت عیسیٰؑ کے سر پر رکھا گیا تھا۔ بیری کی یہ تینوں ذاتیں کانٹے دار ہوتی ہیں۔ ان میں پھل تو ہوتے ہیں لیکن ان کے پھلوں کا مقابلہ ان پھلوں سے نہیں کیا جاسکتا جس کا ذکر خصوصیت سے اللہ نے کیا ہے یعنی کھجور، انار، انگور، زیتون، اور انجیر وغیرہ۔ عرب میں پائی جانے والی بیری کی تینوں ذاتیں کانٹے دار جھاڑیاں ہوتی ہیں یا چھوٹے درخت ہوتے ہیں۔ Ziziphus عربی لفظ الزیزوفون سے لیا گیا ہے۔ جس کے معنی جھاڑی دار درخت کے ہوتے ہیں۔ ان کی لکڑیاں ایندھن کے کام تو آتی ہیں لیکن عمارت یا فرنیچر کے لیے بیکار ہیں۔ تینوں طرح کے بیری کے پھل مزہ میں خراب تو نہیں ہوتے مگر ان کا شمار ذائقہ دار پھلوں میں نہیں ہوتا لہٰذا تجارتی طور پر بیری کے باغات خال خال ہیں۔ یہ درخت اپنے تنوں یا جڑوں کی بنا پر بہت مضبوط درخت نہیں سمجھے جاتے۔ ان کی شاخیں اور پتیاں سائے دار بھی نہیں کہلائی جاسکتیں۔

اب اگر بیری کے درخت کی ان ساری خصوصیتوں کو دھیان میں رکھا جائے

تو اس بات کی امید بہت کم ہو جاتی ہے کہ جس درخت کا ذکر قرآن میں سدرۃ المنتہیٰ کے طور پر اور جنت کا نقشہ بیان کرتے ہوئے دیا گیا ہے اور سورۂ سبا میں سیلاب سے بچ جانے والا کہا گیا ہے وہ یہ بیری کا درخت ہوگا۔ یہ بات بھی دھیان میں رکھنے لائق ہے کہ کئی حدیثوں میں سدر کو ایک شاندار پیڑ بتایا گیا ہے۔اس کے کاٹنے کو منع کیا گیا ہے۔خلاصہ یہ کہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ سدر یقیناً کوئی اہم اور نایاب درخت تھا اسی لیے قرآن اور حدیث دونوں میں اس کا ذکر کئی معنی رکھتا ہے۔اس لیے ہمیں یہ غور کرنا پڑے گا کہ سدرہ یا سدر بیری کے بجائے کوئی شاندار اور عمدہ درخت ہو سکتا ہے۔ یہاں ڈاکٹر فاروقی رائے پیش کرتے ہیں کہ سدر کا اشارہ سیریا (شام) اور لبنان کے اس درخت سے ہے جس کو عربی زبان میں ارز الرب ،ارز الّبنان یا شجرۃ اللہ کہتے ہیں ۔اور پرانے زمانہ میں روم اور لبنان میں سدراس، سدرس اور کدراس وغیرہ کے نام سے جانا جاتا تھا۔لبنان کا یہ سدرس درخت اپنی عظیم الشان لمبائی ،خوبصورتی وخوشبو دار لکڑی کی بناء پر عرب ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کا حسین درخت سمجھا جاتا تھا۔بائبل میں اسے Erez کہا گیا ہے اور یورپ کی پرانی زبانوں میں اس کا ترجمہ سدر کے نام سے کیا گیا ہے۔اسی لیے وہاں کی ایک پرانی آبادی جہاں سدر کے درخت بہت پائے جاتے ہیں، اس کا نام سدران پڑ گیا۔

جس سدر کا اب ذکر ہو رہا ہے اس کا انگریزی نام Cedar اور نباتاتی نام Cedrus libani ہے یہ عام طور سے ڈیڑھ سو فٹ اونچا ہوتا ہے۔اس کے تنے کی موٹائی آٹھ فٹ ہوتی ہے اس کی شاخیں گہری ہری پتیوں سے بھری رہتی ہیں اور نیچے سے اوپر تک پرامڈ (Pyramid) کی شکل میں لٹکی رہتی ہیں ۔حضرت داوٗدؑ اور حضرت سلیمانؑ نے اپنی عبادت گاہیں اور محل اسی درخت کی لکڑی سے بنوائے تھے ۔ان سدر کے درختوں کی لکڑیاں کاٹ کر حضرت سلیمانؑ کی دارالسلطنت تک پہنچانے کے لیے روایت کے مطابق 183300 مزدوروں کو لگایا گیا تھا۔

اس سدر کی لکڑی میں اتنی خوش بو اور چمک ہوتی تھی کہ اس سے بنی عبادت گاہیں بہت صاف ستھری اور خوش بو سے بھری ہوتی تھیں اور تقریباً چار سو سالوں تک ان پر موسم کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ تاریخ میں ملتا ہے کہ فرعونوں کے دور میں لبنان اور سیریا (شام) سے سدر (عربی ارز اور عبرانی Erez) کے جنگلوں سے اتنی زیادہ ان کی لکڑیاں کاٹ کر مصر لے جائی گئیں کہ حضرت عیسیٰؑ کے دور سے قبل ہی اس کی کمی محسوس کی جانے لگی۔ سیریا و لبنان کے سدر (Cedar) کی کل چار قسمیں دنیا کے الگ الگ حصوں میں پائی جاتی ہیں جن میں ایک بیری بھی شامل ہے۔ لیکن اوپر بتائی گئی خصوصیات کے مطابق یہ بات کسی حد تک یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ قرآن میں جس سدر کا ذکر آیا ہے اس کا اشارہ الارز یعنی Cedar کی طرف ہے نہ کہ ہمارے یہاں کی بیری سے۔ اب اگر سدر کو ارز لبنان مان لیا جائے تو سدر کے سلسلہ میں قرآنی بیان کا مطلب بہت صاف ہو جاتا ہے۔ ساتویں آسمان پر سدرۃ المنتہیٰ سے مراد آخری حد پر ایک ایسے درخت کی ہو جاتی ہے جو عرب علاقہ کا سب سے اونچا، مضبوط دیکھنے میں اچھا اور خوب صورت درخت تھا۔

(نوٹ:۔ ڈاکٹر صاحب ایک سائنس داں ہیں اس لیے انھوں نے ظاہری معنی پر اکتفا کیا ہے۔) بالکل اسی طرح کا بغیر کانٹوں کا اونچا، مضبوط اور خوب صورت درخت ہندوستان میں ہمالیہ میں پائے جانے والا دیودار کا درخت ہے جسے Cedrus Deodara کہا جاتا ہے۔ دیودار کو دیو یعنی دیوتاؤں کا درخت کہا جاتا ہے وہیں عرب میں سدر کو شجرۃ اللہ یعنی اللہ کا درخت کہا جاتا ہے۔ کچھ ماہرین نباتات کا ماننا ہے کہ ہندوستان کا دیودار عرب کے سدر سے ہی پیدا ہوا ہے۔ قرائن یہی بتاتے ہیں کہ قرآنی سدر وہی ہے جو یونانی سدر یا انگریزی Cedar ہے۔

سدر کا الارز، ارز الرب، شجرۃ اللہ، ارز لبنان ہونا کچھ حدیثوں سے بھی ثابت ہو رہا ہے۔ ابوداؤد میں حدیث ہے کہ رسول نے سدر کو کاٹنے سے منع کیا ہے

۔یہاں جس سدر کو کاٹنے سے منع کیا گیا ہے وہ بیری کا درخت نہیں ہوسکتا۔ یہ الارز والا سدر تھا۔ اگر رسول اتنی سختی سے ''ارز'' کاٹنے سے منع نہ کرتے تو یقیناً عرب سے یہ حسین درخت ختم ہو جاتا۔

حضرت امام جعفرؑ صادق سے روایت ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سدر کی پتیوں کے جھاگ سے اپنا سر دھوتے تھے۔ دھیان رہے کہ ہمارے یہاں کے بیری کے درخت کی پتیوں سے جھاگ نہیں نکلتا جب کہ سدر (Cedar) کی پتی سے جھاگ پیدا ہوتا ہے اور سر دھونے کے لیے مناسب ہے۔

مندرجہ بالا تاریخ نباتات، پودوں کی کیمیائی خصوصیات، قرآنی پیغام اور حدیثوں کی روشنی میں ڈاکٹر فاروقی یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ سدرۃ المنتہیٰ کا سدرہ، جنت الماویٰ کا سدرہ (سورۂ نجم) دائیں بازو والوں کی جنت کا سدرہ (سورۂ واقعہ) اور معارب کے زبردست سیلاب سے بچ جانے والا سدر (سورۂ سبا) وہ درخت تھا جو دنیا کا حسین درخت ہے جس کو آج کل عربی میں الارز کہتے ہیں۔

ڈاکٹر اقتدار حسین فاروقی کی تحقیق کو دھیان میں رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ

(۱) قرآن جس سدرہ کا ذکر کر رہا ہے وہ ایک اونچے، لمبے اور مضبوط درخت کا اشارہ دیتا ہے جب کہ ہمارے یہاں کا بیری کا درخت زیادہ اونچا نہیں ہوتا اور نہ ہی مضبوط ہوتا ہے۔

(۲) قرآن میں ہے کہ وہ درخت (سدرہ) سیلاب کے بعد بھی بچا رہا۔ یہ اس کی جڑ کی گہرائی اور مضبوطی کو بتاتا ہے جب کہ ہمارے یہاں کے بیری کے درخت کی جڑ گہری نہیں ہوتی اور وہ سیلاب کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

(۳) قرآن میں سدر کا ذکر پھل دار درختوں کے شمار میں نہیں آیا ہے جب کہ ہمارے یہاں کا بیری کا درخت ایک پھل دار درخت ہے۔

(۴) سدر کی لکڑی سے فرنیچر بن سکتا ہے اور اس کی لکڑی عمارت میں کام آتی ہے

جب کہ ہمارے یہاں بیری کے درخت کی لکڑی نہ تو عمارت میں کام آسکتی ہے اور نہ ہی اس سے فرنیچر بن سکتا ہے۔

(۵) سدر کا ذکر ایک سایہ دار درخت کے طور پر ہوا ہے جب کہ بیری کا پیڑ سایہ دار نہیں ہوتا۔

لب لباب یہ کہ کسی بھی قرینہ سے ہمارے یہاں کا بیری کا درخت قرآنی سدرہ نہیں ہے۔ باقی یہ اللہ کا راز ہے اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ ہم تو صرف قرائن سے ایک فیصلہ کر سکتے ہیں اور یہ فیصلہ ہم آپ پر بھی چھوڑتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

منّ وسلویٰ

مجھے یقین ہے کہ آپ نے قرآن مجید میں منّ وسلویٰ کے بارے میں پڑھا ہوگا یا پھر علماء سے سنا ہوگا۔ اگر نہیں تو کوئی بات نہیں ہم آپ کو منّ وسلویٰ کے بارے میں بتاتے ہیں۔

واقعہ یوں ہے کہ جب مصر میں یہودیوں (بنی اسرائیل) پر فرعون کا ظلم بہت بڑھ گیا تو حضرت موسیٰؑ نے اللہ کے حکم سے مصر کو چھوڑنے کا ارادہ کیا۔ راستے میں دریائے نیل رکاوٹ تھا تو اللہ نے موسیٰؑ کے عصا کے ذریعہ دریا میں راستہ بنا دیا۔ ابھی یہ لوگ بیچ دریا میں تھے کہ فرعون مع لشکر پیچھا کرتے ہوئے دریائے نیل کے کنارے پہنچا۔ اس نے جو دریا میں راستہ دیکھا تو وہ بھی دریا میں داخل ہو گیا لیکن ادھر حضرت موسیٰؑ دریا کے اس پار پہنچے اور ادھر دریا کا پانی برابر ہو گیا جس کی وجہ سے فرعون کا لشکر غرق ہو گیا۔

دریا کے پار ہو کر حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کے کئی لاکھ لوگوں کو فرعون کے شکنجہ سے چھڑا کر صحرائے سینا (سینائی) میں لے آئے تا کہ انھیں کنعان پہنچایا جا سکے۔ یہ واقعہ 1451 قبل مسیح کا ہے۔ صحرائے سینا بہت بڑا تھا اور یہودی بھوکے پیاسے بھٹک رہے تھے تب اللہ نے ان کے لئے عصا کے ذریعے میدان میں بارہ چشمے جاری کئے اور وہاں غذا کے نام پر کچھ نہ تھا تو غذا کے لئے منّ وسلویٰ نازل کیا، اس کی تصدیق قرآن کی ان آیتوں سے ہوتی ہے ''اور ہم نے (بنی اسرائیل کی) اس قوم کو

(حضرت یعقوبؑ کی بارہ اولاد کو) بارہ حصوں میں بانٹ دیا اور جب انھوں نے پانی کی مانگ کی تو ہم نے موسیٰؑ کی طرف وحی کی کہ زمین پر اپنا عصا مارو۔ انھوں نے عصا مارا تو بارہ چشمے جاری ہو گئے اور قوم کے ہر حصّے کو اپنے چشمے کا پتہ چل گیا اور ہم نے ان کے سروں پر بادلوں کا سایہ کیا اور ان پر منّ وسلویٰ نازل کیا تا کہ ہمارے دئے ہوئے پاکیزہ رزق کو کھائیں۔ مگر ان لوگوں نے مخالفت کر کے ہمارے او پر ظلم نہیں کیا بلکہ یہ اپنے ہی نفس پر ظلم کرنے لگے۔ (سورۂ اعراف آیت 160)

اسی بات کو قرآن نے ایک بار اور واضح کیا ہے: ''ہم نے تمہارے سروں پر ابر کا سایہ کیا، تم پر منّ وسلویٰ نازل کیا تا کہ پاکیزہ رزق اطمینان سے کھاؤ۔ ان لوگوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ خود اپنے نفس پر ظلم کیا'' (سورۂ بقرہ آیت 57)

قرآن نے یہودیوں کو تیسری بار منّ وسلویٰ کی یاد دلائی اور کہا کہ: ''اے بنی اسرائیل ہم نے تم کو تمہارے دشمن سے نجات دلائی اور طور پہاڑ کی داہنی طرف (توریت کے لئے) وعدہ کیا اور منّ وسلویٰ نازل کیا'' (سورہ طٰہٰ آیت 80)

مندرجہ بالا تینوں آیات سے اللہ کے بنی اسرائیل پر تین کرم کا پتہ چلتا ہے۔ پہلا کرم تو یہ کہ چونکہ صحرا میں پانی ملنا ناممکن تھا اس لئے اللہ نے عصا کے ذریعے بارہ چشمے جاری کر دئے۔ دوسرا کرم یہ کیا کہ چونکہ سیناء کا علاقہ ایک چٹیل میدان تھا اور وہاں کسی سائے کی گنجائش نہ تھی کیوں کہ چھوٹے چھوٹے قد کے پیڑ تھے اس لئے اللہ نے بادلوں کو بھیج کر سائے کا انتظام کیا۔ تیسرا اور سب سے بڑا کرم یہ کیا کہ ان کے لاکھوں لوگوں کی بھوک مٹانے کے لئے منّ وسلویٰ نازل کیا۔

اس تیسرے کرم پر روشنی ڈالنے کے لئے ہم پہلے سلویٰ کو لیتے ہیں۔ سلویٰ کو اردو ہندی میں بٹیر کہتے ہیں یعنی ان کے کھانے کا ایک جزو بٹیر کو بنایا۔ اللہ کی قدرت سے اس علاقے میں بٹیروں کا ہجوم در ہجوم آنے لگا اور وہاں بٹیروں کی بہتات ہو گئی۔ اور انھیں بنی اسرائیل کھانے لگے۔ اللہ نے غذا کے لئے دوسرا انتظام منّ کا کیا۔

منّ کو انگریزی، یونانی، اطالوی، ملیالم اور روسی زبانوں میں ''Manna''

فرانسیسی میں ''Manne'' ہندی، تمل و تیلگو میں Meena اور فارسی و اردو زبانوں میں اسے ترنجبیں کہتے ہیں۔

اب ہم منّ پر سائنسی ریسرچ پیش کرنے سے پہلے دیکھیں کہ اس سلسلہ میں بائبل (انجیل) کا کیا کہنا ہے۔

١۔ کتاب خروج باب 16 آیت 15

اور جب وہ شبنم جو پڑی تھی سوکھ گئی تو کیا دیکھتے ہیں کہ میدان میں ایک چھوٹی چھوٹی گول چیز، ایسی چھوٹی جیسے کہ پالے کے دانے ہوتے ہیں، زمین پر پڑی ہے۔ بنی اسرائیل اسے دیکھ کر کہنے لگے منّ یعنی یہ کیا ہے؟ کیوں کہ وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ کیا ہے۔ تب موسیٰ نے ان سے کہا کہ یہ وہی روٹی ہے جو خداوند نے تمہیں کھانے کو دی ہے۔

٢۔ کتاب استثناء باب 8 آیت 3)

اور اس نے تجھ کو پہلے آزمائش میں ڈالا اور تجھ کو بھوکا ہونے دیا اور پھر وہ منّ جسے تو تیرے باپ دادا بھی نہ جانتے تھے، تجھ کو کھلایا تاکہ تجھ کو سکھائے کہ انسان صرف روٹی پر ہی زندہ نہیں رہتا بلکہ ہر بات سے جو خداوند کے منہ سے نکلتا ہے وہ جیتا رہتا ہے۔

٥۔ کتاب گنتی باب 1 آیت 7 تا 9

اور منّ دھنیئے کی طرح تھا اور ایسے نظر آتا تھا جیسے موتی اور رات کو جب اوس پڑتی تھی تو اس کے ساتھ منّ بھی گرتا تھا۔

منّ کے لفظی معنی انعام یا احسان کے ہیں لیکن جس بارے میں منّ استعمال کیا گیا ہے اس کے لیے کہا گیا ہے کہ یہ ایک شبنمی گوند تھا جس کا ذائقہ شہد جیسا تھا جس کو اللہ صحرائے سینا میں بھٹکنے والے بنی اسرائیل کے لئے کھانے کے طور پر نازل کرتا تھا۔ یہ گوند وہاں کے پیڑوں کے پتوں پر جمع ہوجاتا تھا اور بنی اسرائیل روز اسے اکٹھا

کر کے کھاتے تھے۔

لیکن بائبل کی آیات کی تفسیر کرنے والے محقق مولڈنکے (Moldenke) نے اپنی کتاب Plants of the Bible (بائبل میں ذکر کئے گئے پودے) میں خیال ظاہر کیا ہے کہ منّ صرف میٹھا گوند ہی نہ تھا بلکہ کچھ خاص قسم کے Lichen اور Algae (کائی کی قسمیں) کو بھی منّ کہا گیا تھا۔ ان کی نظر میں بائبل کے کتاب بروج باب میں جس منّ کا حوالہ دیا گیا ہے وہ تو یقیناً میٹھی چیز تھی لیکن کتاب خروج اور کتاب گنتی ابواب میں جس منّ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ آسمان سے برستی تھی، وہ کوئی میٹھی چیز نہ تھی بلکہ ایک خاص قسم کی کائی تھی جس کو سائنسی زبان میں Lichen (لائی کن) کہتے ہیں۔ یہ سوکھ کر زمین سے الگ ہو جاتی تھی اور تیز ہواؤں کی مدد سے اڑتی ہوئی دور دراز کے علاقوں میں جا کر گرتی تھی، یہ بنی اسرائیل اس کائی کو اکٹھا کر لیتے اور پیس کر اس کی روٹیاں یا چھلکے پکا کر کھاتے اور ساتھ میں نمکین کے طور پر سلویٰ (بٹیر) بھون کر کھاتے۔ انھوں نے تیسری قسم Algae کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ رات میں شبنم کے ساتھ زمین پر ظاہر ہوتی تھی اور صبح کو جمع کر لی جاتی تھی۔ جو بچ جاتی وہ سورج کی گرمی ے پگھل کر ختم ہو جاتی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بنی اسرائیل روٹی کے طور پر منّ اور ذائقہ و پیٹ بھرنے کے لئے سلویٰ (بٹیر) کا گوشت بھی بھون کر کھاتے تھے کیوں کہ وہ علاقہ بٹیروں کے لئے مشہور تھا۔

اب ہم منّ کے سلسلہ میں مسلم علماء کا نظریہ دیکھتے ہیں۔ کتاب موضع القرآن میں ہے کہ جب بنی اسرائیل فرعون سے نجات پا کر صحرائے سیناء میں داخل ہوئے تو ان کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ اس وقت اللہ نے منّ نازل کیا جو دھنئے کی طرح کی ایک میٹھی چیز تھی اور سلویٰ (بٹیر) نازل کیا جسے وہ لوگ پکڑ لیتے اور کباب بنا کر کھاتے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے خیال میں منّ درخت کا شیرہ تھا جو گوند کی طرح جم جایا کرتا تھا اور ذائقہ میں اچھا ہوتا تھا۔

شیعہ علماء نے منّ کو ترنجبین مانا ہے۔

مسلمان محققین میں سب سے پہلی رائے ابوریحان ابن البیرونی (حیات 973ء تا 1050ء) نے دی کہ "حاج" نام کے پودھے سے حاصل کی ہوئی گوند جسے ترنجبین کا نام دیا گیا ہے، وہی اصل منّ کہا جا سکتا ہے۔ ترنجبین فارسی ترنگبین کی بگڑی شکل ہے۔ انگبین فارسی میں شہد کو کہتے ہیں جسے انگریزی میں Honey Dew (شبنمی شہد) کہا جاتا ہے۔

البیرونی کے بعد کوئی ریسرچ اس بارے میں نہیں ہوئی۔ لیکن 1822ء میں برکھارڈ نامی سائنٹسٹ نے (جو بعد میں مصر میں شیخ برکات کے نام سے مشہور ہوئے) اپنی کتاب Travels In Syria & Holyland (سیریا یعنی شام اور ارض مقدس میں سفر) میں لکھا ہے کہ منّ کی پیداوار کے ذمہ دار کچھ خاص قسم کے کیڑے ہوتے ہیں جو کچھ درختوں کی چھال میں چھید کر دیتے ہیں اور ان سے سخت گرمی کے دوران ایک رطوبت نکلتی ہے جو رات کی ٹھنڈک میں درختوں پر جم جاتی ہے۔ یہ منّ کہلاتی ہے۔ اس کی تصدیق 1829ء میں اہرن برگ اور ہیم پریش نامی سائنس دانوں نے کی۔ انھوں نے ایک رپورٹ شائع کی جس میں بتایا کہ Cocus Manniparas نام کا کیڑا صحرائے سینا کے Tamarix (جھاؤ) نامی پودوں پر پایا گیا جو منّ کی پیداوار کا ذمے دار تھا۔ گویا کہ انیسویں صدی کے نصف میں ہی یہ بات واضح ہوگئی کہ سیناء کے درختوں پر منّ پیدا ہوتا ہے جو بہت شیریں ہوتا ہے۔ اس کے کچھ بعد ہی اس امر کا علم بھی ہوا کہ اس علاقے میں بسنے والے لوگ ان پودوں سے نکلے گوند (منّ) کو مٹھائی کے طور پر کھاتے ہیں۔

آج تک ہوئی ریسرچ سے یہ بات مانی جا سکتی ہے کہ جس منّ کا ذکر قرآن

مجید میں ہے وہ دو طرح کے پودوں سے حاصل ہوتا ہے۔ایک تو وہ ہے جسے عربی میں ''حاج'' کہتے ہیں جس کا سائنسی نام Alhagi Maurorum ہے۔ان پودوں سے حاصل، منّ کو ہم ترنجبین کہتے ہیں۔اس کو وہاں سے اکسپورٹ کیا جاتا ہے۔دوسرا پودا جو حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں صحرائے سیناء میں بڑی تعداد میں موجود تھا اور جواب بھی وہاں پایا جاتا ہے وہ ''طرفا یا جھاؤ'' تھا جس کا سائنسی نام Tamarix Mannifera ہے اور اس سے بھی منّ حاصل ہوتا تھا۔''حاج'' اور طرفا سے حاصل منّ کی تجارت آج کے دور میں بھی کسی حد تک ہوتی ہے۔

اب اگر قرآنی لفظ ''نازل کیا گیا'' کا مطلب آسمان سے اترا کے بجائے ''انتظام کیا گیا'' لیا جائے تو ساری بات آسان ہو جاتی ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کے لئے میٹھے کے طور پر ''حاج'' اور ''طرفا'' نامی درختوں سے میٹھا گوند عطا کیا اور نمکین کھانے کے لئے بٹیر کے گوشت سے نوازا جو ہر اعتبار سے ایک مکمل غذا تھی ورنہ صرف میٹھی چیز کھا کر کئی لاکھ لوگ برسوں تک تندرست زندگی نہیں گزار سکتے تھے۔

لب لباب یہ کہ صحرائے سیناء میں بنی اسرائیل کو جو میٹھا گوند اور بٹیر کا گوشت اللہ نے عطا کیا اس کا ذکر قرآن میں ''منّ وسلویٰ'' کے طور پر کیا ہے۔واللہ اعلم بالصواب

(حوالہ: نباتات قرآن از ڈاکٹر اقتدار حسین فاروقی)

حضرت نوحؑ اور ہندو قوم

جون ۲۰۰۲ء میں ہم لوگ گرمی سے راحت اور سیاحت کی غرض سے شملہ، کلو اور منالی گئے تھے۔ منالی قیام کے دوران ہم لوگ مہارشی منو (मनु) کا مندر دیکھنے گئے۔ یہ مندر مہارشی منو کا ہندوستان میں واحد مندر ہے۔ اس مندر میں جہاں مہارشی منو کی مورتی لگی ہے وہیں باہر کے حصہ میں محکمہ سیاحت کی طرف سے ایک بورڈ بھی لگا ہوا ہے جس میں منالی کی وجہ تسمیہ بیان کی گئی ہے۔ بورڈ کی تحریر کے مطابق صاحب مندر منو ثانی (मनु द्वितीय) تھے۔ ان کے زمانے میں ایک ایسا طوفان آیا کہ چاروں طرف پانی ہی پانی ہو گیا۔ سمندر کی سطح اونچی ہونی شروع ہوئی۔ اس وقت مہارشی منو نے ایک ناؤ بنائی جس پر مختلف جان دار اور انسانوں کو سوار کیا۔ طوفان نے ایسا حال کیا کہ کشتی پر سوار جان داروں کے علاوہ پورے ارض کی زندگی ختم ہو گئی۔ جب طوفان تھما اور پانی کی سطح کم ہونا شروع ہوئی تو یہ کشتی ایک جگہ پر رکی اور پھر مہارشی منو کشتی پر سوار ہوئے تمام جان داروں کے ساتھ اس جگہ پر اتر گئے اور یہیں بس گئے۔ ان کے یہاں بسنے کی وجہ سے اس علاقہ کا نام منو آلئے (मनु आलय) پڑا جو بعد میں بگڑتے بگڑتے منالی ہو گیا۔ یہاں میں یہ وضاحت کرتا چلوں کہ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق دنیا میں جس سے انسانوں کی نسل چلی وہ منو اوّل (मनुप्रथम) تھے اسی لئے سنسکرت زبان میں انسانوں کو منشیہ (मनुष्य) یعنی منو کی اولاد کہا گیا ہے اور منالی والی ہستی کو منو ثانی (मनु द्वितीय) اس لئے کہا گیا کیوں کہ دوبارہ نسل انسانی منو ثانی سے ہی چلی۔

اگر آپ مندرجہ بالا تحریر کو پڑھتے وقت آیات قرآنی اور قصص الانبیاؑ میں حضرت نوحؑ کے واقعہ کو ذہن میں رکھیں تو کیا آپ کو ایسا نہیں لگے گا کہ آپ آدم ثانی حضرت نوحؑ اور طوفان نوحؑ کا واقعہ پڑھ رہے ہیں؟ اتنی زبردست مماثلت آپ کو تحقیق کرنے پر مجبور کردیگی۔

تحقیق سے کچھ باتیں ذہن میں آتی ہیں جیسے:

(۱) قرآن کے مطابق جس نبی کے زمانے میں طوفان آیا ان کا نام نوحؑ پکارا گیا یہاں طوفان کے وقت کی ہستی کا نام منو ہے مگر واقعہ ایک لگ رہا ہے۔

(۲) قرآن کے مطابق کشتی کوہِ جودی پر آکر ٹھہری۔ یہاں جس پہاڑ پر آکر ٹھہرنے کا ذکر ہے اس کی قریبی جگہ کا نام منالی ہے۔ناموں میں فرق ہے۔

(۳) روایات کے مطابق حضرت نوحؑ نجف میں حضرت علیؑ کے پہلو میں دفن ہیں لیکن منو کے انتقال کی جگہ کا پتہ نہیں ہے۔

(۴) طوفان کے بعد حضرت نوحؑ جہاں کہیں بھی ٹھہرے ہوں گے وہاں ان کے ساتھ ان کی امت کے مومن افراد بھی اترے ہوں گے تو حضرت نوحؑ کی وہ امت یا قوم کہاں گئی، یہی سوال منو کی قوم کے لئے بھی اٹھتا ہے۔

آیئے ہم ان ذہن میں آئی باتوں کا حل تلاش کرنے کی کوشش کریں۔

(۱) جہاں تک نام کا تعلق ہے اس بات میں کوئی دورائے نہیں کہ نہ حضرت نوحؑ کا اصل نام نوحؑ تھا اور نہ منو کا اصل نام منو تھا۔حضرت نوحؑ کا نام نوحؑ اس لئے پڑا کہ انھوں نے قوم کے لئے بہت نوحہ کیا اور ویدوں کے مطابق منو کا نام منو ثانی اس لئے پڑا کہ منو اول کی طرح ہی دوبارہ انسانی نسل ان سے چلی۔ یہاں ہم ایک فرانسیسی مصنف اے، جے، اے ڈیوبائیس (A.J.A.Dubis) کا حوالہ دیتے ہیں جس نے اپنی کتاب ہندو شعائر مراسم و مناسک (Hindu Manners, Customs & Ceremonies) میں یہ لکھا ہے:

''مختصر یہ کہ ایک مشہور شخصیت جس سے ہندوؤں کو بہت عقیدت ہے اور جسے وہ منو یا مہا نودو (Mahanuvu) کے نام سے جانتے ہیں جو سیلاب کی تباہی سے ایک کشتی کے ذریعہ بچ نکلی جس میں سات مشہور رشی بھی سوار تھے۔ مہا نو وو دو الفاظ کا مرکب ہے مہا کے معنی عظیم اور نو وو بلا شک وشبہ حضرت نوحؑ ہی ہیں۔ (صفحہ ۴۸) ''عملاً یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ ہندوستان اس سیلاب عظیم کے فوراً بعد آباد ہوا تھا جس نے پوری دنیا کو ویران کر دیا تھا (صفحہ ۱۰۰)

حالانکہ ویدوں اور پُرانوں (مارکنڈے پُران، بھاگوت اور متسیہ (मत्स्य) پران) میں واقعات کی روشنی میں حضرت نوحؑ ہی منو نظر آتے ہیں لیکن نام کا فرق بہر حال ہے مگر ہندوؤں کے دوسرے مشہور پُران یعنی بھوشیہ پُران (भविष्य पुराण) میں تو یہ فرق بھی نہیں باقی رہ گیا ہے، بھوشیہ پُران کے پرتی سرگ پرو (प्रतिसर्ग पर्व) ادھیائے ۴ ر شلوک ۴۵ سے ۶۰ میں جو لکھا گیا ہے اس کے مطابق انھیں نیوح لکھا گیا ہے، اس کے مطابق۔

''نیوح نام کا فرزند پیدا ہوا۔ وہ نوحؑ ہی بھیجا گیا تھا۔ اس کے ''ہیم'' ''سوم'' ''بھاؤ'' نام کے تین بیٹے ہوئے۔'' دیکھئے یہاں نام کا فرق بھی مٹ گیا۔

یہاں یہ بتاتے چلیں کہ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق وید آدی گرنتھ (आदि ग्रन्थ) یعنی اولین صحائف ہیں اور ہندوؤں کی تہذیب نہات قدیم ہونے سے کسی کو انکار نہیں ہے لہٰذا وید بھی بہت قدیمی ہیں۔ کچھ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق اصل وید ایک تھا جو یا تو گم ہو گیا ہے یا موجودہ چاروں وید ہی میں سے ایک اصل وید ہے بعض ایک وید کو موجودہ چار حصوں میں تقسیم شدہ مانتے ہیں، ان کے مطابق یہ کلام الٰہی ہیں یہ کلام